اسلام اور زندگی

یعنی

الرفیق فی سواء الطریق

حصہ سوم

از افادات

حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی

کتب خانہ جمیلی نمبر ۵ گولڈنگ روڈ لاہور

اسلام اور زندگی

یعنی

الرفیق فی سواء الطریق

حصّہ سوم

از افادات

حکیم الامت حضرت مولانا شاہ اشرف علی صاحب تھانوی قدس سرہ

ناشر

کتب خانہ جمیلی ۵ گولڈنگ روڈ لاہور

کتاب	اسلام اور زندگی حصہ سوم
سلسلہ اشاعت نمبر	(۶)
مصنف	حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ
سن اشاعت	دسمبر سنہ ۱۹۶۵ء
قیمت	پانچ روپے پچاس پیسے

مطبع

نامی پریس لاہور

ناشر

کتب خانہ جمیلی

۵۔ گولڈنگ روڈ۔ لاہور

کہاں میں اور کہاں یہ نکہت گل
نسیم صبح تیری مہربانی

جنوری ۱۹۶۵ء میں ادارہ اپنی عمر کا ایک سال پورا کر رہا ہے خدائے ذوالجلال کا احسان ہے کہ اس مختصر وقت میں ادارہ کو حضرت حکیم الامت مولانا شاہ اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی افادات میں سے چھ اشاعتوں میں دو ضخیم کتابیں مع شرح کے پیش کرنے کی سعادت حاصل ہوئی۔

اگرچہ ادارہ تاحال دور ابتلاء وامتحان سے دوچار ہو رہا ہے مگر انشاءاللہ بہت جلد حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی برکت اور حضرت کے متوسلین کی دعاؤں سے اللہ تعالیٰ ادارہ کو استحکام اور استقامت عطا فرمائینگے ناظرین سے دعا کی درخواست ہے کہ ہمیں اللہ تعالےٰ دین کی خدمت کی توفیق بخشیں اور زیادہ سے زیادہ حضرات کو حضرت کی تعلیمات سے فیضیاب فرمائیں آمین

فقط خاکپائے اسلاف
مشرف علی تھانوی ناظم کتب خانہ

بلاشبہ دین (حق و مقبول) اللہ کے نزدیک صرف اسلام ہی ہے

پ۳ ع۱۰

اور جو شخص اسلام کے سوا کسی دوسرے دین کو طلب کریگا تو

وہ (دین) اس (شخص) سے (خدا تعالیٰ کے نزدیک) مقبول نہ ہوگا

اور وہ آخرت میں تباہ کاروں میں سے ہوگا (یعنی نجات نہ پائے گا)

پ۳ ع۷

خالص مذہبی کتابوں کا مطالعہ کیجئے خود کو

اور اپنی اولاد کو غیر اسلامی رسوم سے بچائیے

فہرست اسلام اور زندگی "یعنی الرفیق فی سواء الطریق حصہ دوم

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

حامداً و مصلیاً و مسلماً

منکرات روزہ

بوجہ قرب رمضان شریف مناسب ہے کہ کچھ احکام اُس کے بیان کر دیئے جائیں۔ یہ تو معلوم ہے کہ روزہ فرض ہے اس کے تو بیان کی ضرورت نہیں اور ایسے ہی تراویح سنت موکدہ ہونے کی وجہ سے ضروری ہے۔ اس کے بیان کرنے کی بھی ضرورت نہیں البتہ ضروری مضمون یہ ہے کہ بعض لوگوں نے اس مہینے میں کچھ منکرات بڑھا دیئے ہیں اور وجہ اس کی یا تو عدم علم ہے یا قصور علم یا جانتے بھی ہیں مگر احتیاط نہیں کرتے۔ بڑے تعجب کی بات ہے کہ اللہ تعالےٰ نے اس مہینے میں ان چیزوں کو بھی حرام کر دیا جو پہلے حلال تھیں کیا یہ اس بات پر دال نہیں کہ جو چیز ہمیشہ سے حرام ہے اس میں اور شدت زیادہ ہو جائے گی۔ حق سبحانہٗ تعالےٰ نے تو علت بیان کی روزہ رکھنے کی لعلکم تتقون۔ روزہ اس واسطے ہے کہ تم متقی بن جاؤ۔ اب ہر شخص غور کر لے۔

کہ قبل رمضان میں اور رمضان میں کچھ فرق اس کی حالت میں ظاہر ہؤا اس نے نظر بد کو یا غیبت کو چھوڑ دیا یا نہیں سو کچھ نہیں، دونوں حالتیں یکساں ہیں کسی باب میں بھی کمی نہیں ہوئی۔ اب رہا کھانا سو اس کے بھی وقت بدل دیئے مقدار میں کچھ تغیر نہیں کیا۔ غرض یہ کہ شارع علیہ السلام کا تو مقصود یہ تھا کہ منکرات میں کمی ہو مگر لوگوں نے کچھ بھی نہ کیا۔ اہلِ تحقیق تو کھانے تک میں کمی کر دیتے ہیں۔ اس مہینے میں بہ نسبت شعبان کے۔ مگر اس کی مقدار کچھ معین نہیں ہو سکتی ہے۔ جتنا شعبان میں کھاتے تھے۔ اس سے کم کر دیا۔ بعض نے صرف بقدرِ لایموت[۱] کھا کر روزہ رکھا جب ہی تو کچھ اثر پایا۔ ہمیشہ اچھی طرح کھایا۔ ایک مہینہ عبادت ہی کے واسطے سہی۔ حاصل یہ کہ ان لوگوں نے اکل[۲] میں بھی کمی کر دی مگر یہ بات مندوب[۳] خاص کے لئے ہے۔ یہ ہر شخص سے نہیں ہو سکتا ہے مگر معاصی کو تو چھوڑو خیر کھانے کے لئے جواز کا مرتبہ تو ہے۔ رمعاصی کے واسطے تو جواز بھی نہیں ہم برخلاف اس کے دن بھر معاصی میں مشغول رہتے ہیں۔ بلکہ بعضے تو عصیان میں اور زیادہ ہو جاتے ہیں۔ اسی کو دیکھ لیجئے کہ صبح کی نماز اس مہینے میں اپنے وقت پر ہوتی ہے یا نہیں اس نماز کی تو وقت سے تاخیر کرنے کی عادت ہو گئی

ل[۱] اس قدر کہ مر نہ جائیں[۲] کھانا[۳] مستحب

ہے۔ بہتیروں کی تو قضا ہوتی ہے اور قضا نہ بھی ہو تو اس قدر تاخیر تو ہوتی ہے جس سے جماعت فوت ہو جاوے۔ خوش ہیں کہ ہم نے روزہ رکھ لیا۔ بڑا تعجب ہے کہ نماز کو چھوڑ دیا روزہ کیا کفایت کر سکتا ہے۔ اللہ تعالےٰ نے مغفرت کو اس قدر بڑھا دیا کہ دس ضعف ثواب کا وعدہ فرما دیا اور ہم اس قدر گناہ کرتے ہیں کہ حسنات باوجود اتنے بڑھائے جانے کے بھی سیئات کے برابر نہیں ہوتیں چاہیئے تو یہ تھا کہ حسنات کی تعداد بڑھی ہوئی رہتی اس کو بھی جانے دیجئے برابر تو رہتی کہ پھر بھی حسنات سبقت رحمتی علی غضبی کے غالب ہو جاتیں اور جب باوجود اضعافاً مضاعفہ ہونے کے بھی نیکیاں گناہوں کے برابر نہیں ہوتیں بلکہ گناہ بڑھا رہتا ہے تو پھر کیا حشر ہوتا ہے۔

ماہ رمضان کی عبادت کا اثر برکت اعمال میں تمام سال رہتا ہے

اچھا اس کو بھی جانے دیجئے اگر ہمیشہ ہم اس پر قادر نہیں ہیں کہ معاصی کو گھٹا دیں تو رمضان میں تو ایسا کر لیا جائے۔ تجربہ سے ثابت ہوا کہ عبادت کا اثر اس کے بعد گیارہ مہینے تک رہتا ہے

لہ نماز کی طرف سے ٹہ دس گونا ٹہ میری رحمت میرے غصہ پر غالب ہے لہ کئی گونا کا کئی گونا

جو کوئی اس میں کوئی نیکی بتکلف[1] کر لیتا ہے۔ اس کے بعد اس پر بآسانی قادر ہو جاتا ہے اور جو کوئی کسی گناہ سے اس میں اجتناب[2] کرے تمام سال بآسانی اجتناب کر سکتا ہے اور اس مہینے میں معصیت سے اجتناب کرنا کچھ مشکل نہیں کیونکہ یہ بات ثابت ہے کہ شیاطین قید کر دیئے جاتے ہیں پس جب شیاطین قید ہو گئے معاصی آپ ہی کم ہو جائیں گے۔ محرک کے قید ہو جانے کی وجہ سے۔ اور یہ لازم نہیں آتا کہ معاصی بالکل مفقود ہی ہو جائیں۔ کیونکہ دوسرا محرک یعنی نفس تو باقی ہے اس مہینے میں وہ معصیت کرائے گا مگر ہاں کم اثر ہوگا۔ کیونکہ ایک ہی محرک رہ گیا اس میں ایک مہینے کی مشقت گوارا کر لی جائے کوئی بات نہیں غرض اس میں ہر عضو کو گناہ سے بچایا جاوے۔

بقیہ منکرات

ایک زبان ہی کے بیس گناہ ہیں جیسا کہ امام غزالی رحمۃ اللہ نے لکھا ہے ایک ان میں سے کذب ہے۔ جس کو لوگوں نے شیر مادر[3] سمجھ رکھا ہے اور کذب وہ شے ہے کہ کسی کے نزدیک بھی جائز نہیں اور پھر اس کو مسلمان کیسا خوشگوار سمجھتے ہیں۔ ذرا سا بھی

---

[1] تکلیف اٹھا کر [2] بچاؤ [3] ماں کا دودھ

دگا دُکمذب کا ہو جاتے بس معصیت ہو گئی۔

حکایت یہاں تک کہ ایک صحابیہ رضی اللہ تعالےٰ عنہانے ایک بچہ سے کہلانے کے طور پر یوں کہا کہ لے یہاں آؤ چیز دیں گے تو جناب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر وہ آجائے تو کیا چیز دو گی۔ انہوں نے دکھایا کہ یہ کھجور ہے میرے ہاتھ میں۔ فرمایا اگر تمہاری نیت میں کچھ نہ ہوتا تو یہ معصیت لکھ لی جاتی۔ حضرت کذب یہ چیز ہے خیر یہ تو بڑے لوگوں کی باتیں ہیں اگر اس سے احتراز نہ ہو سکے تو کذبِ مضر سے تو بچنا چاہیئے، اور پھر روزہ میں۔ دوسرا گناہ زبان کا غیبت ہے۔ لوگ یوں کہا کرتے ہیں کہ میاں ہم تو اس کے منہ پر کہہ دیں منہ پر عیب جوئی کروگے تو بہت اچھا کروگے اور پیچھے تو ظاہر ہے جیسا اچھا ہے بلکہ اگر منہ پر برا کہوگے تو بدلا بھی پاؤگے وہ شخص تمہیں برا کہہ لیگا یا اپنے اوپر سے اُس الزام کو دفع کرے گا پیچھے برائی کرنا تو دھوکہ سے مارنا ہے یاد رکھو کہ دوسرے کا مال محترم ہے ایسی ہی بلکہ اُس سے زیادہ آبرو ہے چنانچہ جب آبرو پر آبنتی ہے تو مال تو کیا چیز ہے جان تک کی پرواہ نہیں رہتی پھر آبروریزی کرنے والا کیسے حق العبد سے بری ہو سکتا ہے مگر غیبت

لہ جو دوسروں کو ضرر پہنچائے ۱۲ مہ یہ تو مسلی تو تکلیف دینا ہوا جو حرام ہے ۱۲ سے عزت والا

ایسی رائج ہوئی ہے کہ باتوں میں احساس بھی نہیں ہوتا کہ غیبت ہوگئی یا نہیں۔ اس سے بچنے کی تدبیر تو بس یہی ہے کہ کسی کا بھلا یا بُرا اصلا ذکر ہی نہ کیا جاوے کیونکہ ذکر محمود بھی اگر کیا جاوے کسی کا تو شیطان دوسرے کی بُرائی تک پہنچا دیتا ہے اور کہنے والا سمجھتا ہے کہ میں ایک ذکر محمود کر رہا ہوں اور اس طرح ایک خیر اور ایک شر مل جانے سے وہ خیر بھی کالعدم ہوگئی اور حضرت اپنے ہی کام بہتیرے ہیں پہلے ان کو پورا کیجئے۔ دوسرے کی کیا پڑی۔ علاوہ بریں غیبت تو گناہ بے لذت بھی ہے اور دنیا میں بھی مضر ہے جب دوسرا آدمی سنے گا تو عداوت پیدا ہو جائے گی اور پھر کیا ثمرات اس کے ہوں گے۔ اسی طرح زبان کے بہت گناہ ہیں سب سے بچنا ضروری ہے۔ ان کے علاوہ ایک گناہ جو خاص روزہ کے متعلق ہے افطار[1] علی الحرام ہے بڑے تعجب کی بات ہے کہ اس مہینے میں حلال کا کھانا بھی ایک وقت میں حرام ہوگیا اور پھر دن بھر تو اُسے لوگ چھوڑے رہیں اور شام کو حرام سے افطار کریں۔

غلطی اُن لوگوں کی جو کہتے ہیں کہ حلال رزق نہیں ملتا

اور در اصل بعض لوگوں نے خبط میں ڈال دیا ہے۔ یوں کہتے

---

[1] حرام پر روزہ کا کھولنا ۱۲ے گرط رجہ

ہیں کہ رزق حلال تو پایا نہیں جاتا سوائے اس کے کہ دریا میں سے مچھلی شکار کر کے کھائی جائے یا سبزی کھا کر یا گھاس چر کر پیٹ بھر لیا جائے اور کچھ قصے اس کے متعلق مشہور کئے ہیں۔

وہ ایک بزرگ کا قصہ بیان کرتے ہیں کہ ان کا بیل لڑتے لڑتے دوسرے کے کھیت میں چلا گیا تو انہوں نے اس کھیت کا غلہ کھانا چھوڑ دیا کہ نہ معلوم دوسرے کھیت کی مٹی جو میرے بیل کے کھر میں بلا اجازت چلی آئی کون سے دانے میں شامل ہو گئی ہو۔ اگر یہ قصہ ہوا ہے تو وہ صاحبِ حال ہیں۔ دوسروں کے لئے ان کا فعل حجت نہیں ہو سکتا۔ قصداً اتنا مبالغہ کرنا تقوے کا ہیضہ اسی کو کہتے ہیں۔ جب اتنے شبہ کو بھی حرام میں سمجھا جاوے گا اور اس سے بچنا ظاہر ہے کہ مشکل ہے تو گمان یہ ہوگا کہ حرام سے بچنا مشکل ہے پس حراموں میں مبتلا ہو گئے۔ اور حلال کو بالکل چھوڑ دیا۔ میں کہتا ہوں کیا کنز و ہدایہ بالکل لغو ہی ہیں۔ جب یہی بات ٹھہری کہ حلال کا وجود ہی نہیں تو ناحق اتنا بسط[1] کیا۔ صرف اتنا کافی تھا کہ الحلال[2] لا یوجد۔ ہرگز نہیں جس پہ کنز و ہدایہ فتوے دے دیں۔ وہ حلال ہے میں کہتا ہوں کیا سب علماء حرام خور ہیں۔

حکایت۔ ایک بزرگ تھے مولینا مظفر حسین صاحب ان کی یہ

---

[1] تفصیلی بات [2] حلال کا وجود ہی نہیں

حالت تھی کہ اگر کوئی ان کو مال حرام دھوکے سے بھی کھلا دیتا تھا تو قے ہو جایا کرتی تھی اور پھر بھی وہ دونوں وقت کھانا کھاتے تھے اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ حلال کا وجود دنیا میں ضرور ہے ورنہ وہ کیا کھاتے تھے۔ اگر فرض کیجئے کہ مال حرام ہی کھاتے تھے تو طبیعت کو یہ نفرت نہیں[1] ہو سکتی یا یہ کہ ہمیشہ قے ہی کیا کرتے ہوں گے تو کھانا فضول ہے۔ غرض دنیا میں حلال بھی ہے حرام بھی ہے جو مسائل دریافت کرنے سے معلوم ہو سکتا ہے۔ مگر لوگ پوچھتے ہی نہیں ؛

منشا اس غلط خیال کا کہ حلال رزق نہیں ملتا

اور یہ فساد پیدا کا ہے سے ہوا کہ لوگوں نے پوچھنا چھوڑ دیا جو جی میں آیا کرتے رہے حتےٰ کہ اس کے عادی ہو گئے اب جو کسی نے منع کیا تو اس کا چھوڑنا نہایت دشوار معلوم ہوا۔ بس کہہ دیا کہ میاں یہ لوگ تو خواہ مخواہ بھی حلال کو حرام ہی کہا کرتے ہیں۔ ان کی تو غرض یہی ہے کہ مال نہ بڑھے اور مسلمانوں کو ترقی نہ ہو۔ بس ہوتے ہوتے یہ ذہن میں جم گیا کہ ان کے یہاں تو سب چیز حرام ہی ہے۔ حلال کا وجود ہی نہیں جو حلال تھا وہ بھی حرام ہی سمجھنے لگے اور خوف سے مفتی کے پاس جانا چھوڑ دیا کہ دیکھا چاہیئے کہ ہمارے کس معاملہ کو حرام بتا دیں یا حلال بتائیں

[1] حاشیہ ہو جائے کیونکہ پھر تو وہ اس کے عادی ہوں گے ؛

تو ہماری خاطر سے ہی شاید کہہ دیں اور فی نفسہ حرام ہی ہوگا کیونکہ حلال کا تو وجود ہی نہیں۔ سو یہ خیال بالکل غلط ہے بلکہ جس کو مفتی مباح کہے وہ عند اللہ مباح ہے اس میں کچھ حرج نہیں۔ شیطان کے بہت سے جال ہیں۔ ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ وسوسہ ڈالتا ہے کہ یہ سب حرام ہے۔ پھر بعض لوگ حرام و حلال میں خواہ مخواہ شبہ کر کے حلال کو بھی چھوڑ دیتے ہیں کہ جب اس میں وسوسہ ہے تو چھوڑ ہی دو چاہے مفتی کتنا ہی کہے کہ یہ حلال ہے مگر وہ اس کے چھوڑنے ہی کو اولیٰ سمجھتے ہیں۔ نہیں اس فعل میں کچھ حرج نہیں جو مباح ہے۔ اہل علم سے پوچھ لو کہ کوئی وجہ اس میں اباحت کی بھی ہے وہ کوئی ظالم نہیں ہیں کہ خواہ مخواہ یہی چاہتے ہوں کہ تم کو دقت میں ڈالیں اور یہ خیال مت کرو کہ حلال موجود ہی نہیں پوچھ لو پھر جس سے وہ منع کریں۔ اس پر عمل کرنے کے لئے ہمت باندھو۔

نفس کی کم ہمتی کا عمدہ علاج

اور اگر نفس کم ہمتی ہی کرے تو اس سے یوں کہو کہ یہ جو حکام دقت

لہ جائز بتائیں تو چونکہ وہ لوگ اسی چیز کو جائز بتاتے ہیں جو شریعت میں جائز ہو تو وہ اللہ کے نزدیک جائز ہی ہے ۔

کے احکام ہیں۔ ان کو کس طرح مانتا ہے اس کو حاکم حقیقی کا حکم سمجھ کر مانو پھر دوسرے لوگ بھی انشاء اللہ تم سے معاملہ نہ کریں گے۔

حکایت۔ میرا ہی خود قصہ ہے کہ کبھی زیور بنوانا آتا تو چونکہ چاندی کے واسطے روپیہ دینے سے ربوا[1] لازم آ جاتا ہے۔ اس لئے جب کبھی زیور بنوانے کا اتفاق ہوتا میں چاندی دوسری جگہ سے خرید کر اسے دیتا۔ وہ ایک مرتبہ تو اس نے کہا کہ روپیہ دے دو پھر تول کر حساب کر دینا۔ میں نے اس سے کہہ دیا کہ یہ میرے دین کے خلاف بات ہے۔ بس اس نے اس کو خوشی سے منظور کر لیا تو لوگ سب مان جاتے ہیں آدمی پکا[2] چاہئے اور اللہ میاں کی طرف سے اسباب ویسے ہی پیدا ہو جاتے ہیں۔ خیال کر لیجئے کہ حاکم جب کسی کو امر شاق کا حکم دیتا ہے تو اس پر مامور[3] کی اعانت بھی کیا کرتا ہے۔ حاصل یہ کہ دل کو مضبوط کرو اور اس پر عزم[4] کر لو کہ ہم کوئی کام بلا پوچھے نہ کریں گے۔ ہاں پوچھنے سے بعض صورتیں عدم جواز کی بھی نکلیں گی اور اس میں آمدنی بھی کم ہو جاوے گی تو خوب سمجھ لو اور تجربہ کر لو کہ اس کم ہی میں برکت ہو جاوے گی اور اس کے یہ معنی نہیں کہ کم چیز مقدار میں بڑھ جاتی ہے کہ بازار سے تو ایک

---

[1] سود لازم آتا ہے ادھار کی وجہ سے اور دوسری وجہ اور بھی جو پہلے تھی اب نہیں کہ پہلے روپیہ چاندی کا ہوتا تھا کمی زیادتی سود تھی [2] جسکو حکم دیا گیا [3] پکا ارادہ

من گیہوں لائے اور گھر پہ آکر دو من اترے۔ ممکن ایسا بھی ہے۔ ایک صاحب خبر نے مجھ سے بیان کیا کہ وہ مسجد بنواتے تھے اور ایک تھیلی میں روپے رکھتے تھے اور کام شروع کیا۔ جب ضرورت ہوتی اس میں ہی سے ہاتھ ڈال کر نکال لاتے یہاں تک کہ سب کام بن گیا حساب جو لگایا تو جتنا روپیہ تھا اس سے کم نہیں ہوا۔ تو کبھی ایسا بھی ہوتا ہے مگر ہمیشہ ضرور نہیں بلکہ اس کے معنی اور ہیں اور وہی اکثر واقع ہیں اور وہ یہ کہ یہ مقدار قلیل جب تمہارے ہی صرف میں آئے۔ بیماری میں خرچ نہ ہو اور ایسے ہی فضول خرچیوں میں مقدمات میں لاطائل[1] تکلفات میں ضائع نہ ہو جائے۔ جو کچھ آئے تمہاری ہی ذات پر صرف ہونا چاہئے گو تھوڑا ہو اس سے بہتر کہ زیادہ آئے اور تم پر خرچ نہ ہو۔

رضاء حق عمل کا اصل ثمرہ ہے

اور آخر میں میں کہتا ہوں کہ نہ ہو برکت مگر خود اللہ میاں کی رضا ہی دنیا و ما فیہا سے بہتر ہے۔ اللہ میاں ملیں۔ پھر کیا حقیقت ہے کسی چیز کی، مال و دولت کے مقابلہ میں کیا اللہ میاں کی کچھ وقعت نہیں سمجھتے ہو حضرت اللہ میاں کی رضا وہ چیز ہے کہ جس کی نسبت

---

[1] بے فائدہ مثلاً فیشن تفریحات نام کے کھیل

ایک بزرگ کہتے ہیں۔ ع

تو بماں[1] اے آنکہ جز تو پاک نیست

دنیا کے حکام کی صرف خوشنودی کے واسطے کتنے کتنے سفر اور کیا کیا کچھ خرچ کرنا پڑتا ہے اور پھر ان کی خوشنودی دیرپا نہیں۔ ذراسی بات پر بگڑ گئے اور اللہ میاں فرماتے ہیں کہ ہم شکور[2] ہیں۔ خیال کیجئے اس لفظ کو۔ ایک بادشاہ کے سامنے کوئی چیز لے جائے اور وہ اس کی نسبت منظوری وعدم منظوری کچھ ظاہر نہ کرے مگر اس میں کوئی عیب نہ نکالے اور خازن[3] کو حکم دے دے کہ رکھ لو تو لے جانے والے کے دماغ آسمان پر پہنچ جاویں گے اور سناتا پھرے گا کہ بادشاہ نے ہمارا ہدیہ رکھ لیا۔ اور اللہ میاں کے یہاں ہم لوگ اپنے اعمال لے جاتے ہیں اور ذرا ان اعمال کو بھی دیکھ لیجئے کہ وہ کس قابل ہیں۔

ہماری نماز کی مثال

ایک نماز ہی کو لے لیجئے اس وقت نظیر کے واسطے۔ کھڑے ہوتے ہیں اللہ میاں سے باتیں کرنے کو اور کہتے ہیں کس سے

---

[1] تو ہی دل میں رہے۔ وہ ذات کہ جس کے سوا کوئی پاک ہی نہیں [2] قدرداں [3] خزانچی [4] اور وہ قدر کرتے ہیں۔

گاؤ خر[1] سے یا یوں مثال دیجیئے کہ ایک بادشاہ نے محض اپنی عنایت سے اپنے غلام کو دربار میں حاضری کی اجازت دی۔ بلکہ یوں کہئے کہ زبردستی طلب کیا (ہم ایسے بھلے مانس تو کاہے کو ہیں کہ حاضری کی اجازت سے ہی دربار میں پہنچنے کو غنیمت سمجھیں) زبردستی بلائے ہوئے بلکہ پابہ زنجیر ہو کر دربار میں پہنچے۔ اور کام ہم سے کیا ہے کہ بادشاہ کو ان پر رحم آیا ہے اور چاہتا ہے کہ ان سے دربار میں کچھ گفتگو کرلے کہ درباریوں اور تمام رعایا میں ان کی عزت ہو جائے اپنا کچھ نفع مقصود نہیں ؎

من[2] نکردم خلق تا سودے کنم — بلکہ تا بربندگان جودے کنم

ہائے من نکردم خلق تا سودے کنم — بلکہ تا بربندگان جودے کنم

اللہ میاں کا کیا نفع ہے ہمارے پیدا کرنے یا عزت دینے سے خیر ان حضرات نے کیا مکافات[3] کی اس بلانے کی کہ پہنچتے ہی تو منہ پھیر کر کھڑے ہو گئے اور کانوں میں انگلیاں دے لیں مگر بادشاہ تو کم ظرف نہیں ہے۔ اس گستاخی پر نظر نہیں کرتا اور حکم دیتا ہے اپنے خادموں کو کہ اس بے وقوف کی انگلیاں کانوں سے

---

[1] گاؤ خر گدھا سے کہ ان کا خیال آرہا ہے [2] میں نے مخلوق کو اس لئے نہیں پیدا کیا کہ اپنا کوئی فائدہ کروں بلکہ اس واسطے کہ بندوں پر سخاوت کردوں [3] بدلہ [4] دل کا منہ کان کی توجہ

نکال دو بلکہ ہاتھ باندھ دو کہ پھر انگلیاں کانوں میں نہ دے سکے۔ اور منہ اس کا ہماری طرف کر دو اور جلدی سے شفقت آمیز کلمات فرمانے لگے۔ کہ ایک دفعہ تو اس کے کان میں پڑ جائیں۔ دیکھیں تو معلوم کیسے نہیں ہوتا۔ مگر یہ تو قسم کھا کر چلے ہیں کہ اُلٹا ہی کریں گے۔ جھٹ سے پھر انگلیاں کانوں کی طرف بڑھائیں۔ مگر ہاتھ بندھے ہوئے تھے جلدی سے اس خوف سے کہ کہیں محبوب کا کلام کان میں پڑ جائے اس جگہ سے بھاگ اصطبل میں گھوڑے کے پاس جا چھپے۔ وہاں آدمی پکڑنے کے لئے پہنچا گدھے کے پاس جا چھپے۔ غرض ایک گھنٹہ بھر یہی کیفیت رہی کہ یہ بھاگا کئے اور بادشاہ کے نوکر بلکہ خود بادشاہ اللہ اکبر ان کے پیچھے پھرا کیا مگر انہوں نے وہی کیا جو شامتِ[۱] اعمال سے ہونا تھا۔

ہماری نماز پر سزا نہ ہونا ہی غایت[۲] درجہ کی رحمت ہے

اب فرمائیے کہ یہ شخص کس سزا کا مستحق ہے یا بادشاہ کو اس پر رحم آنا چاہئے۔ یہ تو اس قابل ہے کہ اگر ایک دفعہ بھی یہ حرکت

---

[۱] گناہوں کی بدبختی [۲] انتہا درجہ کی

اس نے کی ہے تو توہین بادشاہ کے جرم میں اس کو لے لیا جائے اور کبھی دربار کی حاضری کی اجازت نہ ہو۔ اب آپ اپنے معاملہ کو اللہ میاں کے ساتھ دیکھ لیجیئے کہ ادھر سے تو حاضری کی اجازت ہر وقت۔ یعنی نفل نماز کے لئے اجازت ہے جب چاہو پڑھو۔ (یا ستثنائے تھوڑے وقتوں کے) مگر ہمیں توفیق نہیں ہوئی کہ اس اجازت کو غنیمت سمجھیں۔ یہاں تک کہ پکڑ کر بلانے کی نوبت پہنچی یعنی فرض نماز کا وقت آیا۔ نہایت کاہلی کے ساتھ گرتے پڑتے پہنچے۔ بُرا بھلا وضو کیا اور باکراہ[1] بنیت نماز کی یعنی سامنے باتیں کرنے کو کھڑے کئے گئے۔ کھڑے ہوتے ہی منہ ایسا پھیرا کہ کچھ خبر نہیں۔ صرف الفاظ زبان پر جاری ہیں۔ دھوکا دینے کے واسطے آداب شاہی بجالاتے ہیں یعنی سبحانک اللھم پڑھا۔ اللہ میاں نے اس منہ پھیرنے پر نظر نہ کی اور کلام شروع کیا۔ چنانچہ الحمد للہ رب العالمین پر جواب ملنا حدیثوں میں آیا ہے۔ ذرا سی بھنک کان میں پڑتے ہی ایسے بھاگے کہ سیدھے گھر آکر دم لیا۔ کبھی بیوی کے پاس کبھی بچوں کے پاس کبھی مکان کبھی طویلہ میں پھرا کئے۔ مراد اس سے خیالات کا جولانی دینا ہے[2]۔ غرض یہی مسخراپن کیا کئے۔ یہاں تک کہ بمشکل تمام دربار کی حاضری ختم

---

[1] زبردستی [2] خیالات دوڑائے

تک پہنچی یعنی سلام پھیرا۔ بڑی خیر ہوئی بادشاہ کی ہمکلامی سے بچ گئے۔ جانے وہ کاٹ کھاتا یا کیا کرتا (یہ خبر نہیں کہ کیا کرتا اور کیا ہوتا اور یہ کیا پاتے) صاحبو! اب ان گستاخیوں کی سزا دینی ہونی چاہئے تھی یا نہیں۔ جو مثال میں میں نے عرض کی کہ اگر ایک دفعہ بھی ہم ایسی نماز پڑھتے تو کبھی اللہ میاں کے یہاں ہم کو گھسنے نہ دیا جاتا اور فوراً دربار سے نکلتے ہی گرفتاری اور حبس دوام کا روبکار جاری ہو جاتا۔ مگر سنیئے کہ اللہ میاں سے کیا روبکار جاری ہوا۔ وَكَانَ سَعْيُكُمْ مَّشْكُورًا ۔ اس نے دربار میں اتنی دیر کی مصاحبت کو بہت اچھی طرح انجام دیا۔ مرحبا نے کی بات ہے اچھی طرح تو جیسے انجام دی وہ ہم بھی خوب جانتے ہیں اور جو وہاں[2] حاضر تھے انہوں نے بھی خوب دیکھا بلکہ حاضرین کے سامنے شرم رکھنے کے واسطے اور فرماتے ہیں[3] اُولٰٓئِكَ يُبَدِّلُ اللّٰهُ سَيِّاٰتِهِمْ حَسَنٰتٍ ۔ گویا یہ بیوقوف ہے کتنی گستاخیاں کیں مگر ہم تو اس آنے کو حاضری ہی میں لکھے لیتے ہیں۔ اور اس کی وہی عزت کی جائے جو باقاعدہ آنے والے کی کی جاتی ہے۔ اب فرمائیے اگر ایک مرتبہ ایسا معاملہ بادشاہ کسی کے ساتھ کرے تو کیا دوبارہ اس شخص کی

---

[1] اور تمہاری کوشش قدردانی کی ہوئی ہوگی [2] یعنی فرشتے [3] یہی لوگ ہیں جن کی بدیوں کو اللہ تعالے نیکیوں سے بدل دیتے ہیں ؞

ہمت پڑ سکتی ہے۔ کہ پھر اسی وحشیانہ طریق سے دربار میں جاوے۔ ہرگز نہیں بلکہ سر سے پیر تک خجالت کے پسینہ میں غرق ہو جائے گا۔ مگر ہم ایسے احسان فراموش ہیں کہ ایک دو دفعہ کیا یعنی سینکڑوں بار بلکہ ہر روز پانچ بار یہی جفا کاری کرتے ہیں مگر ادھر سے مطلق خیال نہیں کیا جاتا۔ اس پر طرہ یہ کہ ان لنگڑے لولے اعمال (بلکہ اعمال کیسے کہا جا سکتا ہے بداعمالیوں) میں بھی کمی اور کوتاہی ہے۔ بلکہ خدا تعالےٰ کے محرماتؔ[1] کی طرف میلان ہے صاحبو! ذرا شرماؤ اور عمل کرو۔ اور حرام سے بچو۔ خاصکر رمضان کے مہینے میں۔

تلاوت قرآن شریف کا مع اپنے حق کے ضروری ہونا

اَلَّذِیْنَ اٰتَیْنٰھُمُ الْکِتٰبَ یَتْلُوْنَہٗ حَقَّ تِلَاوَتِہٖ اُولٰٓئِکَ یُؤْمِنُوْنَ بِہٖ وَمَنْ یَّکْفُرْ بِہٖ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْخٰسِرُوْنَ۔ یہ آیت سورہ بقر کی ہے ترجمہ اس کا یہ ہے کہ جن کو ہم نے کتاب دی ہے وہ اس کی تلاوت کرتے ہیں جیسا حق

---

[1] حرام کام

ہے تلاوت کا۔ ایمان والے یہی ہیں اور جو کتاب پر ایمان نہ لائے وہ خسارہ والے ہیں۔ اس کی دو تفسیریں ہیں۔ مگر دونوں میں یہ قدر مشترک[1] ہے کہ تلاوت کرنے والوں کی مدح ہے۔ اس آیت میں ہر چند کہ کتاب سے مراد توریت ہے۔ مگر ظاہر ہے کہ توریت کی تلاوت کے قابل مدح ہونے کا سبب توریت کا کتاب اللہ ہونا ہے۔ محض کتاب ہونا نہیں ہے۔ اور چونکہ قرآن پاک افضل کتب ہے تو اس کی تلاوت اور زیادہ قابل مدح ہوگی۔ اور اسی آیت سے اس کی فضیلت بطریق اولےٰ ثابت ہو گئی۔ اس آیت سے قرآن مجید کے تلاوت کرنے کی اور اس کے حقوق ادا کرنے کی فضیلت ثابت ہوتی ہے اور یہ بات بدیہی[2] ہے کہ تلاوت بلا سیکھے ہوئے اور پڑھے ہوئے کیسے ہو سکتی ہے۔ سیکھنا اور پڑھنا اس کا موقوف علیہ[3] ہے اور مقدمہ ضروری کا ضروری ہوتا ہے[4]۔ اگر آپ باورچی کو حکم دیں کہ کھانا پکا تو اس کا مطلب صرف یہی نہیں ہے۔ کہ ہانڈی چولھے پر رکھ کر آنچ دے بلکہ بازار سے گوشت لا۔ اور مصالح لا۔ اور اناج لا۔ اور پکانے کے برتن مہیا کر اور آگ جلا۔ تب ہانڈی کو آنچ دے۔ چنانچہ

---

[1] دونوں میں شریک بات [2] بالکل ظاہر [3] جس پر تلاوت موقوف کہ بدون اس کے نہیں ہو سکتی [4] جس پر کوئی ضروری چیز موقوف ہو وہ بھی ضروری ہوتا ہے۔

کھانا پکانے کے حکم کے بعد باورچی کا ان سامانوں میں لگا رہنا آپ کے نزدیک اور کاموں کے نہ کرنے کا عذر سمجھا جاتا ہے۔ اور ان کاموں میں اس کا لگا رہنا پکانے ہی کے حکم کی تعمیل سمجھا جاتا ہے۔ اگر اناج مثلاً نہ ہو اور وہ بیٹھا رہے اور عین وقت پر عذر کرے تو یہ عذر اس کا آپ ہرگز نہ سنیں گے کہ حضور آپ نے مجھے صرف پکانے کا حکم دیا تھا۔ یہ نہیں فرمایا تھا کہ اناج بھی منگانا اس کے عذر کے نہ سننے کی کیا وجہ ہے یہی کہ کسی چیز کا حکم ہے اس کے اسباب[1] و مقدمات کا بھی حکم ہے۔ الشئی[2] اذا ثبت ثبت بلوازمہ بنا بریں تلاوتِ کتاب کا مطلوب ہونا اس کے سیکھنے اور پڑھنے کا بھی مطلوب ہونا ہے۔ جو فضیلت تلاوت کی ہوگی۔ وہی فضیلت سیکھنے کی ہوگی اور جس قدر ضرورت تلاوت کی ہوگی اسی قدر ضرورت سیکھنے کی بھی ہوگی۔ غرض قرآن شریف کا سیکھنا ضروری ہوا اور دیکھئے کہ حق سبحانہ تعالےٰ نے صرف یتلون[3] نہیں فرمایا بلکہ حق تلاوتہ کی قید بھی بڑھائی اور اس میں اور اس میں بڑا فرق ہے۔ مثلاً ایک تو یوں کہیں کہ یہ کام کر لاؤ اور ایک یہ کہ یہ کام خوب سوچ سمجھ کر لاؤ اور اس دوسرے لفظ کا مطلب

---

[1] ذریعوں کا اور ان کا کہ جس پر یہ موقوف ہے [2] چیز جب موجود ہوتی ہے تو اپنے لازمی باتوں کے ساتھ ہوتی ہے [3] تلاوت کرتے ہیں [4] جیسا حق ہے تلاوت کا۔

یہ ہوتا ہے کہ نفس کام کرنے سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتے۔ تاوقتیکہ وہ من کل الوجوہ[1] مکمل نہ ہو۔ اس سے نفس امر کی اور زیادہ تاکید ہو جاتی ہے تو آیت میں نفس تلاوت کی اور زیادہ تاکید ہو گئی۔ پھر نفس تلاوت میں تشدید ہو جانے سے اس کے مقدمہ یعنی سیکھنے کے حکم میں بھی تشدید ہو گئی۔ غرض قرآن شریف کا سیکھنا ضروری بلکہ نہایت ضروری ہوا پھر اتنا سیکھنا بھی کافی نہیں ہو گا کہ نفس تلاوت کا ذریعہ ہو بلکہ اتنا سیکھنا چاہیئے کہ حقوقِ تلاوت ادا ہوں۔ اب سمجھئے کہ حق تلاوت کیا ہے۔ ہمیشہ یاد رکھئے کہ جس چیز کی فضیلت بیان ہو اور جس چیز کی برائی بیان ہو۔ اس کی حقیقت سمجھ لینا چاہیئے اگر وہ چیز اپنی حقیقت پر ہو تو قابل فضیلت یا برائی ہے ورنہ نہیں

حقیقت تلاوت

یہاں تلاوت کتاب اللہ کی فضیلت بیان ہوئی لہذا اُس کی حقیقت سمجھ لیجئے کہ حق سبحانہ تعالےٰ نے اپنی کتاب اتاری جو مجموعہ ہے اوراد[2] کا اور قصص[3] اور حکایات کا اور احکام کا اور جامع ہے تمام بھلائیوں کو قطع نظر تمام خوبیوں سے محض کلام اللہ ہی ہونا اس کا مقتضی اس امر کا ہے کہ ہم جیسے ناچیز

---

[1] ہر طریقہ سے [2] وظیفے [3] قصے

بندوں کو اس تک رسائی بھی نہ ہوتی۔ کہاں وہ کلام مقدس کہاں
ہم حقیر بندے۔ دیکھ لیجئے دنیا کے ذرا ذرا سے بادشاہوں کے
دربار کی حاضری کے لئے لوگ کتنی کتنی کوششیں کرتے ہیں اور
عمریں گذار دیتے ہیں۔ تب کہیں سلام کرنے کا موقع ملتا ہے اور
جس کو ایک دو بات کرنے کا موقع مل گیا وہ اپنے آپ کو کتنا کچھ
سمجھنے لگتا ہے اور تمام سلطنت بھر میں اس کی کیا عزت ہو جاتی
ہے۔ جب کلام شاہان دنیا کی یہ عزت ہے تو بادشاہِ شاہان
اور احکم الحاکمین کے کلام کی کیا کچھ عظمت ہونی چاہیئے۔ شاہان دنیا
کا کلام دو چار برس کی تمنا اور کوششوں کے بعد میسر ہوتا ہو تو
کلامِ الٰہی اگر کچھ بھی نہیں تو دو چار برس کی محنت کے بعد تو نصیب
ہونا چاہیئے مگر نہیں۔ کس درجہ رحمت ہے اللہ میاں کی کہ ہمارے
ہاتھوں میں اپنی کتاب دے دی اور اذنِ عام[1] دے دیا کہ جس
کا جس وقت جی چاہے ہم سے باتیں کرے پھر صرف اذن ہی
نہیں بلکہ مطالبہ بھی ہے بندوں سے کہ باتیں کرو اب ہم بندے
اپنی ذلت اور احکم الحاکمین کی عزت کو پیش نظر کر کے دیکھیں کہ یہ
باتیں کرنے کی فرمائش کیا چیز ہے۔ سوا اس کے کچھ نہیں کہا جا سکتا
کہ محض فضل ہے معلوم ہو گیا ہو گا کہ تلاوت کتاب اللہ کی حقیقت

---

[1] عام اور سب کو اجازت

اللہ میاں سے باتیں کرنا ہے۔ اب اس آیت میں فرماتے ہیں کہ ہم سے باتیں تو کرو گے مگر قاعدے اور ادب کے ساتھ کرنا یَتْلُوْنَهٗ حَقَّ تِلَاوَتِهٖ[1] ترکیباً تو اخبار ہے[2] مگر مقصداً انشا ہے یعنی تلاوت کرنے والوں کو چاہیئے کہ تلاوت کے حقوق ادا کریں۔

تلاوت کے ظاہری و باطنی حقوق اور قرآن کی تعلیم کی جامعیت

جب تلاوت کی حقیقت معلوم ہوگئی تو اب سمجھ لیجیئے کہ حقوق دو طرح کے ہوتے ہیں۔ باطنی اور ظاہری قربان جائیے تعلیم شریعت کے کہ اعمال میں صرف بناوٹ نہیں سکھلائی بلکہ ظاہری حقوق بھی بتائے اور باطنی بھی اور باطنی کو ظاہری سے زیادہ ضروری رکھا مثلاً ماں باپ کے حق ظاہری کو فرمایا وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ کہ ان کے سامنے پستی اختیار کرو۔ وضع میں قطع میں تکلم میں نشست و برخاست میں غرض ہر چیز میں ان سے تذلل برتو کسی بات میں ان پر ترفع مت کرو۔ یہ تو حق ظاہری ہے اور حق باطنی کو سبحان اللہ کیسے ذرا سے لفظ سے ادا فرما دیا۔ یعنی مِنَ الرَّحْمَةِ

---

[1] تلاوت کرتے ہیں اس کی جیسا کہ اس کی تلاوت کا حق ہے [2] ترکیب میں تو جملہ خبریہ ہے مگر مقصود و معانی انشا اور حکم کے ہیں [3] اپنے کو پست کرنا [4] بلندی حاصل کرنا

یعنی ان کے سامنے نری ظاہری پستی پر اکتفا نہ کرو۔ اس کا کچھ اعتبار نہیں۔ بلکہ اس ظاہری پستی کا منشا رحمت ہو۔ رحمت رقت قلب کو کہتے ہیں۔ یعنی ان کی خدمت دل سے کرو۔ جیسا کہ ظاہر ان کے سامنے پست کیا ہے۔ باطن کو بھی پست کرو۔ دل کے اندر خشوع بھی ہو خضوع بھی ہو۔ قرآن میں کوئی ضروری بات چھوڑی نہیں جاتی۔ یہی خوبی ہے کلام اللہ کی تعلیم کی۔ کسی حکیم کی یا کسی فلسفی کی تعلیم میں یہ بات نہیں پائی جاتی اور اس پر بھی اکتفا نہیں کیا آگے فرماتے ہیں وَقُلْ رَّبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيَانِيْ صَغِيْرًا۔ اوپر تو ان حقوق کا حکم تھا جن کی ادا کا علم والدین کو اور اور لوگوں کو وقت ادا ہو جائے گا۔ اور اس میں فرما دیا تھا کہ صرف ظاہری بناوٹ نہ ہو۔ ان کو بھی دل سے ادا کرو۔ یہاں حکم ہے کہ ان حقوق کو بھی ادا کرو جن کی اطلاع بھی نہ ہو۔ قل رب ارحمہما یعنی ان کے لئے دعا بھی کرو۔ یہ بھی ایک حق باطنی ہے۔ بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ حق تین ہیں۔ ظاہری اور باطنی اور ابطن اور تینوں قسموں کے ادا کا حکم ہے۔ اسی طرح حق تلاوت بھی مختلف ہوتے ہیں میں اس کی ایک مثال دیئے دیتا ہوں جس سے اچھی طرح توضیح ہو جائیگی۔

لہ عاجزی وانکساری لے اور کہو اے میرے پروردگار ان پر ایسا رحم فرما جیسا انہوں نے مجھے چھوٹے پن میں پالا ہے لے بہت باطن اور چھپا۔

تلاوت کی ایک مثال

فرض کیجئے کہ بادشاہ کسی کے ہاتھ میں شاہی قانون دے کر کہے کہ اس کو پڑھو تو اس کی حالت پڑھنے کے وقت یہ ہوگی کہ ہر ہر لفظ کو صاف صاف پڑھے گا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ اس کا پڑھنا بادشاہ کے ناپسند ہو اور اس کے معنی اور مفہوم کو بھی سمجھتا جائے گا ایک تو اس خیال سے کہ عبارت کا لہجہ بلا معنی سمجھے ہوئے ٹھیک نہیں ہو سکتا اور ایک اس خیال سے کہ شاید کہیں بادشاہ پوچھ بیٹھے کہ کیا مطلب سمجھا تو خفت نہ ہو اور ایک حالت پڑھنے والے کی یہ ہوگی کہ دل میں اس قانون کے احکام کی تعمیل کا بھی عزم ہوگا۔ اور یہ کسی قرینہ سے ظاہر نہ ہونے دے گا کہ میں اس کی پابندی میں کچھ کوتاہی کرتا ہوں۔ بلکہ حال قال سے یہی ثابت کریگا کہ میں سب سے زیادہ تعمیل کرنے والا ہوں۔ بس اس مثال کو ذہن میں حاضر رکھئے۔

تلاوت قرآن شریف کے تین مرتبے ہیں

اور سمجھئے کہ قرآن مجید کی تلاوت میں بھی اس طرح کے تین مرتبے ہیں۔ ایک مرتبہ الفاظ ظاہری کا ہے یعنی ہر ہر حرف کو علیحدہ علیحدہ صاف صاف اور اپنے مخرج سے ادا کرنا اور

ایک مرتبہ معنی کا یعنی مدلول الفاظ کو سمجھ لینا یہ نہیں کہ خیال کہیں ہے صرف طوطے کی طرح سے لفظ ادا کر دئیے یہ مرتبہ حق باطنی کا ہے۔ اور ایک مرتبہ اس سے بھی ابطن ہے وہ اس کے احکام پر عمل کرنا ہے۔ جب یہ تینوں باتیں جمع ہوں گی تب کہا جائے گا کہ حق تلاوت کا ادا ہو گیا۔ غرض کل تین حق ہوئے۔ ایک حق ظاہری یعنی تلاوت۔ دوسرا حق باطنی یعنی معنے سمجھ لینا۔ تیسرا عمل کرنا یہ بمقابلہ دوسرے کے بھی باطن ہے تو اس کو ابطن کہہ سکتے ہیں کیونکہ یہ معاملہ فیما بینہ[1] و بین اللہ ہے اور ان تینوں میں وجوداً[2] سب سے مقدم حق ظاہری ہے اور موکد[3] سب سے زیادہ تیسرا درجہ ہے۔ یعنی عمل۔ ان دونوں میں حقیقت اور صورت کا فرق ہے۔ اصل چیز حقیقت ہی ہوتی ہے لیکن وجود اس کا لباس صورت میں ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے صورت مقدم ہوتی ہے اور ضروری دونوں ہیں۔ پس حقیقت بلا صورت کے باطل ہے اور صورت بلا حقیقت کے بھی عاطل[4]۔ غرض ثابت ہوا کہ عمل بھی ایک حق ضروری ہے یہ نہیں کہ محض مرتبہ مستحب ہی میں ہے۔ دیکھئے اللہ میاں نے آگے فرما دیا۔ اُولٰئِکَ یُؤْمِنُوْنَ

---

[1] اس کے اور اللہ تعالےٰ کے درمیان [2] موجود ہونے کے اعتبار سے

[3] تاکیدی [4] بے کار

ب۔ جو لوگ تلاوت کا حق ادا کرتے ہیں وہی ایمان رکھتے ہیں۔ یعنی کامل ایمان انہیں کا ہے۔ پس عمل موقوف علیہ ہے کمال ایمان کا اور کمال ایمان کی تحصیل واجب ہے تو ضرور عمل بھی واجب ہوگا۔

اللہ تعالیٰ کی صفت کبریائی[1] کے لحاظ رکھنے سے کل مفاسد کی اصلاح ہوجاتی ہے

وَلَهُ[2] الْكِبْرِيَاءُ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ط بس آیت میں حق سبحانہ وتعالیٰ نے خاص اپنی ایک صفت بیان فرمائی ہے اگر اس کو انسان نظر میں رکھے تو کل مفاسد اس سے الگ ہیں۔ خلاصہ اس کا معرفت تعلق انسانی ہے اللہ تعالےٰ کے ساتھ۔ ظاہر ہے کہ تعلق امر نسبتی[3] ہے جو طرفین کو چاہتا ہے۔ ایک طرف حق تعالےٰ، ایک طرف بندہ تو اس تعلق کے پہچاننے کا طریق دو معرفتوں کا جمع کرنا ہے یعنی معرفت

---

[1] عظمت اور بڑائی کی صفت [2] اور اللہ تعالےٰ ہی کے لئے ہے بڑائی سب آسمانوں اور زمینوں میں اور وہی غلبہ والے اور حکمت والے ہیں [3] دو چیزوں کا درمیانی تعلق یعنی دونوں جانبوں کا پہچاننا ہے۔

حق تعالیٰ کی اور معرفت اپنے نفس کی اور ان میں سے ہر ایک کو دوسرے کے ساتھ تلازم[1] بھی ہے۔ اگر حق تعالیٰ کو پہچان لیا جائے تو نفس کی پہچان ہو جائے گی۔ اور اگر نفس کا علم ہو جائے تو معرفت حق تعالیٰ ہو جائے گی۔ اسی واسطے کہا گیا ہے[2] مَنْ عَرَفَ نَفْسَهٗ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّهٗ اور پہلی[3] معرفت دوسری معرفت سے اس لئے اہم ہے کہ نفس تو حاضر ہے اور اللہ غائب اور غائب کا پہچاننا مشکل ہے حاضر سے۔ اس اہمیت کے سبب اس آیت میں اسی کی تعلیم کی گئی ہے کہ اس میں اپنی ایک صفت ذکر فرمائی کہ اس صفت سے پہچانیں۔ اور وہ صفت کبریا ہے۔ جو تمام صفات کے درجہ کمال کو شامل ہے اور معنی اس کے بڑائی ہیں جس کو حق تعالیٰ نے اپنے ساتھ مخصوص فرمایا ہے اور جب یہ حق تعالیٰ کے ساتھ خاص ہے تو دوسرے میں نہ ہونی چاہئے سو جب تک یہ معرفت محفوظ رہے گی۔ حاشا[4] وکلا جو کوئی مفسدہ بھی ہونے پائے۔

کبر تمام عیوب حتیٰ کہ کفر و شرک کی بھی جڑ ہے

اور جب یہ معرفت نہ رہے گی اور بندہ صفت کبریا کو اپنے

---

[1] لازم ہونا [2] جس نے اپنے آپ کو پہچان لیا اس نے اپنے رب کو بھی پہچان لیا

[3] اللہ تعالیٰ کی [4] نظروں سے اوجھل [5] ہرگز ہرگز

اندر لینا چاہے گا تو جو کچھ بھی مضرتیں اور عیوب پیدا ہوں کم ہیں۔
اور واقع میں یہی ایک صفت کبریا ہے کہ بیخ ہے تمام مفاسد کی
حتٰی کہ شرک کی دنیا میں جو کوئی بھی کافر ہوا ہے وہ کافر نہیں
ہوا مگر اپنے نفس کے کبر سے ورنہ حق مخفی نہیں رہتا۔ ¹ وَ
جَحَدُوْا بِهَا وَاسْتَيْقَنَتْهَا الآيہ۔ ظلم اور علو کو سبب
فرمایا جحد² کا علو اور کبر ہم معنی ہیں۔ ابو طالب کو ایمان سے کس
نے روکا صرف عار نے یوں کہا کہ مرتے وقت ایمان لاؤں گا.
تو قوم میری کہے گی۔ ابو طالب دوزخ سے ڈر گیا اس کی حقیقت
یہی تو ہے کہ جو رفعت³ قوم پر حاصل ہے وہ نہ رہے گی۔ اس
رفعت نے بیچارہ نہ چھوڑا۔ یہاں تک کہ کام تمام ہی کر دیا اور کبر
کا وجود کسی ایک گروہ میں نہیں بلکہ یہ وہ عام مرض ہے کہ کم و بیش ہر
طبقہ کے لوگ اس میں مبتلا ہیں۔ اور دوسرے عیوب میں تو اکثر جاہل
لوگ پھنسے ہوتے ہیں۔ تعلیم یافتوں میں وہ عیب کم ہوتے ہیں کیونکہ
وہ ان کے بُرے نتائج کو جانتے ہیں لیکن اس میں جاہل عالم سب
کم و بیش مبتلا ہیں مشرکین عرب تو جاہل تھے۔ اب اس گروہ کو دیکھئے
جو تعلیمیافتہ کہلاتا تھا۔ یعنی اہل کتاب ان کو بھی ایمان لانے میں جو

---

¹ اور بنی اسرائیل نے انکار کر دیا آیات کا ظلم اور تکبر کی راہ سے حالانکہ یقین رکھا تھا انکے دلوں نے ² انکار کا علو یعنی بڑائی سے ہونا اور تکبر ایک معنی میں ہیں ³ بلندی

خارج ہوا سو وہی کبر اس مختصر بیان سے بقدر کفایت اس کی توضیح ہو گئی کہ کفر و شرک کا مبنیٰ ہمیشہ کبر ہے۔ اب غور کر کے دیکھئے تو یہ بھی ثابت ہو جائے گا اور بہت سے معاصی کا مبنیٰ بھی کبر ہی ہے جو کفر و شرک سے نیچے ہیں۔ ایسے گناہ کبر سے اس طرح ہوتے ہیں کہ گنہگار اپنے بُرے عمل کو صرف اس عار کی وجہ سے نہیں چھوڑتا کہ لوگ کہیں گے اتنے روز سے یہ احمق رہا۔ اس کام کو ہمیشہ سے کیوں کرتا رہا جو اب چھوڑنا پڑا۔ اس شخص نے عیب حماقت سے اپنے نفس کو بچایا یہی کبر بڑا مرض ہے۔

تکبّر کا عِلاج

اور علاج بالضد ہوا کرتا ہے یہ مرض پیدا ہوا عدم معرفت کبریائے حق سے تو علاج معرفت کبریائے حق ہو گا۔ یعنی عظمت حق تعالےٰ کی۔ اس کو حق تعالےٰ نے آیت میں بلفظ حصرؔ اپنے واسطے ثابت کیا ہے۔ وَلَهُ الْكِبْرِيَاءُ یعنی اسی کے واسطے ہے عظمت، بلاغت کے قاعدے سے لہٗ کو مقدم کرنے کا یہی مطلب ہے کہ عظمتِ مخصوص ہے ذاتِ باری تعالےٰ کے ساتھ

ل اگر کبر نہ ہوتا اور عاجزی ہوتی تو اس کی پرواہ نہ کرتا۔

ٹ صرف اور صرف کہہ کے۔

یہ صفت دوسرے میں بالکل نہیں ہو سکتی۔ نیز یہ نہیں فرمایا کہ اَلْکِبْرُ بِالْعُظَمٰی کہ بڑی عظمت تو حق تعالےٰ کے لئے ہے۔ اور چھوٹا موٹا کوئی حصہ اس کا دوسرے کے لئے بھی ثابت ہے بلکہ مطلق کبریاء کو دوسرے سے نفی کر دیا۔ اسی کو حدیث میں اس لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے اَلْعَظَمَةُ اِزَارِیْ وَالْکِبْرِیَاءُ رِدَائِیْ فَمَنْ نَازَعَنِیْ فِیْهِمَا قَصَمْتُهٗ یعنی عظمت میرا تہبند ہے اور کبریا میری چادر ہے جو کوئی ان دونوں کو مجھ سے چھیننا چاہے گا میں اس کی گردن توڑ دوں گا (چادر اور تہبند فرمانا کنایہ ہے خصوصیت سے معنی یہ ہوئے کہ یہ دو صفتیں خاص ہیں میرے ساتھ دوسرا کوئی مدعی ہوگا تو میں اس کو سزا دوں گا۔ جب کبر[1] حق ہوا باری تعالےٰ کا تو اپنے نفس میں اس کا رکھنا مساواۃ ہوئی۔ باری تعالےٰ کے ساتھ۔ اور دیگر معاصی کے لئے تو حدود ہیں کہ جب تک ان تک نہ پہنچے معصیت نہیں ہوتی مثلاً کھانا کہ جب تک اتنا زیادہ نہ ہو کہ موجب ہو جائے مرض کا اس وقت مباح ہے۔ یا بھوکا رہنا کہ جب تک کہ سبب نہ ہو جائے ہلاکت کا جائز ہے۔ مگر کبر وہ معصیت ہے کہ اس کے لئے کوئی حد نہیں بلکہ فرماتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لَا یَدْخُلُ الْجَنَّةَ مَنْ کَانَ فِیْ قَلْبِهٖ مِثْقَالُ

---

[1] بڑائی

ذَرَّةٍ مِّنْ کِبْرٍ یعنی جس کے دل میں ایک ذرہ کے برابر بھی کبر ہوگا
وہ جنت میں نہ جائے گا بلکہ ایک حدیث میں اس سے بھی زیادہ
تشدد ہے۔ اَخْرِجُوا مِنَ النَّارِ مَنْ کَانَ فِیْ قَلْبِہٖ مِثْقَالُ ذَرَّۃٍ مِّنْ
اِیْمَانٍ یعنی قیامت کے دن حکم ہوگا کہ جس کے دل میں ایک ذرہ بھر
بھی ایمان ہے۔ اُسے دوزخ سے نکال لو۔ اسے پہلی حدیث سے
ملائیے تو کیا نتیجہ نکلتا ہے۔ وہاں فرماتے ہیں کہ ایک ذرہ بھر بھی
کبر جس کے دل میں ہے جنت میں نہ جائے گا۔ یہاں فرماتے ہیں
کہ ایک ذرہ بھر بھی ایمان جس کے دل میں ہے جنت میں جائے گا۔
اس سے صاف یہ بات نکلتی ہے کہ ذرہ بھر بھی کبر جس دل میں ہے
اس میں ذرہ بھر بھی ایمان نہیں ہو سکتا۔ اور ذرہ بھر بھی ایمان جس دل
میں ہے اس میں ذرہ بھر کبر نہیں ہو سکتا ہے۔ دونوں بالکل نقیضین
ہیں گو اس کی توجیہہ یہ ہے کہ جنت میں جانے کے وقت ذرہ بھر
کبر نہ ہوگا۔ لیکن آخر اس سے بھی تو اس صفت کا مضادِ[۱] ایمان کسی
درجہ میں ہونا ثابت ہوا۔ اب سمجھ لو کہ کبر کس قدر سخت مصیبت
ہے اور ہونا چاہیئے کیونکہ سب سے بڑا گناہ کفر ہے اور کبر خود
اس کی بھی اصل[۲] ہے اور کفر اس کی فرع تو مسلمان کو چاہیئے غور

---

[۱] سخت حکم [۲] ایمان کی ضد ہے جڑ ہے کیونکہ حق تعالیٰ کی عظمت دل میں نہ ہوئی
اور اپنے کو کچھ سمجھا جبھی تو ان کی ذات یا صفات یا حکم کا انکار ہو کر کفر ہوا۔

کیا کبر ہے۔ کہ اس کے دل میں کبر ہے یا نہیں۔ مگر ہماری تو عادت ہو گئی ہے کہ سوچتے ہی نہیں ورنہ معلوم ہو جاتا کہ نہ دینیدار ہمارے خالی ہیں کبر سے نہ دنیا دار خالی ہیں کبر سے۔ جو دینیدار کہلاتے ہیں۔ وہ دین کے پیرایہ میں اس میں گرفتار ہیں اور جو دنیا دار ہیں ان کو خبر نہیں کہ کبر کوئی چیز ہے یا نہیں۔ چنانچہ دینیدار لوگ نماز پڑھتے ہیں اور اپنے آپ کو سمجھتے ہیں کہ ہم دنیا داروں سے اچھے ہیں جتنی ترقی ان کو نماز پڑھنے سے ہوتی ہے اس سے زیادہ تنزل اس پندار[1] سے ہوتا ہے۔ دین کے ساتھ ساتھ بدترین دنیا ان کے قلب میں جگہ پکڑے ہوئے ہے۔ اس کا مطلب کوئی یہ نہ سمجھے کہ نماز میں جب یہ خرابی ہے تو ان کو چاہئے کہ نماز چھوڑ دیں۔ اصل یہ ہے کہ یہ خرابی نماز میں جب پیدا ہوتی ہے۔ جبکہ حق تعالےٰ کی عظمت قلب میں نہ ہو۔ اور جب عظمت ہو تو دوسری طرف توجہ ہی نہیں ہو سکتی بلکہ حق تعالےٰ کی عظمت کے سامنے اپنی نماز سے آدمی بجائے اس کے کہ اترا وے الٹا شرمندہ ہوتا ہے۔ اس کی ایسی مثال ہے کہ کسی بہت بڑے شاہنشاہ کے حضور میں ایک نہایت ذلیل آدمی کوئی تحفہ بہت کم قیمت لے جائے دربار کی عظمت وشوکت دیکھ کر اس کی کیا حالت ہو گی۔ مختصر یہ ہے کہ

---

[1] خود کو کچھ سمجھنے سے۔

اس ذلیل تحفہ کو پیش کرنے پر بھی اس کو قدرت نہ ہوگی ہاتھ پیر
پھول جائیں گے اور غنیمت سمجھے گا کہ کسی سزا کا حکم نہ ہو جائے۔
جلدی کسی طرح یہاں سے نکل جاؤں۔ ہماری نمازوں کی جو حقیقت
ہے وہ خوب معلوم ہے۔ پھر اس کو حق تعالے جیسے احکم الحاکمین
کے سامنے پیش کرکے ذرا شرم بھی نہ آنا اسی وجہ سے ہے کہ
عظمت و جلال حق تعالے سے ہم نے قطع نظر کر لی ہے[1]۔ اور
اسی سے یہ خرابی پیدا ہوئی کہ دوسری طرف توجہ ہوئی۔ اور
اپنی نماز کو کچھ سمجھ کر دوسروں کو حقیر سمجھنے لگے۔ اس تقریر سے
بخوبی سمجھ میں آگیا ہوگا کہ نماز پڑھنے یا اور دین کے احکام بجا
لانے سے اگر دل میں کبر پیدا ہو تو اس کا علاج یہ نہیں کہ اس
عمل کو چھوڑ دیا جائے۔ بلکہ جو سبب[2] ہے اس کو قطع کیا جائے۔

تکبر کا سبب اور اس کا عموم اور غموض[3]

سبب اس کبر کا تعمیل حکم دین نہیں ہے بلکہ عظمت الٰہی کا
دل میں نہ ہونا ہے۔ سو اس کو پیدا کرنا چاہئے۔ اس سے تعمیل
حکم بھی ہوگی اور وہ خرابی جو اس کے ساتھ لگی ہوئی ہے وہ بھی

---

[1] نظر ہٹالی کہ وہ سامنے نہ رہے تو یہ نماز بھی عبادت قابل قبول سمجھ لی ہے [2]
دل میں حق کی عظمت اور جاہ و جلال کا نہ ہونا [3] عام ہونا اور باریک ہونا۔

نہ رہے گی۔ اس غلطی میں بہت سے لکھے پڑھے اور سمجھ دار بھی مبتلا ہیں۔ خوب سمجھ لو غرض ہمارے دیندار بھی کبر میں مبتلا ہیں۔ اور دنیا دار بھی۔ دنیا داروں میں اس طرح کا کبر تو نہیں ہے۔ جو دیندار وں میں ہے ہاں دنیا داروں میں اور طرح کے کبر ہیں۔ وضع میں لباس میں بیاہ شادی میں کبر میں سب گناہوں سے بڑھ کر ایک خرابی اور ہے وہ یہ کہ مسلمان خواہ کسی درجہ کا ہو مگر اس کے دل میں یہ بات ضروری ہے کہ جب کوئی گناہ ہو جائے گو نہ تو گذرتا ہے کسی ضرورت سے لیکن کرنے کے بعد دل میں چوٹ ضرور لگتی ہے اور پشیمان ہوتا ہے مگر کبر کہ یہ گناہ ساری عمر دل میں رہتا ہے اور دل میں صدمہ نہیں ہوتا۔[۱]

غیبت حسد وغیرہ جو کبر ہی سے پیدا ہوتے ہیں ان کا چھوڑنا بھی معین[۲] فی العلاج ہے

تو ہر اس عمل کو جو کبر کی فرع ہو چھوڑ دو۔ جیسے غیبت حسد

---

[۱] نہ چوٹ لگتی ہے نہ اس کو برا سمجھتا ہے نہ شرمندگی اور توبہ ہوتی ہے اسلئے یہ سب زیادہ خطرناک ہوا [۲] دوسرے کے مال یا عزت کے جاتے رہنے کی خواہش اور غیبت ہر وہ بات ہے جو دوسرے کو ناگوار معلوم ہو خواہ اس میں وہ ہو یا نہ ہو سامنے ہو یا پیچھے۔ [۳] کبر کے علاج میں مدد دینے والا

وغیرہ غیبت کوئی جب ہی کرتا ہے کہ جب اپنے آپ کو اس سے اچھا سمجھتا ہے جس کی غیبت کرتا ہے۔ کسی مریض کو ہنستا وہی شخص ہے جو خود تندرست ہو اور اگر اپنے آپ کو اس سے بھی زیادہ مریض پائے تو کہیں نہیں دیکھا ہوگا کہ وہ اپنے سے کم مریض کو ہنستا ہو۔ یہ اچھا سمجھنا ہی کبر ہے۔ علی ہذا دوسرے کی نعمت کو دیکھ کر جو آدمی جلتا ہے (جسے حسد کہتے ہیں) اس کی بنا بھی اس پر ہے کہ اس صاحب نعمت سے زیادہ اپنے آپ کو اس نعمت کا اہل سمجھتا ہے یہ بھی اپنے نفس کی بڑائی ہے جسے کبر کہتے ہیں۔ غرض اکثر گناہوں کو ٹٹولو گے تو بنا کبر ہی پاؤ گے۔ لہذا سب کو چھوڑ دو جتنے کہ معاصی کی اصل ہی دل سے نکل جائے۔ کیونکہ بڑائی کو حق تعالے نے اپنے ساتھ مخصوص فرمایا ہے۔ کسی دوسرے کا اس میں حصہ نہیں تو جو شخص کبر کو نہیں چھوڑتا وہ نہیں پہچانتا کہ یہ کس کا حق تھا۔ اور کس کو دیتا ہے تو اس نے نہ نفس کا حق پہچانا نہ حق تعالے کا، اس سے بڑھ کر جاہل کون ہوگا۔ یہ شخص معاصی سے کبھی چھوٹ نہیں سکتا۔ جس گناہ میں بھی پڑ جائے کم ہے۔ کیونکہ معاصی کی جڑ اس کے دل میں موجود ہے۔ ایک سے نیچے گا

لہ کبر اور خود کو کچھ سمجھنا۔

دوسرے میں پڑ جائے گا۔

کبر کا نہایت مجرب اور کافی علاج

اس واسطے حق تعالےٰ نے ایک ایسا علاج اس کا بتادیا کہ جب اس کو مستحضر[1] رکھا جائے تو نہ چھوٹا گناہ ہو نہ بڑا۔ وہ علاج یہ ہے کہ اپنی ایک صفت کو بیان فرمایا کہ جب خیال رکھوگے کہ یہ کسی دوسرے کے لئے کسی وقت اور کسی حالت میں ثابت نہ ہونے پائے تو گناہ تم سے خود بخود چھوٹتے جائیں گے۔ اور وہ صفت عظمت ہے۔ وَلَهُ[2] الْكِبْرِيَاءُ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ۔ یہ اصل کل ہے تمام گناہوں سے حفاظت کی اور جب صفت کبریا یعنی عظمت مختص ہوئی ذات باری تعالےٰ کے ساتھ تو نفس کے واسطے کیا رہ گیا۔ تذلل[3] یہ اصل ہے تمام عبادت کی تو جس شخص نے صفت کبریا کو مختص مان لیا حق تعالےٰ کے ساتھ اس نے حق تعالےٰ کو بھی پہچان لیا اور نفس کا بھی اس سے بھی بڑھ کر کون عالم یا محقق ہو سکتا ہے۔ انہیں کی شان میں ہے۔ وَاُولٰٓئِكَ هُمْ اُولُوا الْاَلْبَابِ یعنی

---

[1] ذہن میں حاضر [2] اور اللہ تعالےٰ کے ہی لئے ہے عظمت بڑائی سب آسمانوں اور زمینوں میں [3] ان کے آگے خود کو ذلیل کر دینا۔

عقلمند لوگ یہی ہیں جب آدمی کے دل میں سے تمام گناہوں کی اصل[1] نکل گئی اور تمام عبادات کی جڑ[1] قائم ہوگئی تو سبھی کچھ اس نے پالیا۔ اس کو دن دونی رات چوگنی ترقی ہوگی۔ اس کے ساتھ اور سمجھ لو کہ یہ اصل کلی بہت مختصر الفاظ میں سمجھائی گئی ہے۔ مگر بعض اوقات بلا تفسیر کے اس پر عمل دشوار ہوتا ہے۔ یعنی جب تک ہر ہر عمل کی نسبت معلوم نہ ہو کہ اس کا منشا کبر کس طرح ہے۔ اس کا ترک آسان نہیں ہو سکتا۔

کتب دین کا مطالعہ بھی معاون[2] فی العلاج ہے

اس کے لئے سہل اور مفید تدبیر یہ ہے کہ کتابوں[3] کا مطالعہ کیا جایا کرے بلکہ کسی سے سبقاً سبقاً پڑھ لیا جاوے۔ اور جو کوئی نہ پڑھ سکے وہ کسی عالم سے وقتاً فوقتاً سن لیا کرے۔ واقعات کو پوچھتا رہے اور وعظ سنا کرے اور عورتوں کو خاص طور پر یاد رکھنا چاہیئے کہ جہاں ان کی ہانڈی چولھے کا ایک وقت ہے کتاب کے پڑھنے یا سننے کا بھی ایک وقت ہونا چاہیئے۔ لیکن افسوس کے ساتھ کہا جاتا ہے کہ مستورات کو اس سے بالکل مس بھی نہیں۔ مرد تو کبھی کوئی مسئلہ پوچھ بھی بیٹھتے ہیں مگر عورتوں کو نہ کہیں زبانی پوچھتے دیکھا نہ کوئی تحریر کسی کی آتی ہے (الا ما شاء اللہ) حالانکہ بعض

---

[1] جڑ [2] کبر کے علاج میں مددگار: مدد کرنے والا۔

[3] دین کی خصوصاً حضرت تھانوی کے مطبوعہ مواعظ یا ملفوظات کا

مسائل عورتوں کے اس قدر پیچیدہ ہیں کہ جواب دینا بھی ہر ایک کا کام نہیں۔ مثلاً پاکی اور ناپاکی کے مسائل کہ فقہ کی تمام بحثوں سے ادقی[1] بحث یہ مشہور ہے جو تمیز مشکل سے مشکل پیش آتی ہیں۔ مگر اس پر نگاہ رہے کہ نہ پڑھی نہ قضا ہوئی۔ کچھ عورتیں تو شرم کے مارے نہیں پوچھتیں اور بعض جو کسی قدر پڑھی لکھی ہیں وہ کسی اُردو کی کتاب میں دیکھ کر جو الٹا سیدھا سمجھ میں آیا کر گذرتی ہیں۔ حیرت کی بات ہے کہ اگر کوئی مرض شرم کا ہو جاتا ہے تو اس کے علاج میں یہ نہیں کرتیں کہ بلا سے جان جاتی رہے مگر شرم نہ جاتے۔ علاج کے لئے سوچ کر کوئی نہ کوئی تدبیر ایسی نکال لیتی ہیں کہ شرم بھی نہ جانے اور علاج بھی ہو جائے۔ بی بیو کسی مسئلہ کا تحقیق کر لینا تو آجکل کچھ بھی بات نہیں تین[2] پیسے میں چاہے جہاں سے جواب منگا لو۔ اگر خود نہ کہہ سکو اپنے خاوند کی معرفت پوچھوا لو یا اور کسی بی بی کے ہاتھ سے لکھوا کر دریافت کر لو اگر نہ خود لکھ سکو نہ شوہر موجود ہو۔ مگر بات یہ ہے کہ یہ سب کچھ جب ہو کہ جب دین کا خیال ہو۔ اس غفلت کو چھوڑو اور دین کو دنیا سے بھی زیادہ ضروری سمجھو دنیا ختم ہو جاوے گی اور آخرت ختم نہ ہوگی جو طریقہ میں نے بیان[3] کیا اس سے بہت کچھ فائدہ ہو سکتا ہے۔ گھر میں جب مسائل

---

[1] بہت باریک بہت تحقیق کے قابل [2] ایک جوابی لفافہ جس کی قیمت مل گئی [3] کتابیں پڑھنا سننا اور خط سے مسئلے معلوم کر لینا۔

کا تذکرہ ہوگا۔ بچوں کے کان میں پڑیں گے اور ساری عمر ان کو یاد رہیں گے۔ جو لوگ تمہارے تابع ہیں ان کی اصلاح ہوگی ان کی اصلاح بھی تمہارے ذمہ ضروری ہے۔ حدیث میں ہے کُلُّکُمْ رَاعٍ وَکُلُّکُمْ مَسْئُولٌ عَنْ رَعِیَّتِهٖ۔ یعنی ہر بڑے کو چھوٹے کے لئے حضورؐ نے محافظ فرمایا۔ کہ ہر ہر شخص کچھ نہ کچھ ذمہ دار ہے اور اس کی جوابدہی اس کے ذمہ ہے۔ اگر نوکرانی تمہاری نماز نہیں پڑھتی ہے تو وہ گنہگار ہے ہی مگر تم بھی اس کے ساتھ گنہگار ہو اور جواب دینا ہوگا کہ اسے نماز کیوں نہیں سکھائی تھی۔ بعض لوگوں نے اس کا جواب یہی اختیار کر لیا ہے کہ ہم نے بہتیری تاکید کی مگر وہ نماز پڑھتی ہی نہیں۔ کیوں بیبیو اگر کھانے میں وہ نمک کم و بیش کر دے تو تم کیا کرتی ہو۔ کیا ایک دو دفعہ سمجھا کر کہ ٹھیک جتنا نمک ٹھیک رکھا کر خاموش ہو رہتی ہو اور پھر نمک ویسا ہی کھا لیتی ہو جیسا اس نے ڈال دیا ہو۔ یہ تو کبھی بھی نہ کرو گی۔ چاہے نوکرانی رہے یا نہ رہے اسے سمجھاؤ گی پھر مارو پیٹو گی اگر کسی طرح نہ مانے گی تو نکال باہر کرو گی۔ بیبیو دین کا اتنا بھی خیال نہیں جتنا نمک کا جو نماز کے مقابلے میں بالکل غیر ضروری چیز ہے۔ دین کا خود بھی خیال کرو اور جن پر تمہارا قابو چل سکتا ہے ان کو بھی دیندار بناؤ۔ تمہاری کوشش سے جو

ﻟﮯ اولاد یا نوکر جھوٹے جو بچے اسکولوں میں پڑھتے ہیں ان کی فکر رکھنی ضروری ہے۔

کوئی دیندار بنے گا تمہیں بھی اسی کے برابر ثواب ملے گا۔ اس کا طریقہ وہی ہے جو میں نے بیان کیا۔ کہ جہاں دنیا کے دس کاموں کا وقت ہے۔ ایک دین کے کام کا بھی وقت نکال لو جو بی بی خود کتاب پڑھ سکیں وہ کتابوں کو دیکھکر اپنی اصلاح کریں اور جو خود نہ پڑھ سکیں کسی اپنے رشتہ دار سے پڑھوا کر سنیں۔ علماء سے وعظ اپنے مکان میں کہلوایا کریں جو واقعات پیش آیا کریں ان کی پوچھ پاچھ کیا کریں۔ علماء سے ان کی بی بی کی معرفت یا خط کے ذریعہ سے جواب منگا لیا کریں۔ اس سے دین میں ایسی بصیرت پیدا ہو جائیگی کہ رفتہ رفتہ ہر ہر عمل کی نسبت حکم معلوم ہو جائیگا۔ جب کسی چیز کی برائی معلوم ہو جاتی ہے تو کبھی نہ کبھی تو دل میں اس سے بچنے کا ارادہ پیدا ہوتا ہی ہے۔ اس صورت میں اگر ذرا سی بھی ہمت سے کام لو گے۔ تو دن دونی رات چوگنی ترقی ہو گی اور اسی میں شدہ شدہ تمام مفاسد کی جڑ یعنی کبر بھی قلب سے نکل جائے گا۔ اسی کو حق تعالےٰ نے اس آیت میں بیان فرمایا ہے اور تمام مفاسد کا علاج بتا دیا کہ اس ایک صفت کو حق تعالیٰ کے ساتھ مخصوص مان لو۔ یہ صفت کسی اور کے لئے نہیں ہو سکتی۔ وہ صفت کبریا ہے یہ ایک جڑ ہے جس کے ہزاروں شعبے ہیں۔ اجمالاً نہیں بلکہ تفصیلاً اس کے تمام شعبوں کو حق تعالیٰ کے ساتھ خاص کر دو اور میں یہ نہیں کہتا کہ سب کے سب متبحر[1] مولوی

---

[1] بڑے ماہر

بن جاؤ - بلکہ جہاں تک موقعہ ملے غفلت نہ کرو۔ جیسا روپیہ اور زیور
کے جمع کرنے کا سب کو شوق ہے یہ یقینی بات ہے کہ تمام بیبیاں اپنا
دل بھر کے زیور اور روپیہ نہیں پا سکتیں مگر غریب ہوں تو امیر ہے
تو ہر بی بی کو کوشش ضرور ہے کہ زیور اور روپیہ مل جاوے جتنی
کوشش سے ایک مقدار روپے کی مل سکتی ہے اتنی کوشش سے
بلکہ اس سے کم سے دین کی بہت بڑی مقدار مل سکتی ہے ہمت
نہ ہارو کچھ نہ کچھ ہو ہی رہیگا۔ تم ایک حصہ کماؤ گی تو خدا تعالیٰ کی
طرف سے دس حصے مرحمت ہوں گے۔

کبر پر وعید[1] اور توقف وقوع وعید سے دھوکہ نہ کھانا اور غافل نہ رہنا

آگے اس مضمون کو حق تعالیٰ نے وَهُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ[1] سے مؤکد[2]
کیا - ان لوگوں کے چونکانے کے لئے جو اس مضمون سے کسی طرح بچتے
ہی نہیں - اور اپنے عیب پر ان کی نظر پڑتی ہی نہیں جب ان کو
سمجھانے اور ان کی بھلائی سوجھانے سے اثر نہیں ہوتا تو فرماتے ہیں
میں عزیز یعنی غالب بھی ہوں - اگر تم کہنا نہ مانو گے تو میرے ہاتھ سے
کہیں جا نہیں سکتے۔ جیسی چاہوں گا سزا دوں گا - اور اگر کسی برے

---

[1] عذاب کی اطلاع اور عذاب کے واقع ہونے میں دیر ہونے سے [1] اور وہ
ذات سب پر غالب اور حکمت والی ہے [2] تاکید کی۔

عمل پر فوراً سزا نہ ملے تو مطمئن مت ہو جاؤ۔ میں حکیم بھی ہوں۔ کسی مصلحت سے مہلت دیتا ہوں۔ بعض لوگ رشوت لیتے ہیں اور کہتے ہیں ہمیں تو رشوت سزاوار ہے۔ صاحبو اس دھوکے میں نہ رہو۔ خدا کے غضب کو مت بھولو۔ اوّل تو دنیا ہی میں سزا ملے گی۔ اور اگر دنیا میں کسی حکمت اور مصلحت سے ٹل ہی گئی تو آخرت تو دار الجزاء[1] ہے ہی۔ وہاں کی سزائیں اور زیادہ سخت ہیں۔ وہاں کی سزا سے تو دنیا ہی کی سزا بھگت لینا اچھا ہے۔ وہاں کے احوال[2] و آفات کو سوچتے رہنا چاہیئے تصریح موجود ہے۔ وَلْتَنْظُرْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ لِغَدٍ۔ یعنی چاہیئے کہ خیال رکھے ہر شخص کہ کل کے لئے کیا سامان کیا ہے۔ اور اسی کے یاد دلانے کے لئے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں فَزُوْرُوا الْقُبُوْرَ وَ اَکْثِرُوْا ذِکْرَ ھَاذِمِ اللَّذَّاتِ یعنی قبروں پر جایا کرو اور لذتوں کو مٹانے والی چیز یعنی موت کو بہت یاد کیا کرو۔ اس سے عورتیں یہ فتویٰ نہ نکال لیں کہ قبرستان میں جانا جائز ہے عورتوں کے پردے سے نکلنے میں بہت سی خرابیاں ہیں[3]۔ مراد تذکرہ آخرت و قیامت ہے۔ جس طرح بھی ہو کسی معتبر کتاب میں قیامت کے حالات

---

[1] سزا و انعام کا گھر [2] ہولناکیوں اور مصیبتوں کو [3] اس لئے درمیانی عمر تک کی عورت کو جائز نہیں اور جو روئے چلائے یا کوئی ناجائز بات کرے اس کو بڑھاپے میں بھی جائز نہیں۔

پڑھیں یا سنیں۔) اور یہ موت اور قیامت کی اجمالی حالت کافی نہیں کہ کوئی موت موت کی تسبیح پڑھا کرے۔ بلکہ موت کو یاد رکھنا یہ ہے کہ جب کوئی کام کرے سوچ لے کہ بعد موت اس پر کوئی جواب دہی تو میرے ذمہ عائد نہ ہوگی۔ ہمیشہ اس کا خیال رکھو۔

حق تعالیٰ کا مطیعین[1] کے لئے دو بڑی دولتوں کا وعدہ فرمانا اور ان کے حصول کا طریقہ بتلانا

مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً وَ لَنَجْزِيَنَّهُمْ اَجْرَهُمْ بِاَحْسَنِ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ۔ ترجمہ۔ آیت شریفہ کا یہ ہے جو شخص عمل نیک کرے مرد یا عورت اور وہ مومن ہو پس بیشک ہم اس کو پاکیزہ زندگی عطا فرمادینگے۔ اور بیشک ہم ان کو ان کا اجر بدلہ بھی دیں گے۔ بسبب ان کے اچھے اعمال کے۔ اس آیت شریف میں حق تعالیٰ نے اپنے مطیع بندوں کے لئے اطاعت پر دو[2] بڑی دولت کے عطا فرمانے کا وعدہ فرمایا ہے۔ اور نیز اس کے حاصل کرنے کا طریقہ بھی تبلایا ہے۔

---

[1] فرمانبرداروں کے لئے۔ [2] دنیا میں پاکیزہ زندگی بے فکری کی اور آخرت میں بہت بڑا ثواب۔

دنیا میں کوئی شخص طلب سے خالی نہیں اور باوجود تعدد[1] طرق کے مطلوب سب کا شے واحد ہے

اوّل ایک مضمون بطور مقدمہ سمجھنا چاہیئے۔ اس کے بعد آیہ کریمہ کا مضمون بخوبی ذہن نشین ہو جاویگا۔ دنیا میں جس قدر عقلاء ہیں کہ جن کے افعال کی غایت[2] ہوتی ہے ان میں ہر ایک شخص ایک شے کا طالب ہے۔ کوئی مال کا طالب کوئی جاہ کا کوئی صحت کا کسی کو درویشی مطلوب ہے۔ کوئی علم کا دیوانہ ہے کسی کو تجارت میں لطف آ رہا ہے۔ کوئی اولاد کی دھن میں ہے۔ کوئی مکانات کی تعمیر کا شوق رکھتا ہے۔ کسی کو باغ لگانے کی حرص ہے۔ غرض کوئی ایسا نہیں جو طلب سے خالی ہو بعضے ان ہی میں خدا کے بھی طالب ہیں۔ ظاہراً معلوم ہوتا ہے۔ کہ یہ سب اشیاء[3] متعددہ مختلفہ کے طالب ہیں لیکن اگر غور کیا جائے اور نظر کو عمیق[4] کر کے دیکھا جائے تو فی الواقع ہر شخص کا مطلوب صرف ایک شے ہے۔ صرف اختلاف اس کے تعیین طریق میں ہے۔ کسی نے سمجھا کہ وہ شے تجارت سے حاصل

---

۱ باوجود طریقے کئی ہونے کے مقصود سب کا ایک ہے ۲ وہ غرض جس کے لئے کام کیا جاتا ہے ۳ کئی اور الگ الگ چیزوں کے ۴ گہرا

ہو گی - وہ تجارت میں مشغول ہو گیا۔ کسی نے خیال کیا کہ علم سے اس کی تحصیل ہو گی - وہ علم کا طالب بن گیا۔ کسی نے اولاد میں اس مطلوب کو گمان کیا - وہ اولاد کا شیفتہ ہو گیا۔ آپ کو تعجب ہو گا کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ ہم تو دیکھتے ہیں کہ ہر شخص کا مقصود جدا ہے - اور تم کہتے ہو کہ سب کا ایک ہی مقصد ہے۔ اختلاف طرق میں ہے - اس لئے اس کو ایک مثال سے سمجھنا چاہیئے۔

سب کا مطلوب شے واحد ہونے کی مثالیں اور اس شے واحد کی تعیین

ایک شخص کے پاس دس سائل آئے - ایک نے روٹی طلب کی - دوسرے نے چاول پختہ مانگے - تیسرے نے پیسہ مانگا - چوتھے نے روپیہ - پانچویں نے غلہ - چھٹے نے آٹا - ساتویں نے کوڑیاں - آٹھویں نے چنے بھنے ہوتے - نویں نے کچے چاول - دسویں نے حلوا - پس اس مثال میں بظاہر مطلوب ہر ایک کا جدا ہے - لیکن درحقیقت مقصود واحد ہے طرق مختلف ہیں مقصود پیٹ بھرنا ہے - کسی نے سمجھا کہ پکانے کا کون قصہ کرے اس نے پکی

لے ایک چیز

ہوئی روٹی مانگی۔ کسی نے خیال کیا کہ کچی جنس ملیگی تو اپنی مرضی کے موافق پکا کر کھائیں گے۔ کسی نے یوں ہوس کی کہ روپیہ پیسہ ملیگا تو جنس بھی اپنی خواہش کے موافق خرید کر پکائیں گے۔ اس مثال سے آپ کو مختلف کا جمع کرنا آسان ہو گیا ہو گا۔ اسی طرح ان لوگوں کے مقصود کو دیکھنا چاہیئے کہ ان کا مقصود کیا ہے تو غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ سب کی شے واحد مقصود ہے اور وہ لذت وراحت ہے طرق کا اختلاف ہے کسی نے سمجھا کہ روپے کے حاصل ہونے میں مزہ ہے وہ اس کا طالب ہو گیا کسی نے سمجھا کہ جاہ میں مزہ ہے کسی نے اولاد میں لطف دیکھا کسی نے تجارت میں کسی کی سمجھ میں آیا کہ دنیا کے مزے تو سب فانی ہیں مزہ اصلی تو آخرت میں ہے الی غیر[1] ذالک من الطرق مگر حاصل سب کا ایک ہے کہ قلب کو چین ہو راحت ہو مسرت ہو انبساط ہو دوسری مثال اور لیجئے کہ تاجر مختلف اشیاء کی تجارت کرتے ہیں کوئی بساطی ہے کوئی بزاز ہے کوئی بقال ہے اور کوئی لکھنؤ میں تجارت کرتا ہے کوئی کلکتے میں کوئی بمبئی میں تو یہ سب ایک شے کے طالب ہیں وہ شے کیا ہے نفع مگر اس کے طرق مختلف ہیں کسی نے سمجھا کہ بزازی کی دکان میں نفع ہے کسی نے خیال کیا کہ بساط خانہ میں بہت نفع ہے۔ اس

---

[1] ان کے سوا اور طریقوں تک۔

نے اسی کو اختیار کر لیا کسی نے سمجھا کہ لکھنؤ میں چکن اچھی ہوتی ہے۔ وہ
وہاں جا پہنچا کسی نے یہ خیال کیا کہ کلکتے میں تجارت سے بہت نفع ہوگا۔
وہ وہاں پہنچ گیا۔ چنانچہ اگر کسی تاجر سے کہا جاوے۔ کہ تم کو جو نفع
کلکتے میں ملیگا وہ ہی نفع تم کو ہم یہاں دیتے ہیں وہ ہرگز۔ کلکتہ نہ جاویگا
کیونکہ مقصد اس کو حاصل ہو گیا غرض یہ امر بالکل واضح ہو گیا ہوگا کہ لوگ بظاہر اشیاء مختلفہ
کے طالب ہیں مگر حقیقتاً مطلوب ایک ہے۔

لذت و راحت کے حاصل کرنے میں راہوں کا اختلاف

اور یہ بھی واضح ہو گیا کہ اس مطلوب یعنی لذت و راحت کے حاصل
کرنے میں راہیں مختلف ہیں۔ کسی کی راستے تجارت کی ہے۔ کسی کی
زراعت کی ہے اور گاہے آپس میں ایک دوسرے کو خاطی[1] بتاتے
ہیں۔ چنانچہ جو تجارت کرتا ہے۔ وہ احیاناً[2] زراعت کرنے والے کو
خطا پر بتاتا ہے۔ اور زراعت کرنے والا تاجر کو خاطی بتا رہا ہے۔
اور ان ہی طالبین میں بچے بھی ہیں وہ بھی اس مطلوب یعنی لذت
و راحت . . . . . . کے حاصل کرنے میں مختلف طریقے اختیار کرتے
ہیں۔ لڑکیاں گڑیاں کھیلتی ہیں۔ لڑکے کوئی گیند کھیلتا ہے کوئی کنکوا
اڑاتا ہے۔ کوئی ریتے کا مکان بناتا ہے ان کے مکان کو ہم بیہودہ
شغل سمجھتے ہیں اور ہم جو قرض لے لیکر مکان بناتے ہیں اس کو بیہودہ

---

[1] خطا کار [2] کبھی کبھی۔

نہیں سمجھتے وجہ یہ ہے کہ اپنے مکان کو پائدار سمجھتے ہیں اور معتدبہ راحت کا آلہ۔

لذّت و راحت کے درجے اور افراد

پس معلوم ہوا کہ اس مقصود کے باوجود اس کے کہ واحد ہے درجات مختلف ہیں ایک معتبر اور قابل شمار اور دوسرے غیر معتبر اور ناقابل شمار اور مجموعہ تقریر سے دو امر معلوم ہوتے ایک یہ کہ مقصود کے طرق میں اختلاف ہے دوسرے یہ کہ اس مقصود یعنی لذت و راحت کے افراد بعض قابل شمار ہیں اور بعض نہیں ہیں۔

راحت کا کون فرد معتبر ہے اور یہ کہ اس کا فیصلہ کرنے والا کون ہے

اب یہاں دو امر تنقیح طلب ہیں کہ مقصود یعنی لذت و راحت کا کون فرد حقیقۃً معتبر ہے اور دوسرے یہ کہ اس کا طریقہ تحصیل کا کیا ہے پس اس کا فیصلہ ایسا شخص کر سکتا ہے کہ جو حقائق[1] اشیاء اور آثار اشیاء سے من کل الوجوہ واقف ہو اور نیز وہ خود غرض

---

[1] تمام چیزوں کی حقیقتوں اور ان کے اثروں سے پوری طرح واقف ہو۔

نہ ہو کیونکہ کسی کا علم اگر ناقص ہوگا یا کوئی خود غرض ہوگا تو وہ ہرگز ان دو امروں کے متعلق فیصلہ نہیں کر سکتا تو اب دیکھنا چاہیئے کہ جس میں یہ دونوں صفتیں علی وجہ الکمال موجود ہوں وہ کون ہے تو ہم دیکھتے ہیں کہ مخلوق میں یہ دونوں صفتیں ناقص ہیں جو عالم نظر آتا ہے اس سے زیادہ اور عالم موجود ہے وَفَوْقَ كُلِّ ذِي عِلْمٍ عَلِيمٌ اور استغنا اور بے غرضی کی صفت میں بھی مخلوق ناقص ہے جس کو دیکھیئے وہ خود غرض ہے۔ اگر کہا جاوے کہ بعضے ہمدردان قوم ایسے ہیں کہ دوسروں کو بلا غرض نفع پہنچاتے رہیں تو میں کہتا ہوں کہ ان میں بھی دو قسم کے لوگ ہیں بعضے ثواب کے طالب ہیں اور بعضوں کی ایسی طبیعت ہوتی ہے کہ دوسروں کو نفع پہنچا کر ان کے دل کو ٹھنڈک اور راحت پہنچتی ہے یہ راحت و قرت قلب بھی ایک غرض ہے۔ اسی طرح ماں باپ اور جملہ اقرباء جو کچھ کرتے ہیں سب اپنی تشفی قلب کیواسطے کرتے ہیں۔ اگر کوئی کہے کہ بعضے لوگ ایسے طور سے دیتے ہیں کہ نہ دینے والے کو معلوم ہوتا ہے کہ یہ لینے والا کون ہے اور نہ لینے والے کو دینے والے کا حال معلوم ہوتا ہے اس میں کونسی غرض ہے۔ جواب یہ ہے کہ یا تو اس کو ثواب مطلوب ہوگا اور اگر ثواب مطلوب نہ ہو تو نفس عطا سے اس کے دل کو . . . .

۱؎ کون معتبر ہے اور کیا طریقہ ہے ۲؎ پورا واقف ہونا خود غرض نہ ہونا یہ دونوں کامل طریقہ پر ہوں ۳؎ اور ہر جاننے والے کے اوپر ایک جاننے والا ہے ۴؎ دل کو راحت دینا اور ٹھنڈک پہنچانا ۵؎ دل کو تشفی دینا۔

حظ ہوگا یہ بھی ایک غرض مطلوب ہے بالجملہ مخلوق میں ایسا کوئی نہیں جو علم اور استغناء کی صفت علی وجہ الکمال سے موصوف ہو ایسی ذاتِ پاک تو حق تعالیٰ کی ہی ہے علم کی تو ان کے وہ شان ہے کہ عالم الغیب[1] والشہادۃ ہیں۔ اور بے نیازی ایسی ہے جیسا مولانا فرماتے ہیں ؎

من[2] نکردم خلق تا سودے کنم
بلکہ تا بر بندگان جودے کنم

اور خدا تعالیٰ کو اپنا نفع مقصود ہو نہیں سکتا اس لئے کہ نفع جو ہم کو مقصود ہوتا ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ ہمارے اندر ایک نقصان[3] تھا اس نفع کے حاصل ہونے سے اس کی تکمیل ہوگئی اور حق تعالیٰ کی ذات خود کامل اکمل ہے اگر حق تعالیٰ کو بھی اپنا نفع مقصود ہو تو نعوذ باللہ ذاتِ باری میں نقصان اور استکمال بالغیر[4] لازم آتا ہے بہرحال نہ خدا تعالیٰ کی برابر کسی کا علم ہے اور نہ کوئی ایسا بے غرض ہے لہٰذا ان دونوں مسئلوں کا فیصلہ حق تعالیٰ سے ہی کرانا چاہیئے۔

راحت کے فردِ معتبر کی تعیین اور اُس کا طریق تحصیل

چنانچہ کلام اللہ کی ان آیات میں اِن دونوں امروں کا فیصلہ کر دیا کہ

---

[1] ہر حاضر و غائب کے جاننے والے۔ [2] میں نے مخلوق کو اس واسطے پیدا نہیں کیا کہ میں کوئی فائدہ اٹھاؤں۔ بلکہ اس لئے پیدا کیا ہے کہ خود مخلوق پر سخاوت کروں۔ [3] پیسے ترجھے وہ رہ گئے مزہ نہ تھا وہ مل گیا راحت نہ تھی وہ مل گئی۔ [4] غیر کی مدد سے کامل ہونا بعد بغیر اسکے ناقص رہنا اور یہ محال ہے۔

بطور حاصل ارشاد ہے کہ اے بندو تم جو اپنے مقصود یعنی راحت کو مختلف چیزوں میں ڈھونڈتے ہو کوئی مال میں راحت و لذت کا طالب ہے کوئی بیوی بچوں میں اپنے مطلوب کو تلاش کرتا ہے کوئی جاہ میں کوئی مکانات میں مشغول ہے ہم تم کو راحت حقیقی کے تحصیل کا طریقہ بتاتے ہیں وہ یہ ہے مَنْ عَمِلَ صَالِحًا الخ مطلب یہ ہے کہ جو شخص نیک کام کرتا ہے اور اس پر شرط یہ ہے کہ وہ مومن ہو یعنی عقیدہ اس کا درست ہو ہم اس کو مزہ دار زندگی عطا فرماوینگے اور ہم ان کو جزا دیں گے بسبب احسن ان اعمال کے جو کیا کرتے تھے اس ترجمہ سے دونوں امر تنقیح طلب جو اوپر مذکور ہوتے معلوم ہو گئے یعنی یہ بھی معلوم ہو گیا کہ مقصود معتبر کیا ہے اور اس کا طریق تحصیل کیا ہے مقصود دو چیزیں ہیں حیات طیبہ اور اجر اور اس کا طریق بھی دو چیزوں کا حاصل کرنا ہے عمل صالح اور عقائد صحیحہ۔

لذّت و مسرت کی تکمیل اجرِ اُخروی سے ہوگی

اور حیات طیبہ اور اجر کا حاصل ایک ہی ہے یعنی لذّت اور مسرت کیونکہ حیات طیبہ جس کو فرمایا ہے۔ اس کی تکمیل اجر اخروی سے ہوگی اس لئے کہ جس حیات کے بعد اجر نہ ہو وہ حیات طیبہ نہیں اس لئے جب اس کو معلوم ہے کہ یہ آرام و راحت دنیا ہی میں ہے اور بعد اس حیات دنیوی کے پھر تکالیف کا سامنا ہے تو وہ حیات بھی مزیدار نہ ہوگی۔ کیونکہ خوف آئندہ مسرت موجودہ کا تباہ کن ہے مثلاً کوئی شخص نہایت مزادار

شاندار اور پُر لطف کمرے میں ہے اور کھانے پینے کی اشیاء سب موجود ہیں اور آرام کے سب سامان مہیا ہیں لیکن اس پر ایک مقدمہ فوجداری کا قائم ہے اور اس کو معلوم ہے کہ فلاں دن میرے لئے پھانسی کا حکم ہوگا۔ تو اس کو یہ زندگی اور یہ ظاہری تمتعؔ وبال جان ہوگا۔ اور ہر شے اس کو خار نظر آتے گی۔ اسی طرح دنیا کا حال ہے کہ یہاں خواہ کتنا ہی آرام ہو جب یہ معلوم ہو کہ یہ فانی ہے تو کیا لطف ہے۔

دنیا خواہ ملے یا نہ ملے ہر حالت میں پریشان کرنے والی ہے

اور دنیا تو خواہ ملے یا نہ ملے ہر صورت میں پریشان کرنے والی ہے ؎

إِذَا أَدْبَرَتْ كَانَتْ عَلَى الْمَرْءِ حَسْرَةً
وَإِنْ أَقْبَلَتْ كَانَتْ كَثِيرًا هُمُومُهَا

اگر نہ ملے نہ ملنے کا افسوس اور حسرت رہتی ہے اور اگر ملے تو طرح طرح کے افکار اور ہموم ہوتے ہیں۔

حکایت - ایک شخص سے کسی نے پوچھا کہ تمہارے یہاں خیریت ہے وہ سخت ناراض ہوئے اور کہنے لگے کہ خیریت ہوگی تمہارے یہاں۔ ہمارے یہاں تو لفضلہ تعالیٰ کچھ بچے چھوٹے بڑے موجود ہیں آج فلاں بیمار ہے۔ کل اس کو بخار ہے۔ کوئی مرتا ہے۔ کوئی جیتا ہے کوئی

ؔ لذت و مزہ۔

جیتا ہے جس کے یہاں کوئی نہ ہو اس کے یہاں خیریت ہوتی ہے۔ غرض دنیا میں پریشانی ہی پریشانی ہے۔ اگر حس صحیح ہے تو واقعی سخت مصیبت کی جگہ ہے۔ کسی طرح چین نہیں۔ ایک مقصود اگر حاصل ہوتا ہے تو دوسرے کی فکر ہوتی ہے۔ مثلاً شادی بھی ہو گئی۔ مال و دولت سب کچھ ہے۔ اولاد نہیں ہے۔ تو اولاد کا ہر وقت فکر ہے۔ کہ اولاد ہو۔ یہی دھن ہے یہی فکر ہے۔ شب و روز اسی میں گذرتا ہے۔ کبھی خیال ہوتا ہے کہ یہ سب جائداد وقف کردوں۔ کبھی خیال ہوتا ہے کہ کسی کو متبنیٰ[1] بنا دیں خدا خدا کر کے اولاد ہو گئی اب شب و روز اسی دھن میں ہیں کہ کسی طرح یہ جلدی پرورش ہو جاتے تو اس کے ختنے دھوم دھام سے ہوں اور اس کی شادی ہو۔ اللہ اللہ کر کے اولاد سیانی ہو گئی۔ اور شادی بھی ہو گئی اب رات دن یہی فکر ہے کہ اولاد کے اولاد نہیں ہے اسی غم میں گھلتے ہیں غرض ساری عمر عزیز اسی میں صرف ہو جاتی ہے اور کوئی وقت اللہ کی طرف مشغول ہونے کا میسر نہیں ہوتا ہے

وَمَا قَضٰى اَحَدٌ مِّنْهَا لُبَانَتَهٗ[2]
لَا مُنْتَهٰى اَرَبٍ اِلَّا اِلٰى اَرَبٍ

بخلاف اس شخص کے اس کے پاس کچھ نہ ہو وہ پھر بہ نسبت اس شخص کے راحت میں ہے اس کا تو یہ حال ہے

---

[1] بنایا ہوا بیٹا [2] اور دنیا سے کسی نے اپنی حاجت پوری نہیں کی باقی ہر ایک حاجت دوسری حاجت پر ہی جا پہنچتی ہے۔

لنگی ف۱ زیر و لنگی بالا نے غم دزد و نے غم کالا

حکایت۔ ایک رئیس تھے ان کے ایک بچہ تھا اتفاقاً وہ بیمار ہو گیا
تمام جائداد و سامان ان کو تلخ معلوم ہوتا تھا۔ یہ حالت دنیا کی ہے
ہیچ ہے۔ ع ومن ابنت کانت کثیراً ھمومھا۔

حاصل تعیین مقصود و تعیین طرق

حاصل یہ ہے کہ اگر تمام نعمتیں میسر بھی ہوں اور آخرت میں اس کے لئے کچھ نہ ہو تو سب ہیچ ہے۔ اس لئے حیات طیبہ بھی اسی وقت ہوگی جبکہ اجر بھی ہو۔ اسی واسطے فَلَنُحْيِيَنَّهُ ف۳ الخ کے ساتھ وَلَنَجْزِيَنَّهُمْ ف۴ الخ فرمایا حاصل دونوں کا حیات کاملہ ہوتی خلاصہ یہ ہوا کہ گویا حق تعالیٰ بطور حاصل ارشاد فرما رہے ہیں کہ اے دنیا میں بھٹکنے والو تم میں سے ہر ایک جو مقصود معتدبہ ف۵ کا طالب ہے ہم بتاتے ہیں کہ مقصود معتدبہ حیات کاملہ ہے اور اس کے طرق ہیں جو تم غلطیاں کر رہے ہو تو اس کے طرق کو بھی متعین کرتے ہیں وہ اطاعت اللہ و رسول کی ہے گویا تمام آیت کا حاصل یہ ہوا کہ اطاعت کا نتیجہ و ثمرہ لطف دائم ہے۔ یہ ایک دعویٰ ہے اور ایسا دعویٰ ہے کہ اگر ہم اس کا صرف مشاہدہ بھی نہ کرتے تو بھی ہم کو بلا تامل

ف۱ ایک چھوٹی سی لنگی (تہ بند) نیچے ایک اوپر نہ چہرہ کا غم نہ سامان کا ف۲ اور جب دنیا آ دھمکتی ہے تو اس کے فکر و افکار ہی بہت ہو جاتے ہیں ف۳ ضرور ہم اسکو پاکیزہ زندگی دینگے ف۴ اور اس کو ثواب دینگے ف۵ شمار کے قابل

تصدیق کرنا چاہیئے۔ اس لئے کہ یہ ایسی ذات کا فیصلہ ہے کہ جس کا علم کامل ہے اور بیغرض اور مستغنی[1] بالذات ہے۔ چہ جائیکہ اس کا صدق ہم کو کالشمس فی نصف النہار[2] نظر بھی آرہا ہے اور مشاہدہ روز بروز اس کو پختہ کرتا جاتا ہے۔ جیساکہ ہم اس کو آئیندہ چلکر واضح بیان کریں گے۔

آیت میں حیات طیبہ سے کیا مراد ہے

اس وقت فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً[3] کی تفسیر کے متعلق کچھ عرض کیا جاتا ہے کہ اس میں اختلاف ہوا ہے کہ حیاتِ طیبہ سے کیا مراد ہے۔ دنیا کی حیات یا برزخ[4] کی۔ کیونکہ عالم تین ہیں۔ عالمِ آخرت۔ عالم دنیا۔ عالم برزخ اور آخرت کو گو مشاہدہ نہیں کیا مگر اہلِ ملت[5] میں بلکہ حکماء فلاسفہ قدماء میں بھی اس کے منکرین کم ہیں حتیٰ کہ سوائے اہل اسلام کے اور لوگ بھی اس کے قائل ہیں۔ اس لئے اس کا کوئی نمونہ دنیا میں بتلانے کی ضرورت نہیں ہے۔

عالمِ برزخ کی تحقیق اور اس کے متعلق شبہات کا دفع مع مثال

بخلاف برزخ کے کہ اس کے منکرین بہت ہیں حتیٰ کہ اہل اسلام میں

---

[1] ذات ہی بے نیاز ہے [2] دوپہر کے سورج کی طرح [3] تو ہم اس کو اس کو دیں گے زندگی پاکیزہ [4] دنیا و آخرت کے درمیان کا عالم۔

معتزلہ[1] نے اس کا انکار کیا ہے اور حدیثوں میں جو آیا ہے کہ جب آدمی مرتا ہے قبر میں دو فرشتے منکر نکیر آتے ہیں ان کا معاملہ مختلف ہوتا ہے اگر بندہ مومن ہوتا ہے اس کے پاس نہایت اچھی صورت میں آتے ہیں اور اس سے سوال کرتے ہیں وہ پسندیدہ جواب دیتا ہے پھر اس کے لئے قبر کشادہ ہو جاتی ہے حتیٰ کہ جہاں تک اس کی نگاہ جاتی ہے اس کو ایک وسعت نظر آتی ہے۔ اور اس کو کہا جاتا ہے۔ نَمْ کَنَوْمَۃِ الْعَرُوْسِ[2] اور اگر وہ کافر ہوتا ہے اس کے پاس نہایت ہولناک صورت میں آتے ہیں اور جو سوال اس سے کیا جاتا ہے۔ وہ جواب میں لَا اَدْرِیْ یعنی میں نہیں جانتا۔ کہتا ہے۔ اس کے لئے قبر تنگ ہو جاتی ہے۔ اور اس کو اس قدر دباتی ہے کہ اس کی پسلیاں ادھر کی ادھر اور ادھر کی ادھر ہو جاتی ہیں گرزوں سے اس کو مارتے ہیں اور سانپ اور بچھو اس کو ڈستے ہیں غرض انواع انواع کے عذاب میں مبتلا رہتا ہے۔ معتزلہ اور ہمارے نو تعلیم یافتہ ان احادیث کا بالکل انکار کرتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ ہم تو قبر کو کھود کر دیکھتے ہیں نہ اس میں فرشتہ ہے نہ گرز ہے نہ وسعت ہے نہ سانپ ہیں نہ بچھو ہیں اور کہتے ہیں کہ اگر ایک آدمی کو بھیڑیا کھا لے یا دو شیر کھالیویں تو وہاں

---

[1] وہ باطل فرقہ جو نقل پر عقل کو ترجیح دیتا تھا جیسے آج کل بھی بعض لوگ ایسے بن رہے ہیں [2] بس سو جاؤ دلہن کی طرح کا سونا۔

کس طرح یہ سوال و جواب ہوں گے اور کیسے وہاں وسعت ہو گی اور وہاں سانپ بچھو کہاں ہیں۔ ہم تو صریحاً دیکھتے ہیں کہ بھیڑیئے اور شیر کے پیٹ میں نہ سانپ ہیں نہ بچھو ہیں۔ نہ گڑھا ہیں۔ بات یہ ہے سے

جنگ ہفتاد و دو ملت ہمہ را عذر بنہ[1]

چوں ندیدند حقیقت رہِ افسانہ زدند

وجہ یہ کہ خود علم نہیں اور علماء کے اتباع سے عار آتی ہے۔ حالانکہ سلامتی کی بات یہ ہے کہ اپنے سے زیادہ جاننے والے کا دامن پکڑا جاتا ہے۔ کاش اگر ہم پوچھ لیتے تو پتہ لگ جاتا ان تمام شبہات کا منشا یہ ہے کہ قبر نام اس گڑھے کا رکھ لیا ہے حالانکہ قبر سے مراد احادیث میں یہ گڑھا نہیں ہے بلکہ مراد قبر سے عالمِ برزخ ہے۔ اور عالم برزخ اس گڑھے کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ برزخ اس حالت کا نام ہے جو آخرت اور دنیا کے درمیان کی حالت ہے اگر قبر میں دفن کر دیا وہی اس کا برزخ ہے اس سے وہاں ہی سوال جواب و عذاب و ثواب ہو گا۔ اور اگر بھیڑیئے و شیر نے کھالیا اس کے لئے وہی برزخ ہے۔ اور اگر جلا دیا تو جہاں جہاں اس کے اجزاء ہیں اس سے وہاں ہی یہ سب واقعات پیش آئیں گے۔ لیکن چونکہ شریعت میں دفن کرنے کا حکم ہے۔ اس لئے عالمِ برزخ کو قبر سے تعبیر فرمایا ہے حاصل یہ کہ قبر کے متعلق جس قدر شبہات ہیں وہ سب اس پر مبنی ہیں کہ قبر کی

---

[1] بہتّر فرقوں کی جنگ کو معذوری سمجھو جب لوگ حقیقت کو نہ پا سکے تو انہوں نے غلط خیالات بنا لئے۔

حقیقت نہیں سمجھتے[1] اسی استبعاد کی وجہ سے چونکہ اس کا بکثرت انکار کیا جاتا ہے اس لئے اللہ تعالیٰ نے اسی حکمت سے اس کا ایک نمونہ دنیا میں پیدا فرمایا ہے کیا ہے۔ خواب یعنی سونا۔ سوتے ہوتے آدمی دیکھتا ہے کہ سانپ نے کاٹ لیا ہے دریا میں ڈوب گیا ہے کسی نے لٹھ مارا ہے اور اس کو الم محسوس ہو رہا ہے حالانکہ وہ نرم نرم بستر پر لیٹا ہوا ہے۔ اگر گرمی ہے تو پنکھے ہو رہے ہیں۔ خس کی ٹٹیاں لگ رہی ہیں یا دیکھتا ہے کہ وہ مسند پر سریر آرائے سلطنت ہو رہا ہے اور باندیاں اور غلام صف بصف دست بستہ کھڑے ہیں اور طرح طرح کے آرام راحت کے سامان ہیں۔ حالانکہ وہ زمین پر لیٹا ہوا ہے نہ تکیہ ہے نہ بستر ہے نہ کوئی پرسان ہے بیمار ہیں سخت درد میں مبتلا ہیں یہ سونے والے اگر ان حکایات کو بیان کرتے ہیں تو ان سے کوئی دلیل عقلی کا ان واقعات پر مطالبہ نہیں کرتا۔ بلکہ اگر کوئی دلیل عقلی پوچھے بھی تو اس کو احمق بنایا جاتا ہے اور اس کو وہ سونے والا کہتا ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ تم کبھی سوتے نہیں خدا کرے تم سوؤ تو تم کو یہ سب باتیں واضح ہو جائیں گی پس ہمارا بھی یہی جواب ہے کہ جواب مرو گے معلوم ہو جائیگا بقول شخصے[2] ؎

پرسید یکے کہ عاشقی چیست گفتم کہ چو ما شوی بدانی

---

[1] دور کی بات سمجھنے سے [2] کسی شخص نے پوچھا کہ عاشقی کیا چیز ہوتی ہے میں نے کہا ہم جیسے ہو جاؤ گے تو جان لوگے۔

غرضیکہ خواب برزخ کا پورا نمونہ ہے کہ جیسے ہم سونیوالے کو دیکھتے ہیں کہ وہ آرام سے لیٹا ہے حالانکہ وہ سخت تکلیف کا مشاہدہ کر رہا ہے۔ یا یہ کہ وہ تکلیف میں ہے اور خواب میں مزے لوٹ رہا ہے۔ اسی طرح مردے کا حال ہے کہ اگر قبر کو کھود کر دیکھا جاوے تو جس طرح دفن کر آتے تھے اسی طرح ہے لیکن وہاں کے واقعات اس پر سب گزر رہے ہیں۔ لیکن اس تقریر سے کوئی یہ نہ سمجھے کہ بس معلوم ہو گیا کہ برزخ کے واقعات خواب جیسے ہیں جس طرح خواب کی کوئی اصل نہیں اسی طرح فی الواقع یہ بھی کوئی شے نہیں۔ مردے کو یہ واقعات محض متخیل[1] ہوتے ہیں۔ اس لئے کہ ہم نے یہ بیان کیا ہے کہ خواب نمونہ ہے یعنی خواب مشابہ برزخ کے ہے۔ مماثل[2] نہیں کہا۔ عالم برزخ کے واقعات حقیقت رکھتے ہیں تحقیق اس کی یہ ہے کہ یہ تو ظاہر ہے کہ روح اس جسم سے تو مفارق ہو جاتی ہے اس لئے اس جسم کو تو عذاب ثواب تکلیف آرام کچھ نہیں ہوتا ہاں اس جسم سے روح کو تعلق قدیم کی وجہ سے ایک تعلق خاص ہوتا ہے۔ جیسا کہ آدمی کو اپنے گھر سے یا کپڑے سے کہ وہ گھر اور کپڑا اس سے مفارق ہے لیکن اس سے تعلق ہے اور اسی تعلق کی بناء پر اگر مردے کے جسم کو کوئی مارے تو روح کو ایک قسم کی کوفت ہوتی ہے۔ پس اس جسم عنصری کے ساتھ اس سے زیادہ کوئی تعلق نہیں رہتا مگر حدیثوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اس عذاب و ثواب کا

---

[1] خیال میں آنے والے [2] اس کی قسم کا ہو کر اس جیسا۔

موردِ جسم ہی ہوتا ہے۔ پس معلوم ہوا کہ برزخی ثواب و عقاب اور تمام برزخی واقعات اور سوال و جواب کیلئے روح کو ایک[1] اور جسم عطا ہوتا ہے اور اس کو جسم مثالی کہتے ہیں۔ یہ تکلیف و راحت سب اس کے ساتھ پیش آتے ہیں اور جسم مثالی کی حقیقت یہ ہے کہ سوائے اس عالم ظاہر کے ایک اور عالم ہے کہ صوفیہ کو اس کا انکشاف ہے اور نیز اشارات کتاب و سنت سے بھی اس کا وجود معلوم ہوتا ہے اس عالم میں تمام اشیاء اور تمام اعمال و افعال کی صورتیں ہیں جو خواب میں جو کچھ آدمی دیکھتا ہے وہ بھی اسی عالم کی صورتیں دیکھتا ہے مثلاً خواب میں دیکھتا ہے کہ میں کلکتے گیا ہوں اور وہاں کوٹھیاں بنگلے اور بازاروں کی سیر کر رہا ہوں تو یہ سب صورتیں چونکہ عالم مثال میں موجود ہیں اس لئے وہ خواب میں نظر آتی ہیں۔ میں نے ایک رسالہ مسمی الفتوح فی احکام الروح لکھا ہے اس میں روح کے متعلق مفصل بحث لکھی ہے اس کے دیکھنے سے انشاء اللہ تعالیٰ سب شبہات جاتے رہیں گے۔

بہرحال اس تقریر سے مقصود یہ ہے کہ ایک عالم اور ہے جس کا نام برزخ ہے۔ کل تین عالم ہوئے۔ عالم[۱] دنیا۔ عالم برزخ[۲]۔ عالم آخرہ[۳]۔ اس میں اختلاف ہے کہ حیاتِ طیبہ سے مراد کونسی حیات ہے۔ حیات برزخیہ یا حیات دنیویہ میں کہتا ہوں کہ دونوں مراد ہوں اور لَنَجْزِيَنَّهُمْ[2] کو آخرت کے ساتھ خاص

له وہ جسم مثالی اس جسم خاکی میں خاص طریقہ سے مخلوط ہوتا ہے اس کا کسی طرح کا بھی کوئی جزء خواہ کسی شکل میں اور کسی مقام میں ہو کسی جانور کے گوشت پوست میں یا راکھ میں یا ہوا یا پانی مٹی میں ہو۔ اسی سے مخلوط ہوگا۔ عذاب دونوں کو یا صرف ایک کو ہوتا ہے اذیت روح کو ہوتی ہے۔

ٹ۲ اور ضرور ہم ان کو جزا دیں گے۔

کیا جاوے۔ اس تقدیر پر حاصل آیت کا یہ ہوگا کہ جو شخص عمل صالح کرے اور عقاید بھی اس کے صحیح ہوں اس کو ہم دنیا میں اور بعد مرنے کے برزخ میں مزید اور زندگی عطا فرماویں گے۔ اور آخرۃ میں بعد قیامت کے ان کے نیک اعمال کی وجہ سے اجر کی جزا دیں گے۔ اور ایک توجیہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ حیات طیبہ سے مراد حیات دنیویہ ہو اور برزخ اور آخرت لنجزینّھم میں داخل ہو۔ کیونکہ برزخ میں جو کچھ ہوگا وہ بھی جزا ہوگا۔

جو لوگ خدا تعالیٰ کے مطیع ہیں۔ اُن کے لئے حیاتِ طیبہ دلائل اور مشاہدہ سے ثابت ہے

خلاصہ یہ ہے کہ دو چیزوں کا وعدہ ہے اول حیات طیبہ دوسرا اجر ہو مکمل[1] ہے حیات طیبہ کا ان میں سے ایک کو یعنی حیات طیبہ کو تو ہم دلائل سے ثابت کر سکتے ہیں بلکہ مشاہدہ کرا سکتے ہیں دلیل تو یہ ہے کہ قاعدہ عقلی ہے کہ تجربہ سے جب ایک شخص کا صدق ثابت ہو جاتے تو اس کو ہر امر میں صادق مانا جاتیگا۔ ہر امر پر دلیل کا مطالبہ اس سے نہ کیا جائیگا جب کہ حق تعالیٰ کے اخبار[2] کا صدہا ہزارہا جگہ صدق ہم نے

---

[1] تکمیل کرنے والا پورا کر دینے والا [2] حق تعالیٰ کی خبروں کا لاکھوں جگہ سچا ہونا۔

مشاہدہ کر لیا تو یہ خبر بھی بلا تامل صادق ہے۔ مشاہدہ یہ کہ لوگ دو قسم کے ہیں مطیع اور غیر مطیع دیکھ لیجئے کہ ان میں سے راحت و آرام میں کون ہے ہم تو یہ دیکھتے ہیں کہ غیر مطیعین طالبین دنیا ہر وقت پریشانی میں ہیں۔ کسی وقت ان کو چین نہیں۔ بخلاف مطیعین کے کہ وہ جس حالت میں ہیں راحت ہی میں ہیں۔[1]

بعض احکام پر عمل کرنے والا مطیع نہیں

شاید ہر شخص کہے کہ میں مطیع ہوں اس لئے کہ نماز پڑھتا ہوں روزہ رکھتا ہوں اس کی ایسی مثال ہے کہ کوئی شخص کہے کہ فلاں بہت خوبصورت ہے کیونکہ اس کے رخسار ایسے ہیں سر ایسا ہے آنکھیں ایسی ہیں۔ ایک شخص دور سے دیکھنے آوے دیکھا تو میاں نکٹے ہیں تو ان کا سارا حسن و جمال اس ناک نہ ہونے سے کالعدم ہے اور عقلاء اس کو ہرگز حسین نہ سمجھیں گے۔ ایسے ہی ہم لوگوں کا دین ہے کہ دو چار باتیں اسلام کی لیکر سمجھتے ہیں کہ ہم دیندار ہیں تو ایسے دینداروں کی نسبت یہ وعدہ نہیں ہے۔ اگر کوئی پورا دیندار ہو۔ ایمان اور عمل اس کا کامل ہو تو میں دعوے کرتا ہوں کہ اس کو مزیدار زندگی عطا ہوتی ہے۔ بلکہ کامل الاطاعۃ[2]

---

[1] عیش ہو تو نعمت الٰہی کی قدر میں صحت تنگی ہو تو آزمائش میں صابر اور تقدیر پر شاکر

[2] پوری فرمانبرداری کرنے والے۔

کے پاس تک پریشانی نہیں آتی۔

اطاعت[1] کاملہ یہ ہے کہ ظاہر و باطن دونوں درست ہوں

اطاعت کاملہ میں ایک جزو اور بھی قابل تنبیہ ہے وہ یہ کہ اطاعت کاملہ کے معنی یہ سمجھتے ہیں کہ بس ظاہر درست کر لیں یعنی صوم و صلوٰۃ حج و زکوٰۃ و معاملات کی پابندی کر لی بس کامل فرماں بردار ہو گئے خواہ اخلاق کسی درجہ میں ہوں تو یاد رکھنا چاہیئے کہ ایسا شخص بھی کامل دیندار نہیں ہے کامل دیندار وہ ہے جس کا ظاہر اور باطن دونوں آراستہ ہوں واللہ ہم میں جو دیندار کہلاتے ہیں اُن میں سے بہت لوگوں کی حالت یہ ہے اَلْسِنَتُهُمْ[2] اَحْلٰى مِنَ السُّكَّرِ وَقُلُوْبُهُمْ قُلُوْبُ الذِّئَابِ نماز کے بھی جماعت سے پابند ہیں روزے کا بھی اہتمام ہے داڑھی بھی بڑھاتی ہے نیچا کرتہ ہے غرض تمام وضع شرعی سے آراستہ ہیں۔ لیکن اخلاق کے اعتبار سے صفر ہے قلب میں کبر عجب[3] حقد[4] غضب وغیرہ کی بلائیں موجود ہیں۔

تواضع حقیقت میں یہ ہے کہ آدمی اپنے[5] نفس کو سب سے کم سمجھے نہ صرف یہ کہ ہر ایک کے سامنے نرمی سے پیش آوے

اور بعضے ایسے ہیں کہ متکبر ہیں لیکن اپنے کو متواضع[6]

---

[1] پوری فرمانبرداری [2] زبانیں تو انکی شکر سے زیادہ میٹھی ہیں اور دل انکے بھیڑیوں کے سے دل ہیں [3] خود پسندی [4] کینہ [5] اپنی ذات یعنی خود کو [6] تواضع وانکساری والا۔

سمجھتے ہیں حالانکہ وہ تواضع کی حقیقت ہی سے واقف نہیں جیسے ایک شخص گلستاں پڑھتے تھے اس میں تواضع کا بیان آیا استاد نے پوچھا کہ تواضع جانتے ہو کہ کیا شئے ہے کہنے لگے کہ تواضع یہی ہے کہ کوئی اپنے گھر آئے اس کو حقہ پان دیدیا اس کو کھانا کھلادیا اس کی آؤ بھگت کرلی آج کل بڑے بڑے سمجھدار تواضع کی حقیقت اسی قدر سمجھے ہوئے ہیں اور جو اور زیادہ سمجھدار ہیں وہ جانتے ہیں کہ تواضع یہ ہے کہ ہر ایک کے سامنے نرمی سے پیش آوے۔

صاحبو! تواضع یہ نہیں ہے نہ ایسے شخص کو حقیقتاً متواضع کہتے ہیں۔ ایسے شخص کو متواضع کہنے کی مثال تو ایسی ہے جیسے کوئی نقال کسی تحصیلدار کی نقل کرے۔ اس کو کوئی بے وقوف تحصیلدار سمجھنے لگے۔ تواضع حقیقت میں ایک صفت کا نام ہے۔ وہ یہ کہ آدمی اپنے دل میں اپنے نفس کو سب سے کم سمجھے یہ صفت دنیا میں بہت مفقود ہے ایسے تو بہت نکلیں گے جو تقریراً تحریراً اپنی مذمت کرتے ہیں۔

بعضے کہتے ہیں میں بڑا نالائق ہوں بڑا ناکارہ ہوں بعضے اپنے کو حقیر فقیر عاصی پُر معاصی لکھتے ہیں۔ لیکن جب وہ یہ کلمات فرمادیں اس وقت اگر کوئی کہدے کہ ہاں صاحب آپ بڑے نالائق ہیں۔ پھر دیکھئے ان کی کیا حالت ہوتی ہے۔ سنکر تلملا ہی تو جائیں گے وضعداری سے چاہے چپ ہو رہیں۔ مگر دل میں تو یہ آئیگا کہ اس کو کھا جائیں۔ ہاں اگر دل میں ذرا بھی برا نہ مانیں اور کچھ تغیر نہ ہو تو واقعی متواضع ہیں

سب بڑا عمدہ امتحان ہے مگر ایسے کہاں ہیں آجکل تو ظاہری نیاز مندی خشوع[1] وخضوع سب کچھ ہے۔ لیکن دل میں کچھ نہیں۔ بس یہ حالت ہے ؎

از بروں چوں گور کافر پُر حلل[1] ۔ وندروں قہر خدائے عزوجل

از بروں طعنہ زنی بر بایزید[2] ۔ وزدرونت ننگ میدارد یزید

جس دینداری کا خدا تعالیٰ ہم سے مطالبہ کرتے ہیں وہ یہ ہے کہ بالکل جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قدم بقدم ہو جاویں

خلاصہ یہ کہ ایسے لوگ کامل دیندار نہیں ہیں اس لئے کہ جیسا خدا تعالیٰ نے ان سے دیندار ہونے کا مطالبہ فرمایا ہے ویسے نہیں بنے اور میں تم کو بتاتا ہوں کہ خدا تعالیٰ نے کیسا چاہا ہے اور میں دو لفظوں میں خلاصہ بتاتا ہوں۔ اور میں کیا خود خدا تعالیٰ بتاتے ہیں اگر تفصیلاً بیان کیا جاوے کہ خدا تعالیٰ نے کیسا چاہا ہے تو دفتر کے دفتر ختم ہو جاویں پھر بھی بیان ناتمام ہی رہے اس لئے گر کی بات عرض کرتا ہوں۔ حق تعالیٰ فرماتے ہیں لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ خلاصہ آیت کا یہ ہے کہ امور اختیاریہ میں ایسے بن جاؤ اور ایسے ہو کر آؤ جیسے

---

[1] عاجزی وانکساری [2] باہر سے تو کافر کی قبر کی طرح ہیں کہ سجے ہی سجے ہیں اور اندر خدا تعالیٰ کا عذاب [3] باہر سے تو تم حضرت بایزید بسطامیؒ پر طعن کرنے لگتے ہو اور تمہاری اندرونی حالت سے یزید بھی شرما جاتا ہے۔

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ گویا حق تعالیٰ نے ہمارے پاس ایک نمونہ بھیجدیا ہے اور گویا فرما دیا کہ تفصیلاً کہانتک بیان کریں کہ یہ صفت پیدا کرو وہ صفت چھوڑ دو۔ ہم ایک نمونہ بھیجے دیتے ہیں ایسے بن جاؤ۔ اپنے اخلاق۔ عادات۔ کھانا۔ پینا۔ سونا۔ بیٹھنا۔ اٹھنا۔ چلنا۔ پھرنا۔ وضع۔ طرز۔ انداز۔ چال۔ ڈھال ایسا ہو جیسا ہمارے محبوب کا ہے۔ بس اب آپ غور کر لیجئے کہ اگر ایک صفت کی بھی کمی ہوئی تو ہم نمونہ کے موافق نہ ہوتے۔ اس کی ایسی مثال ہے کہ درزی سے ہم کو اچکن سلوانا منظور ہے۔ ہم نے نمونہ کے واسطے ایک اچکن بھیجدیا کہ ایسا سی لاؤ۔ اب بتلانے کی ضرورت نہیں ہے کہ آستین اس قدر ہوں سلائی اس طرح کی ہو۔ اس قدر نیچا ہو۔ وہ سی کر لایا۔ دیکھا تو اس کے مطابق ہے لیکن ایک آستین بڑھی ہوئی ہے تو اس درزی سے کہا جاویگا کہ ظالم تیرے پاس ہم نے نمونہ بھیجدیا تھا پھر بھی تو نے اس کے موافق نہ سیا اور اس اچکن کو ہرگز نمونہ کے موافق نہ کہا جائیگا۔ وہ اچکن اس درزی کے مُنہ پر ماریں گے۔ اور اس کو سزا دیں گے۔ تو صاحب جب ہم حاکم حقیقی کے سامنے پیش کئے جاویں گے اور ہماری نماز ایسی نہ ہوگی جیسی کہ حضور کی تھی۔ وضع۔ لباس۔ طرز۔ انداز ایسا نہ ہوگا جیسا کہ حضورؐ کا تھا تو کچھ عجب نہیں کہ نکالدئے جاتیں۔ اَللّٰهُمَّ احْفَظْنَا وَاحْشُرْنَا فِي زُمْرَتِهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَآلِهِ وَسَلَّمَ[۱]

---

۱ اے اللہ ہم کو سب برائیوں سے محفوظ رکھئے اور ہمارا حشر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی جماعت میں فرما دیجئے۔

حکایت - ایک حکایت بطور تمثیل کے یاد آئی کہ بادشاہ عالمگیرؒ جب صاحب تخت و تاج ہوتے تو تمام اہل حرفہ وصنعت کو موافق دستور شاہی انعام دیا گیا۔ بہروپیے بھی آتے لیکن عالمگیر ایک مولوی آدمی تھے۔ اس لئے ان کو دینا ناجائز سمجھا[1] لیکن صراحتہً ان کو ٹالنا اور صاف جواب دینا مناسب نہ سمجھا یہ چاہا کہ کسی حیلہ لطیف سے ان کو ٹال دیا جائے کہا کہ جب ایسی شکل میں آؤ کہ ہم نہ پہچانیں تو انعام دیں گے۔ وہ مختلف شکلوں میں آتے مگر عالمگیرؒ نے پہچان لیا جب دکن کی مہم پیش آئی اور عالمگیرؒ نے دکن کا سفر کیا تو سفر میں عالمگیرؒ کا طریق یہ تھا کہ راستہ میں جس صاحب کمال کو سنتے تھے اس سے جا کر ملتے تھے، دکن کے سفر میں بھی حسب عادۃ اہل کمال سے ملنے جاتے تھے۔ ایک مقام پر سنا کہ یہاں ایک درویش بڑے باکمال ہیں۔ اوّل وزیر کو ملنے کے لئے بھیجا وزیر نے ہر طرح ان کو جانچا وہ ہر بات میں پورے اترے آکر عالمگیرؒ سے بہت تعریف کی اور کہا کہ ان کو تکلیف دینا بے ادبی ہے آپ خود تشریف لیجا کر ان سے ملئے۔ عالمگیر خود گئے اور مل کر بہت خوش ہوتے عالمگیرؒ کو بعض مسائل تصوف میں کچھ شبہات تھے وہ پیش کئے سب شبہات کے شافی جواب پاتے بالکل اطمینان ہو گیا۔ اور نہایت متأثر ہوتے۔ اور ایک توڑا[2] اشرفیوں کا پیش کیا درویش نے ایک لات ماری اور کہا کہ مجھ کو

---

[1] دھوکا اور جھوٹ پر دینا گناہ ہے۔ [2] اللہ والے کو۔ [3] سونے کے سکوں کی ایک تھیلی۔

بھی اپنی طرح دنیادار سمجھتا ہے۔ عالمگیر رحؒ اور زیادہ متاثر ہوئے اور اس توڑے کو اٹھا لیا اور وہاں سے چلے راہ میں وزیر سے دیر تک اس درویش کا ذکر کرتے رہے جب لشکر میں پہنچے تو سامنے دیکھا کہ وہ بزرگ تشریف لا رہے ہیں اور بادشاہ کو جھک کر سلام کیا اور انعام مانگا۔ عالمگیر رحؒ حیرت میں ہو گئے اور غور کر کے پہچانا اور اس کو کچھ انعام دیا اور یہ پوچھا کہ میں نے اب تسلیم کر لیا کہ تو بڑا ہوشیار اور اپنے فن کا کامل ہے مگر یہ بتلا کہ اس کی کیا وجہ ہے کہ اس وقت ہم نے تجھ کو اس سے کہیں زیادہ دیا تھا اس کو تو نے رد کر دیا۔ اور یہ روپیہ اس سے بہت کم ہے یہ خوشی سے لے گیا۔ اس نے کہا کہ جو نقل ہیں نے کی تھی وہ لینا اس کے خلاف تھا۔ اس لئے نہیں لیا۔ تو صاحبو ہم لوگ تو اس نقال سے بھی گئے گزرے ہوتے، ہم سے تو نقل بھی دین کی نہیں ہوتی۔

بزرگی یہ ہے کہ ظاہراً بھی دیندار ہو اور باطناً بھی نہ کہ کشف[۲] و کرامت[۳]

حاصل یہ ہے کہ دیندار کامل تو وہ ہے کہ ظاہراً بھی دیندار ہو اور باطناً بھی۔ کیونکہ اعمال کی دو قسمیں ہیں ظاہری اور باطنی۔ ظاہری تو روزہ۔ نماز۔ حج۔ زکوٰۃ وغیرہ اور باطنی انس۔ رضا۔ شوق۔ صبر۔ قناعت

---

[۱] اسکی حرکت پر نہیں بلکہ وعدہ پر دیا تھا [۲] درمیان سے حجابات اٹھ کر کسی بات یا چیز کا ظاہر ہونا کشف ہے اور ایسی باتوں یا فعلوں کا جو کسی پیرو کار متقی سے ظاہر ہو جانا جو دوسرے سے نہ ہو کرامت ہے۔

وغیرہا ہیں۔ اور ان کے مقابلہ میں بداخلاقیاں غضب، حقد، تکبر، بے صبری، حرص ہیں۔ یہی وہ چیزیں ہیں جو مشائخ کے یہاں ملتی ہیں۔ اساتذہ کے یہاں تو ظاہر درست ہوتا ہے اور مشائخ کے یہاں یہ اخلاق درست ہوتے ہیں۔ اور اسی کا نام بزرگی ہے [illegible] کو جانتے ہیں۔ مجھ کو ایک شیخ صاحب کے ارشاد پر تعجب ہوا کہ انھوں نے ایک شخص سے کہا کہ میاں تم ذکر و شغل کرتے ہو کچھ نظر بھی آتا ہے انھوں نے کہا کہ مجھے تو کچھ بھی نظر نہیں آتا۔ تو ہنس کر فرمایا کہ بھائی ثواب جمع کئے جاؤ۔ آہ افسوس ہے کہ ان شیخ نے ثواب کی کچھ بھی قدر نہ کی۔ میں تو اسی دن سے ان کی شیخی سے کچھ بے اعتقاد ہو گیا۔ جو خدا تعالےٰ کی رضا کو چھوڑ کر کشف کو ڈھونڈے اس کی مثال ایسی ہے کہ جیسے وزارت کو چھوڑ کر گھاس کھودنے لگے۔ اس لئے کہ کشف کا حاصل بعض غیر معلوم غیر مقصود اشیا کا معلوم ہو جانا ہے۔ سو یہ کوئی کمال نہیں ہے۔ کمال یہ ہے کہ ظاہر اور باطن موافق شریعت کے ہو۔ میں ایسے شخص کے لئے میں دعوے کر کے کہتا ہوں کہ اس کو حیات طیبہ نصیب ہو گی اور کسی قسم کی پریشانی اس کو نہ ہو گی۔

۱؎ جھوٹے پیروں کی ۲؎ پیری ۳؎ جو چیزیں مطلوب و مقصود نہیں اور معلوم نہ تھیں ان کا معلوم ہونا ۴؎ جو ظاہر و باطن کا جامع ہو۔

حضرات اہل اللہ کو مصائب میں کبھی پریشانی نہیں ہوتی بلکہ اور لطف آتا ہے

اگر کوئی کہے کہ ہم تو بچشم خود دیکھتے ہیں اور سنتے آئے ہیں کہ اکثر اولیاء اللہ اور بزرگانِ دین تکالیف میں مبتلا ہوتے ہیں پھر مزہ دار زندگی کہاں ہوئی میں کہتا ہوں کہ بے شک مسلم ہے کہ ان حضرات کو بلا اور مصائب کا سامنا رہتا ہے بلکہ اوروں سے زیادہ لیکن ان کو ان مصائب میں بھی مزہ آتا ہے اور جس کا نام پریشانی ہے وہ نہیں ہوتی اس کی ایسی مثال ہے کہ ایک شخص کسی پر عاشق ہو جائے اور محبوب اس سے مدتوں تک جدا ہو اور وہ اس کی یاد میں گھلتا ہو ایک روز دفعۃً محبوب آ پہنچا اور آکر لپٹ گیا اور اس کو خوب دبایا اور اس قدر دبایا کہ پسلیاں ٹوٹنے لگیں لیکن اگر وہ سچا عاشق ہے تو واللہ اس کو اس قدر مسرت ہوگی کہ دنیا و مافیہا سے بڑھ کر اس کو سمجھے گا اور کہے گا کہ یہ تو وہ شخص ہے جس کے واسطے تمام عمر کھو دی اور مال و دولت آبرو اس پر نثار کر دی اگر محبوب کہے بھی کہ اگر تکلیف ہو تو چھوڑ دوں تو وہ کہے گا کہ خدا نہ کرے وہ دن کہ تم مجھ کو چھوڑ دو بلکہ یوں کہے گا

اسیرت نخواہد رہائی ز بند ۔۔۔ شکارت نجوید خلاص از کمند

لہ تیرا قیدی تو قید سے چھوٹنا ہی نہیں چاہتا تیرا شکاری تیری کمند سے چھٹکارا ہی نہیں چاہتا

اور اگر وہ کہے کہ میں اس رقیب کو جو پاس کھڑا ہے دبا لوں اور تم کو راحت دوں تو کہے گا ؎

نہ شود نصیبِ دشمن کہ شود ہلاکِ تیغت[۱] سرِ دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی

اور کہے گا۔

سرِ وقتِ ذبح اپنا اس کے زیرِ پائے ہے کیا نصیب اللہ اکبر لوٹنے کی جائے ہے

حضرات اہل اللہ کو موت بھی محبوب ہوتی ہے

دیکھئے لوگوں کے نزدیک سب سے زیادہ مصیبت موت ہوتی ہے اور عشاق کے نزدیک وہی موت محبوب دولت ہے کہتے ہیں ؎

خرم آں روز کزیں منزلِ ویراں بروم[۲] راحتِ جاں طلبم وزپئے جاناں بروم

نذر کردم کہ گر آید بسر ایں غم روزے[۳] تا درِ میکدہ شاداں و غزل خواں بروم

اور یہ تمنائیں تو ان حضرات کی موت آنے سے پہلے ہوتی ہیں لیکن

---

[۱] دشمن کو یہ نصیب نہ ہو کہ تیری تلوار سے ہلاک ہو ہم دوستوں کے سر سلامت رہیں کہ تو ان پر خنجر آزمائی کرے [۲] میں تو اس دن خوش ہوں گا کہ اس اُجڑے گھر سے چلا جاؤنگا روح کی راحت طلب کروں گا محبوب کیلئے چل دونگا [۳] میں نے منت مانی ہے کہ اگر مرنے یہ غم کسی دن بھی آجائیگا تو میکدہ تک خوش خوش غزل پڑھتا جاؤں گا۔

عین موت کے وقت بھی یہی ہوتا ہے ایک بزرگ وفات کے وقت کہتے ہیں ؎

وقت آں آمد کہ من عریاں شوم[1] جسم بگذارم سراسر جاں شوم

ابن فارض کا جب انتقال کا وقت آیا تو آٹھوں جنتیں ان کے لئے مکشوف ہوئیں دیکھ کر منہ پھیر لیا اور فرمایا ؎

إِنْ كَانَ مَنْزِلَتِي فِي الْحُبِّ عِنْدَكُمْ
مَا قَدْ رَأَيْتُ فَقَدْ ضَيَّعْتُ أَيَّامِي

یعنی اگر میرا مرتبہ عشق میں آپ کے نزدیک یہی ہے جو میں دیکھ رہا ہوں تو میں نے اپنا وقت ہی ضائع کیا میرا مقصود تو آپ کی ذات پاک ہے۔ اگر آپ نہ ملے تو جنت کو لے کر کیا کروں گا۔ اس کے بعد ان پر تجلی حق ہوئی اور اسی میں رحلت فرمائی سبحان اللہ اب فرمائیے کہ جب موت سے بھی یہ حضرات پریشان و ہراساں نہیں ہوتے تو فقر و فاقہ میں افلاس و تنگی میں تو کیا پریشانی ہے۔

حکایت۔ حضرت بہلولؒ نے کسی بزرگ سے پوچھا کہ کس حال میں ہو فرمایا کہ ایسے شخص کا کیا حال پوچھتے ہو کہ جو کچھ عالم میں ہو رہا ہے سب اسی کی مرضی کے موافق ہو رہا ہے۔ وہ کیسا کچھ مزے میں ہو گا حضرت بہلول نے کہا یہ بات سمجھ میں نہیں آتی

---

[1] وہ وقت آگیا کہ میں ننگا ہو جاؤں جسم کو چھوڑ ڈالوں روح ہی روح ہو جاؤں۔

مخلوق کے لئے ایسا کب ہو سکتا ہے کہ جو کچھ ہوتا ہے سب اس کی خواہش کے موافق ہوتا ہے۔ یہ شان تو حق تعالیٰ ہی کی ہے انہوں نے فرمایا کہ جس شخص نے اپنے ارادہ کو ارادۂ اللہ میں فنا کر دیا ہو تو جو امر ارادہ الہیہ کے موافق ہو گا وہ اس کے ارادہ کے بھی موافق ہو گا۔

حاصل یہ کہ ہم اپنے نفس کو اپنی رائے کو حق تعالیٰ کی رضا میں فنا کر چکے ہیں۔ جس حالت میں ہیں خوش ہیں۔

حضرات اہل اللہ کو پریشانی نہ ہونے کا راز

بات یہ ہے کہ پریشانی کی دو وجہ ہوا کرتی ہیں۔ اول تو جس سے معاملہ ہو اس سے محبت نہ ہو۔ جب پریشانی ہوتی ہے اور اگر محبت ہو تو پریشانی کسی طرح نہیں ہو سکتی۔ مثلاً محبوب اگر یوں کہے کہ مجھ سے دو گھنٹہ دھوپ میں کھڑے ہو کر باتیں کرو اگر وہ کہے کہ نہیں تو دعوئے محبت میں جھوٹا ہے اور اگر سچا ہے تو اس کی یہ حالت ہو گی۔ ؎

ہر کجا یوسف رخے باشد چو ماہ ۔۔۔ جنت است آں گرچہ باشد قعر چاہ[1]

دوسری وجہ پریشانی کی یہ ہوتی ہے کہ خلاف امید کوئی امر پیش آوے کہ سوچا کچھ اور ہو گیا کچھ مثلاً طاعون آیا ہم چاہتے تھے کہ تندرست رہیں مگر نہ رہے۔ چاہتے تھے کہ تجارت میں نفع ہو

---

[1] جہاں کہیں کوئی چاند جیسا یوسف چہرہ والا ہو وہ جگہ تو جنت ہے اگرچہ کنویں کی گہرائی ہو ۱۲

نہ ہوا۔ چاہتے تھے کہ اولاد ہو نہ ہوئی تو اُس وقت پریشانی ہو گی اور جو شخص اپنی رائے کو فنا کر چکا ہو اور اپنے ارادے کو رضائے مولے میں مٹا چکا ہو اس کو پریشانی کی یہ وجہ کبھی نہ ستائے گی ؀

حکایت ۔ حضرت بہلول سے کسی نے کہا کہ اناج بہت گراں ہو گیا ہے ۔ فرمایا کہ کچھ پرواہ نہیں ہمارے ذمہ یہ ہے کہ اس کی عبادت کریں اور اس کے ذمہ ہے کہ ہم کو حسب وعدہ رزق دے۔

حکایت ۔ ایک بزرگ نے اپنی توبہ اور رجوع الی اللہ[۱] کا قصہ بیان کیا کہ ایک سال قحط بہت تھا ۔ مخلوق بہت پریشان تھی۔ اسی حالت میں ایک غلام کو دیکھا کہ بے فکری سے گاتا ہوا خوش بخوش جا رہا ہے ۔ اس سے کسی نے پوچھا کہ مخلوق تو پریشان ہو رہی ہے اور تو اس طرح بے فکر ہے ۔ اس نے کہا کہ میں بے فکر کیوں نہ ہوں میرے مالک کے یہاں دو گاؤں ہیں ۔ اس وقت نفس کو ایک تازیانہ لگا اور یہ بات ذہن میں آئی کہ ارے نفس جس کے مالک کے پاس دو گاؤں ہیں وہ تو بے فکر ہے اور تیرے مالک کے قبضہ میں آسمان زمین عرش کرسی ہے تو پریشان ہے ۔ اسی

---

[۱] اللہ تعالے کی طرف اپنے دل کا لوٹ جانا ؀

وقت سے توجہ الی اللہ کی توفیق ہوئی۔ افسوس کہ اس وقت معاملہ بالعکس ہوگیا۔ دنیا کمانے اور شب و روز اسی دھن میں رہنے کو ترقی اور اولوالعزمی سمجھتے ہیں اور بے فکری اور توکل کو سستی کہتے ہیں۔ اور طرہ یہ ہے کہ اپنے کو خیر خواہ اور بہی خواہ قوم کہتے ہیں۔ جو شخص رات دن ہوائے نفسانی[1] میں مبتلا ہو اور سوائے دنیا کمانے کے کوئی مشغلہ نہ ہو اس سے دوسرے کی خیر خواہی کیا ہوسکتی ہے۔ حقیقی خیر خواہ انبیا علیہم السلام اور بزرگان دین ہیں حق تعالےٰ فرماتے ہیں لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ اَلَّا يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ ٥ یعنی اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم آپ جو شب و روز ان کی فکر میں گھلتے ہیں تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ شاید اسی فکر میں کہ یہ ایمان نہیں لاتے آپ اپنی جان کو ہلاک کر دیں گے۔ ان حضرات کا مشرب یہ ہے ؎

طریقت بجز خدمت خلق نیست[2]   بہ تسبیح و سجادہ و دلق نیست

شاہ اسحٰق صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں ایک شخص حاضر ہوا کہ حضرت فلاں شخص کے نام ایک رقعہ لکھ دیجئے۔ اس سے میرا

---

[1] نفسانی خواہشات لذتوں اور مزوں میں پڑا ہونا۔

[2] طریقت مخلوق کی خدمت و اصلاح کے سوا کچھ نہیں تسبیح و جانماز اور گدڑی سے نہیں کہ وہ اپنے ہی لئے ہیں اور اصلاح سب کے لئے ہے؂

ایک کام ہے آپ کا رقعہ دیکھنے سے وہ کردے گا۔ وہ شخص حضرت کا سخت مخالف تھا۔ حضرت نے رقعہ لکھ دیا اس نے جاکر اس شخص کو دیا۔ [illegible] دیا اس نے اس رقعہ کی بتی بنا کر دی اور کہا کہ شاہ صاحب سے کہو کہ اس کی بتی بنا کر فلاں جگہ رکھ لو۔ اس شخص نے اسی طرح آکر یہ مقولہ شاہ صاحب کی خدمت میں نقل کیا۔ شاہ صاحب نے فرمایا کہ بھائی کہ اگر اس فعل سے تیرا کام چلتا تو مجھے اس سے بھی دریغ نہ ہوتا۔ یہ جواب اس کو پہنچا وہ شخص یہ بات سن کر تڑپ گیا اور اس قدر متاثر ہوا کہ شاہ صاحب کی خدمت میں آکر اس نے معذرت کی اور اس کو ہدایت ہوگئی۔ دس برس کے مجاہدہ میں بھی وہ بات نہ ہوتی جو شاہ صاحب کے ایک کلمہ میں ہوگئی۔ اب بتلائیے کہ ایسی نفع رسانی آج کس میں ہے۔ آج ترقی کا دم بھرنے والے اس کو پست ہمتی کہتے ہیں۔ ایک بزرگ سے کسی نے پوچھا کہ تم کہاں سے کھاتے ہو۔ انہوں نے فرمایا کہ یہ دنیا اللہ کا گھر ہے اور ہم اس کے ضیف[1] ہیں اور ضیافت[2] بروئے حدیث تین دن ہے اور اللہ کے نزدیک ایک دن ایک ہزار برس کا ہے۔ چنانچہ فرمایا ہے[3] وَاِنَّ یَوْمًا عِنْدَ رَبِّکَ کَاَلْفِ سَنَةٍ

---

۱ مہمان ۲ مہمانی ۳ اور بیشک ایک دن تمہارے رب کے پاس مثل ایک ہزار سال کے ہے ان میں سے جن کو تم شمار کرتے ہو۔

مِمَّا تَعُدُّوْنَ ٥ تو تین ہزار برس تک تو دعوت ہے اس کے بعد پوچھنا۔

روپیہ کمانے کی ممانعت نہیں اس میں کھپ جانے کی ممانعت ہے

میرا مطلب ان حکایات سے یہ نہیں ہے کہ روپیہ نہ کماؤ اور جاگیر گھر لٹا دو۔ مقصود یہ ہے کہ اس میں کھپ مت جاؤ۔ بلکہ ضرورت پر نظر رکھو۔ اور ایسی خصائل حاصل کرو جیسی کہ بزرگوں میں تھیں اور مال جمع کرنے کی ممانعت نہیں کرتا بلکہ بعض بزرگ روپیہ بہت رکھتے تھے۔ مگر وہ اپنے نفس کے لئے نہیں بلکہ خدمت خلق کے لئے۔ جیسے خزانچی اور تحصیلدار ہوتا ہے۔ یہ حضرات بھی اسی طرح سے روپیہ رکھتے ہیں اور بلا اذن اس میں سے خرچ نہیں کرتے۔ جیسے سلیمان علیہ السلام کو سلطنت دی گئی اور حضرت صدیق اکبرؓ کو خلافت ملی۔ یوسف علیہ السلام کو مصر کی بادشاہی ملی۔ لیکن حالت کیا تھی۔ کہ جب مصر میں قحط پڑا تو یوسف علیہ السلام پیٹ بھر کر کھانا نہ کھاتے تھے۔

ؔ یہ جو لوگ کہہ دیتے ہیں کہ مولوی لوگ ترقی سے روکتے ہیں یہ علماء اور دین سے نفرت پیدا کرنے والی خطرناک بات ہے ایسا لفظ زبان سے بھی نہ نکالئے وہ تو دینی تنزل سے روکتے ہیں دینی ترقی کیساتھ مالی ترقی سے نہیں روکتے۔

اہل اللہ کی خوش خوراکی و خوش لباسی بھی رضائے الٰہی کے لئے ہوتی ہے

اور اگر اہل اللہ میں کوئی خوش خوراک خوش لباس پایا جاوے تو وہ بھی باذن الٰہی ہے مثلاً ایک شخص ہے اس کو یہ ثابت ہوا کہ خلق کی ہدایت میرے متعلق ہے اور مواعظ و تقریر سے تدریس سے لوگوں کو ہدایت کرنا اس کا مشغلہ ہے سو اگر وہ گھی دودھ اغذیہ مقویہ کا استعمال چھوڑ دے تو دماغ میں خشکی آ دے گی اور کچھ کام اس سے نہ ہو سکے گا۔ اور اگر دماغ کی حفاظت کرے گا تو سب کام ہو سکیں گے۔

نفس کو کھلا پلا کر اس سے سرکاری کام لو

یہ نفس بطور مزدور کے ہے اور یہ دماغ سرکاری مشین ہے اگر اس کو مزدوری ملتی رہے اور مرمت ہوتی رہے تو کام دنیا رہے گا۔ پس وہ خدمت نفس کی اس اعتبار سے نہیں کہ وہ ہمارا ہے بلکہ اس اعتبار سے ہے کہ وہ سرکاری خدمت سے تعلق رکھتا ہے۔

کسی نے خوب کہا ہے ؎

نازم بچشم خود کہ جمالِ تو دیدہ است ¹ | افتم بپائے خود کہ بکویت رسیدہ است
ہر دم ہزار بوسہ زنم دستِ خویش را ² | کو دامنت گرفتہ بسویم کشیدہ است

حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں ³ اِنَّ لِنَفْسِكَ عَلَيْكَ حَقًّا وَلِزَوْجِكَ عَلَيْكَ حَقًّا اور فرماتے ہیں ⁴ اَلْمُؤْمِنُ الْقَوِيُّ خَيْرٌ مِّنَ الْمُؤْمِنِ الضَّعِيْفِ۔

ہدایتِ خلق جن بزرگوں کے متعلق نہیں ہوتی ہے انہیں صرف اپنی اصلاح کی فکر ہوتی ہے خلق کے بُرا بھلا کہنے کا ڈر نہیں ہوتا

اور بعضوں سے کچھ نفعِ خلق کا متعلق نہیں ہوتا ان کو اپنے ہی نفس کی اصلاح کی فکر ہوتی ہے۔ ان کا مذاق یہ ہوتا ہے ے

---

¹ مجھے تو اپنی آنکھ پر ناز ہے کہ اس نے آپ کا جمال دیکھا ہے میں اپنے پیروں کے بھی پاؤں پڑتا ہوں کہ آپ کے کوچہ میں پہنچے ہیں ² ہر وقت اپنے ہاتھ کو ہزاروں بوسے دیتا ہوں کیونکہ اسی نے آپ کا دامن پکڑ کر میری طرف کھینچا ہے ³ بے شک تمہاری جان کا تم پر حق ہے اور تمہاری بیوی کا تم پر حق ہے ⁴ قوی مسلمان کمزور مسلمان سے بہتر ہے۔ یعنی ظاہر میں بھی قوی ہو اور دوسروں کی مدد کرے اور باطن میں بھی قوی ہو۔

احمد تو عاشقی بہ مشیخت ترا چہ کار ۔ دیوانہ باش سلسلہ شد شد نشد نشد

اور ایک کہتے ہیں ؎

خلق میگوید کہ خسرو بت پرستی میکند ۔ آرے آرے میکند با خلق و عالم کار نیست

تو یہ کسی قسم کی بدنامی سے نہیں ڈرتے۔

ہدایت خلق جن بزرگوں کے متعلق ہوتی ہے وہ بدگمانی کے موقع سے بھی بچتے ہیں

ایک وہ ہیں جو شبہ سے بھی بچتے ہیں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مسجد میں معتکف تھے کہ حضرت صفیہ رض جو ازواج مطہرات سے ہیں تشریف لائیں جب واپس تشریف لے گئیں تو حضور ان کے پہنچانے کے لئے لب مسجد تک تشریف لائے کہ سامنے سے دو شخص آئے حضور نے فرمایا ذرا ٹھہرو اور پھر فرمایا اِنَّهَا صَفِيَّةُ ۔

لہ احمد تم تو عاشق ہو تمہیں پیر ہونے سے کیا کام دیوانگی اختیار کرو سلسلہ ہو یا نہ ہو نہ ہو لہ لوگ کہتے ہیں کہ خسرو بت پرستی (یعنی خلاف بُرا کام) کرتا ہے تو ہاں ہاں میں کرتا ہوں مجھے لوگوں سے اور دنیا سے کوئی کام نہیں یعنی میرا معاملہ اللہ سے ہے جس کو تم ظاہر سے بُرا سمجھتے ہو سمجھا کرو۔ مجھے تمہاری پرواہ نہیں وہ ظاہر کا بُرا کام ہے درحقیقت اس کا باطن کچھ اور ہے۔

یعنی یہ صفیہ ہیں۔ یہ بات ان کو بہت بھاری ہوئی اور عرض کیا یا رسول اللہ توبہ توبہ کیا حضور کی نسبت ہم کچھ گمان کر سکتے تھے فرمایا کہ شیطان ابن آدم کے رگ و ریشہ میں بجائے خون کے دوڑتا ہے۔ مجھ کو اندیشہ ہوا کہ کہیں تمہارے دل میں کوئی وسوسہ نہ ڈال دے۔

اہل اللہ مختلف مذاق کے ہوتے ہیں

اولیاء اللہ مختلف رنگ کے ہوتے ہیں، سرکاری گلدستہ ہے۔ اس میں گلاب بھی ہے چنبیلی بھی بیلا بھی اور خار بھی ہے۔

اہل اللہ کو غم ہوتا ہے پریشانی نہیں ہوتی

اگر کوئی کہے کہ ہم نے انبیاء کی حکایتیں سنی ہیں کہ ان کو غم ہوئے ہیں۔ یعقوب علیہ السلام ایک مدت تک یوسف علیہ السلام کی جدائی میں مغموم رہے۔ ایوب علیہ السلام سخت مصائب میں مبتلا رہے۔ یوسف علیہ السلام کو بھائیوں نے ایذا پہنچائی۔ جواب یہ ہے کہ ان حضرات کو رنج و غم تو ہوا لیکن پریشانی نہیں ہوئی۔ غم اور شے ہے پریشانی اور چیز ہے۔ غم ہونا کمال کے منافی نہیں بلکہ عین کمال ہے۔ بعض بزرگوں کا حال آیا ہے کہ ان کے بیٹے کا انتقال ہوا اور وہ ہنس رہے تھے۔ اور جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے

بیٹے حضرت ابراہیم کا انتقال ہُوا تو حضور محزون دل تھے، ظاہر ہے کہ کمال وہ ہے جو حضور کا فعل ہے وجہ اس کی یہ ہے کہ جو مغموم نہیں ہُوئے انہوں نے تو صرف حق تعالےٰ کا حق ادا کیا اور جن کو غم ہُوا انہوں نے اولاد کا بھی حق ادا کیا اور اللہ تعالےٰ کا بھی کاملین کو جو غم دیا جاتا ہے اس میں یہ حکمت ہوتی ہے کہ صبر کی فضیلت حاصل کریں، اس لئے کہ صبر بدوں غم کے نہیں ہوتا اور دوسری حکمت یہ ہے کہ حزن سے تصفیہ ہوتا ہے قلب کا

غم حیاتِ طیبہ کے منافی[1] نہیں

اگر کوئی کہے کہ جب حزن ہُوا تو حیاتِ طیبہ کہاں ہُوئی بات یہ ہے کہ عین واقعۂ رنج میں دو حیثیتیں ہیں، باعتبار مصیبت ہونے کے تو وہ الم رساں[2] ہے اور باعتبار من المحبوب[3] ہونے کے وہ مرضی[4] ہے اور ان حضرات کے ہر واقعہ کا من اللہ[5] ہونا ہر وقت پیش نظر رہتا ہے۔ اس لئے خواہ کسی طرح کی مصیبت پیش آوے وہ اس حیثیت سے پسندیدہ ہے اور ان کے اطمینان قلب میں کسی طرح خلل انداز نہیں ہاں تکلیف پہنچنا امر آخر ہے۔

---

[1] مخالف یعنی پاکیزہ زندگی اور غم جمع ہو سکتے ہیں۔ [2] تکلیف دینے والا [3] محبوب کی جانب سے [4] پسندیدہ [5] اللہ تعالیٰ کی طرف سے۔

اس کی حقیقت جو بفضلہ تعالیٰ آج ہی سمجھ میں آئی ایک مثال کے ضمن میں یہ ہے کہ طیبؔ ہونے کے دو درجہ ہیں اول مزہ دار ہونا اور نافع ہونا۔ دوسرے صرف نافع ہونا مثلاً کہتے ہیں کہ یہ دوا طیب ہے تو معنے یہ ہیں کہ مزہ دار بھی ہے اور نافع بھی ہے۔ اور کہتے ہیں کہ یہ دوا طیب ہے تو اس کا طیب ہونا یہ ہے کہ شفا ہو جاوے۔ امراض زائل ہو جاویں بس حزن مثل دوا کے ہے۔ دوا کا کڑوا ہونا گو طبع کے خلاف ہے لیکن گوارا ہے۔ کڑوی دوا بھی خوشی سے پی لی جاتی ہے اور تلخی برداشت کی جاتی ہے اور یہ بھی حصولِ لذت کے لئے ہے اس لئے کہ دوا سے صحت ہوگی اور صحت لذیذ ہے تو دوا بھی اس قاعدے سے لذیذ ہوگی اور اس میں بھی ایک گونہ مسرت ہوگی بشرطیکہ اس کا نافع ہونا پیش نظر ہو۔ بحمد اللہ اس تقریر سے سب شبہات رفع ہو گئے۔[2]

---

[1] پاکیزہ [2] کہ غم ہوتا ہے جیسے دوا کڑوی لگتی ہے پریشانی نہیں ہوتی جیسے کڑوی دوا سے صحت کی امید کی خوشی میں کڑوا پن دب جاتا ہے تو محبوب کی طرف سے ہونے کی خوشی میں غم دب جاتا ہے پریشانی نہیں ہوتی ان پر مصیبتیں بھی آتی ہیں کیونکہ بیماریوں میں کڑوی دوا دی جاتی ہے قرب میں جو کمی رہ گئی ہے اس کی یہ دوا ہے کہ دونوں میں رنج تو طبیعت پر ہوتا ہے مگر اطمینان دل اور عقل کو ہے وغیرہ۔

محبت سے تمام مصیبتیں آسان ہو جاتی ہیں اور محبت ہی اصل سبب ہے ترقی کا

خلاصہ یہ کہ ان حضرات کو خواہ مصیبت ہو رنج ہو فقر و فاقہ ہو ہر وقت خوش ہیں اور اصل میں خوش کرنے والی ان کو محبت ہے۔ چونکہ ان کو حق جل و علا شانہ سے محبت ہے۔ اس لئے لقائے حق کے انتظار میں ان کو سب سہل ہے۔ دنیا میں دیکھ لیجئے اگر کسی کو کسی سے محبت ہو جاتی ہے اور یہ معلوم ہو کہ فلاں وقت وہ ہم سے ملے گا تو اس وقت کے انتظار میں سب بلائیں اس کو سہل ہیں یہ انتظار کہ خدا تعالےٰ ہم سے خوش ہوں گے یا اس وقت ہم سے خوش ہیں اس کی ایسی خوشی ہوتی ہے کہ سب مصائب سہل ہو جاتے ہیں یہ سب محبت کی برکت ہے۔

خدا کی قسم یہی وہ شے ہے جس کی وجہ سے صحابہ رضی اللہ عنہم تمام اُمت میں ممتاز ہوئے۔ اور یہی وہ دولت ہے جس کے سبب سے سلف رحمہم اللہ کے آج تذکرے لکھے جاتے ہیں اور اصل سبب ترقی کی یہی شے ہے۔ آج کل صحابہ کا تذکرہ کیا جاتا ہے کہ انہوں نے یوں ترقی کی یوں کی اور اس امر میں ان کا اپنے نزدیک اقتدا کرتے ہیں اور اصل روح اور سبب ترقی سے

مس تک نہیں اور نہ ترقی کی حقیقت سے واقف ہیں دنیا سمیٹنے کو اور جاہ مذموم کی تحصیل کا نام ترقی کو رکھا ہے۔ صحابہؓ نے جو فتوحات کی وہ سب للدین تھی۔ دنیا ان کے پاس تک نہ تھی سو ایسی ترقی کو کون منع کرتا ہے۔

اہل اللہ مختلف مذاق کے ہوتے ہیں

صحابہ اور نیز دیگر سلف صالحین میں بھی مختلف رنگ کے لوگ تھے۔ حضرت عیسیٰؑ نے گھر تک نہیں بنایا۔ حضرت سلیمانؑ صاحب سلطنت ہوئے حضرت ابوذر غفاریؓ مال جمع کرنے کو بالکل حرام فرمایا کرتے تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوذر غفاریؓ سے فرمایا تھا کہ اے ابوذر میں تمہارے لئے وہ پسند کرتا ہوں جو اپنے لئے پسند کرتا ہوں۔ تم دو شخصوں کے درمیان کبھی فیصلہ مت کرنا اور نہ یتیم کے مال کے ولی بننا۔ اس لئے کہ میں تم کو کمزور دیکھتا ہوں۔ یعنی تعلقات کی برداشت نہ ہوگی۔ یہ ابوبکرؓ و عمرؓ کا ہی جگر تھا کہ مدینہ طیبہ میں چٹائی پر بیٹھے ہیں۔ اور روم و شام و دمشق و فارس کا انتظام کر رہے ہیں۔ غرض انبیاء اور صحابہ اور

---

۱ صرف دین کے لئے ۲ یعنی اگر میں ان حالات میں ہوں جن میں تم ہو تو اپنے لئے یہ پسند کرتا ہوں۔

اولیاء اللہ میں بھی ہر ایک کا جدا رنگ ہے اور ان کے لئے وہی رنگ مناسب ہے۔ بعضے روپیہ پیسے سے اس لئے گھبراتے ہیں کہ میاں کون جھگڑے میں پڑے۔ ہم سے حقوق ادا نہ ہوں گے زکوٰۃ عشر، قربانی وغیرہ وغیرہ سینکڑوں حقوق ہیں یہ بڑا قصہ ہے۔ ایسے لوگوں کے ساتھ یہ برتاؤ ہوتا ہے کہ ان کو کچھ نہیں دیتے۔ اور ہمیشہ وہ مفلس رہتے ہیں۔ جیسے حضرت ابراہیم ادھم رح کہ سلطنت چھوڑ دی۔ اور جیسے حضرت شاہ ابوالمعالی قدس سرہ کہ ہمیشہ فقر وفاقہ میں گذرتی تھی۔

ایک روز کا قصہ ہے کہ حضرت شاہ صاحب کے یہاں ان کے پیر ومرشد تشریف لائے۔ حضرت مکان پر تشریف نہ رکھتے تھے بی بی تھیں انہوں نے تعظیم وتکریم سے پیر کو ٹھہرایا لیکن حسب عادت حضرت شاہ صاحب کے یہاں اس روز بھی کچھ کھانے پینے کو نہ تھا۔ بی بی نے پڑوس میں سے آٹا ادھار مانگنے کے لئے خادمہ کو بھیجا۔ پڑوسیوں نے ادھار بھی نہ دیا کہ ان کو ادھار دے کر کہاں سے لیں گے۔ پیر صاحب خادمہ کو بار بار آتا جاتا دیکھ کر فراستؔ سے سمجھ گئے پوچھا کہ کس فکر میں ہو۔ بی بی نے سمجھا کہ ان سے کیا چھپانا۔ واقعی یہ حضرات خدا کے نائب ہوتے ہیں۔ ان

لہ مومن کی دانائی جو نورِ خداوندی سے حاصل ہوتی ہے۔

سے اپنا کوئی حال چھپانا نہ چاہیئے۔ بی بی نے صاف کہہ دیا کہ حضرت آج ہمارے یہاں کچھ نہیں ہے۔ پیر صاحب نے ایک روپیہ عطا فرمایا۔ آج کل کے پیر تو مریدوں کا ہی کھا جاتے ہیں کچھ خیال نہیں کرتے۔ کہ ان کے یہاں کہاں سے آیا ہے اور کس طرح بیچارے لائے ہیں۔ القصہ پیر صاحب نے فرمایا کہ اس ایک روپیہ کا اناج لاؤ اور ہمارے پاس لانا۔ چنانچہ غلہ حضرت پیرو مرشد کے پاس لایا گیا۔ حضرت نے ایک تعویذ لکھ کر غلہ میں دبا دیا۔ اور یہ فرمایا کہ اس تعویذ کو مت نکالنا۔ پیر صاحب تو رخصت ہوئے۔ اب روزمرہ اس میں سے غلہ نکالا جاتا تھا اور وہ کم نہ ہوتا تھا۔ کئی روز ہو گئے کہ صبح شام کھانا آنے لگا۔ یہ دیکھ کر حضرت شاہ ابو المعالیؒ نے فرمایا کہ نائیں یہ کیا بات ہے کئی روز ہوئے فقر و فاقہ نہیں ہے۔ بی بی نے فرمایا کہ پیر صاحب تعویذ دے گئے تھے۔ اس کی برکت ہے۔ فرمایا کہ ہمارا فاقہ اختیاری ہے۔ اضطراری نہیں ہے اب یہ مقام بڑی کشاکشی تھا کہ پیر کا تعویذ اگر رکھا جائے تو اپنے مذاق کے خلاف اور اگر نہ رکھیں تو پیر کے تعویذ کی بے ادبی، مگر سبحان اللہ ان حضرات کو حق تعالےٰ ایسا نورِ باطن عطا فرماتے ہیں کہ ان کا فہم نہایت صحیح اور عقل ان کی کامل ہو جاتی ہے فرمایا کہ اس تعویذ کا حق دار تو میرا سر ہے مٹکا نہیں ہے لاؤ وہ تعویذ میں اپنے سر میں رکھونگا۔ تعویذ منگا کر سر میں رکھ لیا اور اناج فقراء کو تقسیم کر دیا۔ شام کو

پھر فقر و فاقہ ہوا شکر حق تعالےٰ کا ادا کیا۔ اور بعضوں کو جانتے ہیں کہ اگر نہ ملے گا تو پریشان ہوں گے اور یا جانتے ہیں کہ ان سے بردا شت حقوق کی ہوگی ان کو خوب دیتے ہیں۔ غرض اولیاء اللہ کے مختلف طبقات ہیں مگر جس حال میں ہیں خوش ہیں ؎

بدرد و صاف ترا حکم نیست دم درکش[1] | کہ انچہ ساقی ما ریخت عین الطاف ست

اور کہتے ہیں ؎

تو بندگی چو گدایاں بشرط مزد مکن[2] | کہ خواجہ خود روش بندہ پروری داند

قبض کی حالت میں فرماتے ہیں ؎

باغباں گر پنج روزے صحبت گل بایدش[3] | بر جفائے خار ہجراں صبر بلبل بایدش

اے دل اندر بند زلفش از پریشانی منال[4] | مرغ زیرک چوں بدام افتد تحمل بایدش

اور اس سے زیادہ فرماتے ہیں ؎

---

[1] گاد کے اور صاف کے دیکھنے کا تم کو حکم نہیں بس پی جاؤ۔ کیونکہ ہمارے ساقی نے جو کچھ ہمارے پیالہ میں ڈال دیا ہے۔ کرم ہی کرم ہے ہم کس قابل تھے۔

[2] تم غریبوں کی طرح مزدوری کی شرط پر بندگی مت کرو۔ کیونکہ ہمارا آقا تو غلام کی پرورش کرنا خود جانتا ہے [3] باغ والے کو اگر چند روز پھولوں کی صحبت درکار ہے تو فراق کے کانٹوں کی تکلیف پر بلبل کا سا صبر بھی چاہیئے۔

[4] اے دل اسکی زلفوں کی قید میں پریشانی سے نہ گھبرا۔ اچھا جانور جب قید میں پھنس جاتا ہے اس کو تحمل بھی کرنا چاہیئے۔

فراقؔ و وصل چہ باشد رضائے دوست طلب ؎ کہ حیف باشد از و غیر او تمنائے

اب میں پوچھتا ہوں کہ جس کا یہ حال ہو اس کو کیا پریشانی ہوگی وہ تو ہر وقت مسرور رہے ۔ ہر وقت خوش ہے ۔ حیات طیبہ یہ ہے اور اس کے ماسوا پریشانی ہے ۔ اور بے حالی ہے لیکن ؎

ایںؔ سعادت بزور بازو نیست ؎ تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

حیات طیبہ اور درجہ ولایت حاصل ہونے کا نہایت سہل طریقہ

مگر ہاں کوئی یہ نہ سمجھے کہ یہ مرتبہ کس کو حاصل ہوسکتا ہے ہم لوگ تو دنیا دار ہیں سینکڑوں طرح کے اشتغال ہمارے ساتھ لگے ہوئے ہیں ۔ سو یہ خیال شیطانی ہے اور منشاء اس کا یہ ہے کہ یہ سمجھتے ہیں کہ تمام کاروبار دنیا کے چھوڑ کر حجرے میں بیٹھ کر تسبیح ہلاؤ ۔ ہرگز نہیں ۔ ہر شخص کے لئے جداگانہ طریق ہے ۔ اگر اس مقام پر ہر ایک کی تفصیل بیان کی جاوے تو ایک وقت طویل درکار ہے اور پھر بھی کافی نہیں اس لئے کہ یہ کیسے معلوم ہو

ؔ ہجر و وصل کیا چیز ہوتی ہے ۔ بس محبوب کی مرضی تلاش کرو کیونکہ اس سے اس کے سوا کی تمنا کرنا افسوسناک بات ہے ؔ بے شک بختی بازو کے زور سے نہیں ہوسکتی جب تک بخشنے والا خدا ہی نہ بخشے ۔

سکتا ہے کہ میرے لئے کون سا طریق نافع ہے اس بیٹے میں تم کو ایک مختصر سی بات بتلاتا ہوں اور جھگڑے کی بات بالکل نہیں بتاتا وہ یہ کہ مرشد کامل[1] کے ہاتھ میں ہاتھ دے کر بے فکر ہو جاؤ اور لم و کیف[2] کو چھوڑ دو۔ اپنے کو اس کے سپرد کر دو اور اپنی رائے کو ہرگز دخل نہ دو۔ جو وہ طریق بتائے اس پر عمل کرو۔ انشاء اللہ تعالےٰ کامیاب ہو گے۔ ؎

بود مورے ہوسے داشت کہ در کعبہ رسد
دست بر پائے کبوتر زد و ناگاہ رسید

یعنی ایک چیونٹی کو ہوس ہوئی کہ خانہ کعبہ میں پہنچے لیکن اپنے ضعف و عجز کو دیکھ کر مایوس تھی۔ اس نے دیکھا کہ ایک کبوتر کبوتران حرم محترم سے بیٹھا ہے۔ وہ چیونٹی اس کے پاؤں کو لپٹ گئی۔ اس نے ایک پرواز کی اور بیت اللہ شریف میں جا پہنچا۔ چیونٹی نے جو آنکھ کھولی تو دیکھا کہ خانہ کعبہ سامنے ہے تو صاحبو اسی طرح ہم اگرچہ ضعیف ہیں لیکن اہل اللہ کا دامن اگر پکڑ لیں گے۔ تو انشاء اللہ تعالےٰ محروم نہ رہیں گے۔ اسی واسطے تو فرمایا ہے۔ کُوْنُوْا مَعَ الصَّادِقِیْنَ[3]۔

---

[1] صحیح اور کامل پیر [2] کیوں اور کیسے کہنے کو علت و مصلحت پوچھنے کو
[3] سچوں کے ساتھ ہو جاؤ۔

عاقل کا ہر کام یا تو تحصیل[1] منفعت کے لئے ہے یا دفع[2] مضرت کے لئے

قاعدہ عقلیہ ہے کہ آدمی جو کام کرتا ہے اس سے دو چیزوں میں سے ایک شے مقصود ہوتی ہے یا تو دفع مضرت یا جلب منفعت مثلاً کھانا کھاتا ہے لذت[3] و تغذی کے لئے یہ طلب منفعت ہے۔ دوا پیتا ہے دفع مرض کے واسطے یہ مضرت کا دفع ہوا۔ اور مثلاً نوکری کرتا ہے روپیہ کی تحصیل کے لئے۔ تجارت کرتا ہے منفعت و فائدہ کے واسطے۔ رشوت دیتا ہے تاکہ کسی قسم کی مضرت نہ ہو جائے یا کسی بلا میں مبتلا ہے اس سے رہا ہو جاوے۔ مکان بناتا ہے سردی و گرمی سے بچنے کے واسطے۔ خلاصہ یہ ہے کہ یہ امر بالکل ظاہر اور بدیہی ہے کہ جو کچھ انسان کرتا ہے جلب منفعت کے لئے کرتا ہے یا دفع مضرت کے لئے اس میں کسی عاقل کو کلام نہیں اور نہ اس پر براہین و دلائل قائم کرنے کی ضرورت ہے البتہ منفعت و مضرت کی تعین میں اہل الرائے و اہل ملت میں اختلاف ہے باقی نفس مسئلہ میں اتفاق ہے چنانچہ اول واضح ہو چکا۔

---

[1] فائدہ حاصل کرنے کے لئے [2] تکلیف و نقصان دور کرنے کے لئے [3] مزہ و غذا۔

ہے ۔ تعین میں البتہ بہت بڑا اختلاف ہے۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ منفعت کی تحصیل تو ہر ایک کا مقصود ہے لیکن منفعت کی تعین میں ہر ایک نے ایک رائے قائم کر رکھی ہے۔ ایک شخص ساعی[1] ہے کہ مجھ کو مثلاً تحصیلداری یا تھانہ داری یا ڈپٹی کلکٹری وغیرہا مثلاً علی حسب اختلاف المقاصد[2] مل جاوے کہ اس میں میری عزت و آبرو ہے۔ دوسرا ساعی ہے کہ مجھ کو نہ ملے کہ غریبوں پر ظلم ہوگا چنانچہ بعضوں پر زور دیا جاتا ہے کہ حکومت قبول کر و اور وہ نہیں کرتے۔ ایک وہ لوگ ہیں جنہوں نے سلطنت کے لئے ہزاروں جانیں ضائع کر دیں اور ایک وہ تھے کہ بھاگتے تھے۔ وجہ اس کی یہی ہے کہ کوئی اس کو منفعت سمجھا اس کی تحصیل کے لئے سعی کی اور دوسرے نے اس کو مضرت خیال کیا اس لئے اس کے دفع میں کوشش کی اور جس قدر اختلافات عالم میں ہیں سب کی وجہ یہی ہے کہ ایک شخص ایک امر کو منفعت و مستحسن سمجھتا ہے اس کو اختیار کر لیتا ہے اس کی تحصیل کے درپے ہوتا ہے۔ دوسرا اسی کو مضرت سمجھتا ہے اس لئے اس سے بچنے کی کوشش کرتا ہے چنانچہ اختلاف مذاہب کی یہی وجہ ہے۔

---

[1] کوشش کرنے والا

[2] اپنے اپنے الگ الگ مقصدوں کے موافق ۔

کون سی منفعت قابل تحصیل ہے اور کون سی مضرت قابلِ دفع ہے

اس وقت قابل غور امر یہ ہے کہ اس کا فیصلہ ہونا ضرور ہے کہ آیا کون منفعت واقع میں قابل تحصیل کے لئے ہے کون مضرت قابل دفع کے لئے ہے تو بعد تامل یہ سمجھ میں آتا ہے کہ منفعت وہ لائق تحصیل کے لئے ہے جس میں دو صفتیں ہوں۔ ایک تو یہ کہ وہ منفعت زیادہ باقی رہنے والی ہو۔ دوسرے یہ کہ خالص ہو یعنی شوب[1] ضرر نہ ہو دیکھیے اگر کوئی منفعت چار سال رہنے والی ہو اور دوسری آٹھ سال تو ہر عاقل دوسری ہی پسند کرے گا اور اسی کو اختیار کرے گا مثلاً دو مکان ہوں ایک بڑا عالیشان اور خوب صورت ہو اور دوسرا چھوٹا۔ اور بدصورت ہو اور وہ مکان کسی شخص کے سامنے پیش کئے گئے لیکن یہ کہا گیا کہ بڑا مکان چار یا پانچ روز کے بعد خالی کرا لیا جاوے گا اور چھوٹا کبھی خالی نہ کرایا جاوے گا۔ تو ظاہر ہے کہ ہر عاقل اس چھوٹے ہی مکان کو پسند کرے گا۔ اور اگر یہ کہہ دیا جاوے گا کہ مثلاً بعد نسلاً ہم کو دے دیا جاوے گا تو ضرور ہی پسند

---

[1] مضرت سے ملی ہوئی

کرے گا معلوم ہوا کہ منفعت جس قدر باقی رہنے والی ہوگی اسی قدر زیادہ اعتبار کے قابل[1] ہوگی۔ اسی طرح اگر وہ مکان عالیشان باوجود اپنی خوبصورتی کے کسی ضرر پر مشتمل ہو مثلاً ہمسایہ اچھا نہ ہو یا اور کوئی مضرت کا احتمال ہو اور اس چھوٹے مکان میں یہ اندیشہ نہ ہو تو ظاہر ہے کہ وہ چھوٹا ہی مکان پسند ہوگا۔ پس یہ قاعدہ ثابت ہوا کہ منفعت وہ قابل تحصیل کے ہے جو مضرت سے خالی ہو۔ اسی طرح مضرت بھی وہ زیادہ قابل اہتمام[2] کے ہوتی ہے جو زیادہ باقی رہنے والی ہو اور اس میں کل[3] اور وجوہ مضرت ہی ہو اور کوئی شائبہ اس میں منفعت کا نہ ہو دیکھو اگر اثناء سفر میں آدمی کسی مکان میں ایک دو شب کے لئے قیام کرتا ہے اور وہاں کوئی ناگوار امر پیش آتا ہے تو اس کے دفع میں زیادہ اہتمام اور فکر نہیں کرتا بخلاف اس کے کہ وطن اصلی میں کوئی امر پیش آجاوے تو اس کے دور کرنے کی فکر ہوتی ہے اس لئے کہ وہاں ہمیشہ رہنا ہے اور مثلاً اگر کہا جاوے کہ اگر تم چار دن کے لئے دھوپ میں سفر کر لو تو تم کو عمر بھر راحت ملے گی یا اگر چار ماہ راحت سے رہو گے تو عمر بھر جیل خانہ میں رہو گے تو ظاہر ہے کہ ہر عاقل اس چار روز کے سفر کی مشقت کو گوارا کر لے گا اور دوسری صورت کو پسند نہ کرے گا معلوم ہوا کہ مضرت باقیہ[4] و

---

[1] چاہے چھوٹی ہو [2] دور کرنے کے اہتمام کی [3] ہر طریقہ سے [4] مدت تک رہنے والی تکلیف یا نقصان اور خالص کہ نفع و راحت کی کوئی شکل اس میں نہ ہو۔

خالصہ زیادہ فکر کے قابل ہے اور مضرت فانیہ زیادہ قابل التفات نہیں ہے۔ پس منفعت و مضرت دونوں کی دو قسمیں ہوئیں منفعت[1] باقیہ خالصہ منفعت[2] فانیہ غیر خالصہ و مضرت[3] فانیہ باقیہ خالصہ مضرت[4] فانیہ غیر خالصہ اس کے بعد معلوم کرنا چاہیئے کہ دنیا کی منفعت و مضرت تو ہر شخص کے پیش نظر ہے۔ ہم کو اللہ و رسول نے ایک اور منفعت و مضرت کی بھی خبر دی ہے جو مرنے کے بعد واقع ہونے والی ہے۔

اب محل کے اعتبار سے منفعت و مضرت کی دو دو قسمیں اور نکلیں منفعت دنیویہ اور منفعت اخرویہ، مضرت دنیویہ مضرت اخرویہ۔

نعمائے[5] آخرت اور نعمائے دنیا اور مضرت آخرت اور مضرت دنیا کا باہمی تفاوت

اب ہم کو یہ دیکھنا چاہیئے کہ یہ چار قسمیں اخیر کی یعنی منفعت دنیویہ

---

[1] ہمیشہ رہنے والا فائدہ دار اور خالص جس میں ذرا بھی کلفت و نقصان نہ ہو۔
[2] فنا ہو جانے والا فائدہ جو کلفت و نقصان سے خالی نہ ہو۔
[3] ہمیشہ رہنے والی تکلیف یا نقصان اور خالص جس میں کوئی فائدہ نہ ہو۔
[4] فناہ ہو جانے والی تکلیف یا نقصان مگر کچھ فائدہ بھی ہو خالی نہ ہو۔
[5] آخرت کی نعمتیں

واُخرویہ[1] مضرت دنیویہ[2] واُخرویہ۔ پہلی اقسام کی کس قسم میں داخل ہیں۔ یعنی غور کرنا چاہیئے کہ منفعت دنیویہ آیا منفعت باقیہ خالصہ ہے یا فانیہ غیر خالصہ اسی طرح مضرت دنیویہ کو بھی دیکھنا چاہیئے اور منفعت اخرویہ و مضرت اخرویہ کو بھی دیکھنا چاہیئے۔ یعنی یہ کہ کون سی منفعت اور مضرت کس قسم میں داخل ہے۔ سو دیکھ لیجیئے کہ دنیا کی منفعت تو فانیہ اور آخرۃ کی باقیہ ہے اور آخرت کی مضرت باقی رہنے والی ہے اور دنیا کی مضرت فنا ہونے والی ہے۔ اسی طرح دوسرے اعتبار سے دیکھیئے کہ دُنیا کی منفعت کیسی ہی اعلیٰ درجہ کی ہو مگر خالص نہیں۔ مثلاً کھانا ہی لے لیجیئے اول تو حاصل کس کلفت سے ہوتا ہے کہ اول زمین کو درست کیا جاتا ہے اس کیلئے بیل و آلات زراعت مہیا کرنے ہوتے ہیں۔ اس کے بعد بوتے ہیں پانی دیتے ہیں۔ حفاظت کرتے ہیں کاٹتے ہیں۔ گاہتے ہیں اڑاتے ہیں۔ پیستے ہیں پکاتے ہیں اس قدر کلفتوں کے بعد جب اس سے عین انتفاع[3] کا وقت ہوتا ہے کہ اس وقت بظاہر تمام کلفتیں ختم ہو جاتی ہیں اور التذاذ[4] ہی کا وقت ہوتا ہے۔ لیکن اس وقت بھی اکثر اوقات کوئی نہ کوئی کلفت پیش آجاتی

---

[4] مزا حاصل کرنے کا۔

ہے کہ وہ کلفت التذاذ میں سدِ راہ ہو جاتی ہے، مثلاً روٹی کا ٹکڑا گلے میں اٹک گیا۔ کھانا کھانے بیٹھے کسی عزیز کے مرنے کی خبر آ گئی یا اور فکر میں ڈالنے والی کوئی بات سن لی کہ سب کھانا پکا پکایا بے لطف ہو گیا یا یہ کہ وہ کھانا ہضم نہیں ہوا قبض ہو گیا۔ یا دست آنے لگے۔ سلاطین و امراء کے عیش سے زیادہ کسی کا عیش نہیں ہے لیکن ان کو سب سے زیادہ پریشانیاں ہیں۔ اولاد کو دیکھ لیجئے کہ بڑی بڑی تمناؤں کے بعد پیدا ہوتی ہے۔ انواع انواع کی تکالیف اُٹھا کر ان کی پرورش کرتے ہیں۔ پھر اکثر اولاد خلافِ مزاج ہوتی ہے۔ والدین کو سینکڑوں طرح کی ان سے تکالیف پہنچتی ہیں۔ غرض دنیا کی جس منفعت کو دیکھو گے خالص نظر نہ آوے گی اور اپنے مقصد کے موافق نہ ہو گی۔ حق تعالیٰ خود فرماتے ہیں اَمْ لِلْاِنْسَانِ مَا تَمَنّٰى فَلِلّٰهِ الْاٰخِرَةُ وَالْاُوْلٰى۔ کیا انسان کے لئے جو جو تمنا کرے وہ حاصل ہوتی ہے (یعنی نہیں) پس آخرت اور دنیا سب اللہ کے اختیار میں ہے۔ لیکن اس پر کوئی شبہ نہ کرے کہ لِلّٰهِ الْاٰخِرَةُ وَالْاُوْلٰى سے تو یہ معلوم ہوا کہ جیسے دُنیا ہمارے اختیار میں نہیں ہے۔ اسی طرح آخرت بھی نہیں ہے پھر فرق کیا ہوا بلکہ نہ وہ قابل تحصیل ہوئی نہ یہ ہوئی تو جو اس تقریر سے تمہارا مقصود ہے کہ دنیا سے بے رغبتی اور آخرۃ کی رغبت دلانا وہ حاصل نہ ہوا۔

جواب یہ ہے کہ دوسرے مقام پر حق تعالےٰ فرماتے ہیں مَنْ کَانَ یُرِیْدُ الْعَاجِلَۃَ عَجَّلْنَا لَہٗ فِیْھَا مَا نَشَآءُ لِمَنْ نُّرِیْدُ ثُمَّ جَعَلْنَا لَہٗ جَھَنَّمَ یَصْلٰھَا مَذْمُوْمًا مَّدْحُوْرًا ۔ وَمَنْ اَرَادَ الْاٰخِرَۃَ وَسَعٰی لَھَا سَعْیَھَا وَھُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِکَ کَانَ سَعْیُھُمْ مَّشْکُوْرًا ۔ یعنی جو شخص صرف دنیا طلب کرے تو دنیا میں جو ہم چاہیں گے جس کو چاہیں گے وہ دیں گے ۔ پھر اس کے لیے ہم جہنم تجویز کریں گے ۔ اس میں داخل ہو گا اس حالت میں کہ مذموم و مردود ہو گا اور جو شخص آخرت چاہے گا اور اس کے لئے پوری سعی کرے اور وہ مومن بھی ہو پس ان لوگوں کی سعی کی قدر کی جاوے گی دیکھیے دنیا کی نسبت تو یہ فرمایا کہ ہم جس کو چاہیں گے اور جتنی چاہیں گے دیں گے اور آخرت کی نسبت فرمایا کہ جو اس کے لئے سعی کرے گا اس کی سعی کی قدر کی جاوے گی۔ یعنی اس کا بدلہ ملے گا۔ دونوں جگہ قضیہ[لہ] شرطیہ ہے مگر دوسری جگہ کامیابی کا وعدہ ہے اور پہلی صورت میں نہیں ہے ۔ پس حاصل یہ ہوا کہ اختیار میں تو خدا ہی کے ہے دنیا بھی آخرت بھی مگر آخرت کی سعی پر آخرت دینے کا وعدہ ہے اس لئے وہ قابل تحصیل ہوئی بخلاف دنیا کے بہرحال آیت اَمْ لِلْاِنْسَانِ مَا تَمَنّٰی الخ سے جو شبہ ہوا تھا وہ مرتفع ہو گیا۔ اب ہم لوگوں نے برعکس معاملہ اختیار کیا ہے کہ

لہ شرط و جزا والا جملہ

* کہ ہم جسکو چاہینگے اور جتنی چاہینگے دینگے اور آخرت کی نسبت فرمایا

جس کا (یعنی دنیا) وعدہ نہیں ہے[1] اور اس کو اپنی مشیت پر رکھا ہے۔ اس کی طلب میں تو منہمک ہیں اور نیز اس کے اسباب تحصیل (نوکری، تجارت، زراعت وغیرہا) کی نسبت تو ایسا معاملہ کرتے ہیں گویا ان کے نزدیک مسبب[2] ان پر ضرور مرتب ہوگا۔ اور جس کا وعدہ ہے (یعنی آخرت) اس کے اسباب (صلوٰۃ، صوم، حج، زکوٰۃ وغیرہا من المامورات) کی طرف مطلق التفات نہیں ؎

ببیں[3] تفاوت رہ از کجاست تا بکجا

خلاصہ یہ کہ دنیا کی ہر منفعت کے اندر کدورت ہے۔ بخلاف آخرت کے منفعت کے کہ جس کو حق تعالیٰ اپنی رضامندی کے ساتھ جنت نصیب فرما دے۔ وہاں اس کو کوئی آزار نہیں۔ فرماتے ہیں وَ فِيهَا مَا تَشْتَهِيهِ الْأَنْفُسُ یعنی تمہارے لئے جنت میں وہ شے ملے گی جس کو تمہارا جی چاہے گا۔ دوسری جگہ فرماتے ہیں لَا يَمَسُّنَا فِيهَا نَصَبٌ وَّلَا يَمَسُّنَا فِيهَا لُغُوبٌ یعنی ہم کو جنت میں نہ تعب لگے گا اور نہ اس میں تکان ہوگا۔

---

[1] ارادہ [2] یعنی جن کے یہ سبب ذریعے ہیں وہ باتیں ان سے ضرور ہی حاصل ہو جائیں گی [3] اور حکم کی ہوئی چیزیں [4] دیکھو راستہ کا کہاں سے کہاں تک کا فرق ہے

اہل جنت میں باوجود تفاوت درجات حسد نہ ہوگا

اگر کوئی کہے کہ دنیا میں ہم دیکھتے ہیں کہ اگر ایک کے پاس دنیا کا سامان مال اولاد مکان گھوڑے جوڑے وغیرہ بہت ہوتا ہے تو دوسرا دیکھ کر اس کو حسد کرتا ہے اور حسد کی آگ سے جلتا ہے تو یہ مسلمہ ہے کہ جنت میں سب نعمتیں ہوں گی لیکن اختلاف درجات کی وجہ سے شاید آپس میں حسد ہو تو یہ بھی ایک قسم کی تکلیف اور کدورت ہے۔ جواب یہ ہے کہ وہاں پر حسد نہ ہوگا۔ ہر شخص اپنے حال اور نعمتوں میں بے حد خوش ہوگا اور کوئی یہ شبہ نکرے کہ دو حال سے خالی نہیں یا تو دوسروں کو اپنے سے افضل سمجھے گا یا نہیں اگر افضل جانے گا تو حسد ہوگا اور اگر نہ جانے گا تو جہل لازم آئے گا جواب یہ ہے کہ ہم اس شق کو اختیار کرتے ہیں کہ وہ افضل کو اپنے سے افضل جانیگا لیکن وہ ان کے درجات کی تمنا نہ کرے گا۔ اس لئے کہ اپنی استعداد اس کو معلوم ہوگی اور اپنے اعمال اس کو پیش نظر ہوں گے اور تفاوت درجات وہاں تفاوت اعمال سے ہونگے اس لئے اس کو معلوم ہوگا کہ اس سے زیادہ درجہ مجھ کو

نہیں مل سکتا۔[1] اس لئے وہ اسی میں خوش ہوگا نہ کسی پر اس کو حسد ہوگا اور نہ زیادہ کا متمنی ہوگا۔ دوسرا جواب اس سے باریک ہے وہ یہ کہ وہاں سب عبد کامل ہوں گے تمام مقامات باطنی حاصل ہوں گے اور مقامات میں سے رضا بھی ہے۔ اس لئے مقام رضا بھی اس کو حاصل ہوگا اور وہ اس میں اس قدر خوش ہوگا کہ درجات فاضلہ کی اس کے قلب میں تمنا نہ ہوگی جیسا کہ دنیا میں دیکھا جاتا ہے کہ بعض طبائع میں قناعت کا مضمون ایسا راسخ ہے کہ ان کے قلب میں ترقی دنیا نہ ہونا کیا معنی بلکہ اس سے نفرت ہے ایک پولیس کے اہلکار دیکھے گئے کہ ان کے افسر کوشش کرتے ہیں کہ ان کی ترقی کریں مگر وہ منظور نہیں کرتے۔ اور ان کے ہم چشم ان کو ہنستے ہیں۔ بات یہ ہے کہ طبائع کا مذاق مختلف ہے۔ جبکہ دنیا میں اس کا نمونہ موجود ہے آخرت میں تو کیا بعید ہے۔ ہاں ایک شبہ رہا وہ یہ کہ حدیثوں میں آتا ہے کہ جنتی آپس میں ملیں گے اور ایک جنتی دوسرے کو دیکھ کر تمنا کرے گا کہ جیسا لباس اس کا ہے ایسا ہی میرا بھی ہو چنانچہ فوراً اسی طرح کا اس کا لباس ہو جائے گا اس سے معلوم ہوا کہ تمنا کرے گا۔ جواب یہ ہے کہ یہ تمنا صرف لباس کے بارے میں آئی ہے درجہ کے بارہ میں نہیں ہے

---

[1] اور چونکہ یہ بھی معلوم ہوگا کہ دوسرے کو جو کچھ ملا ہے وہ بھی اسکے عملوں کی بدولت ہی ہے تو اگر یہ خیال آسکیگا تو اپنی کم عملی پر حسرت ہوگی نہ کہ دوسرے پر حسد

اور لباس کے اندر مساوات ہونے سے درجہ کی مساوات یا فضیلت لازم نہیں۔ کما ھو الظاہر جدا گانہ جس میں فرق رہنا ضروری ہے یعنی درجہ اس کی تو تمنا نہ ہوگی اور جس کی تمنا ہوگی یعنی لباس اس میں فرق ہونا ضروری نہیں پس حسد کی کوئی گنجائش نہیں۔

عود بجانب سُرخی سابق یعنی نعمائے آخرت اور نعمائے دُنیا اور مضرت آخرت اور مضرت دُنیا کا باہمی تفاوت

حاصل یہ کہ جنت کی نعمتیں سب خالص ہوں گی کدورت کا ان میں نام ونشان نہ ہوگا بخلاف نعمائے دنیا کے کہ ان سب میں کچھ نہ کچھ کدورت ضروری ہوتی ہے۔ اب مضرت دنیوی کو دیکھئے کہ مضرت دنیویہ خواہ کیسی ہی اشد ہو لیکن فنا ہونے والی ہے اگر کسی کو کوئی بیماری ہے اول تو دنیا ہی میں صحت ہو جاتی ہے ورنہ مر کر تو تمام مصائب کا خاتمہ ہو ہی جاتا ہے۔ اسی طرح اگر کوئی افلاس میں یا کسی اور طرح کے رنج وغم وفکر میں مبتلا ہوتا ہے سب ایک نہ ایک دن ختم ہو جاتے ہیں معلوم ہوا کہ مضرت دنیا کو بقا نہیں ہے۔ اسی طرح دوسرے اعتبار سے دیکھئے کہ مضرت دنیا خالص مضرت

لہ جیسے کہ یہ خوب ظاہر ہے۔

نہیں بلکہ تامل سے دیکھا جاوے تو اس میں سینکڑوں منفعتیں دنیا اور دین کی ہوتی ہیں۔ دنیا کی منفعت تو یہ کہ مثلاً ایک شخص کسی بیماری میں مبتلا رہتا ہے تو اگر یہ تندرست رہتا تو خدا جانے کیا کیا فساد کرتا اس کے سبب سے یہ بے آبرو ہوتا۔ جیل خانہ جاتا اور ظاہر ہے کہ عاقل کے لئے آبرو جان سے زیادہ عزیز ہے اور دین کی منفعت تو بہت ہی ظاہر ہے کہ بیماری ذنوب[1] کو محو کرتی ہے اور بہت سے منہیات[2] سے روکتی ہے۔ خلاصہ یہ کہ دنیا کی مضرت فنا ہونے والی بھی ہے اور من کل الوجوہ[3] مضرت نہیں ہے بخلاف مضرت اخرویہ کے کہ وہ مضرت ہی مضرت ہے۔ تمام مضرتیں وہاں علی وجہ الکمال[4] موجود ہیں۔ پس ثابت ہوا کہ منفعت دنیویہ فانی بھی ہے قلیل بھی ہے اور مشوب[5] بہ کلفت ہے اور اخروی منفعت باقی بھی ہے کثیر بھی ہے اور خالص بھی ہے۔ اسی طرح مضرت دنیا فانی ہے اور غیر خالص[6] اور اخروی مضرت باقی بھی ہے اور خالص ہے۔

---

[1] گناہوں کا کفارہ بن کر ان کو مٹا دیتی ہے۔

[2] ممنوع باتوں سے [3] ہر طریقہ سے [4] پورے طریق پر

[5] کلفت کے ساتھ ملی جلی [6] بلکہ دنیا کی ہلکی اور وہ بے انتہا شدید بھی ہے تو دنیا کا ہر فائدہ تینوں صفتوں میں کم اور بعید کم اور آخرت کا تینوں صفتوں میں بہت بڑھا ہوا ہے۔ اسلئے وہی مقصود ہونا عقل کا کام ہے اور دنیا کی ہر تکلیف و نقصان تین وجہ سے ہلکی اور آخرت کی تینوں وجہ سے بہت سخت اس لئے اس سے بچاؤ کی فکر ہی عقل کا کام ہو سکتا ہے۔

آخرت ہی کی منفعت قابل تحصیل ہے، اور آخرت ہی کی مضرت قابل اجتناب ہے، اور دنیا کی نہ منفعت قابل تحصیل ہے نہ اس کی مضرت قابل اجتناب

اب روزِ روشن کی طرح فیصلہ ہو گیا آپ خود موازنہ کر سکتے ہیں کہ حاصل کرنے کے قابل کونسی منفعت ہوئی۔ ظاہر ہے کہ مسلمان (جو کہ اللہ و رسول کو سچا جانتا ہے) اس سوال کا یہی جواب دے گا کہ منفعت اخرویہ تحصیل کے قابل ہے۔ اسی طرح دنیا اور آخرت کی مضرتوں میں موازنہ کر لیجئے کہ کون مضرت زیادہ بچنے کے قابل ہے۔ ظاہر ہے کہ دنیا کی مضرت آخرت کی مضرت کے مقابلہ میں اصلاً[1] قابل التفات نہیں، زیادہ اہتمام کے قابل آخرت کی مضرت ہے اس کے بعد یہ سمجھئے کہ آخرت کی منفعت کس طرح حاصل ہوتی ہے اور آخرت کے ضرر سے کس طریق سے بچ سکتے ہیں۔

[1] بالکل بھی یعنی گو بچنے کی چیز تو ہے مگر آخرت کے نقصان و تکلیف کے مقابل مثل نہ ہونے کے ہے سو روپیہ دیکر کوئی پھانسی سے بچتا ہو تو یہ دنیا راحت ہے نہ کہ کلفت۔

آخرت کی منفعت حاصل ہونے اور آخرت کی مضرت سے بچنے کا طریقہ

تو سمجھ لیجئے کہ آخرت کی منفعت جنت ہے اور اس کے حاصل کرنے کا طریق اعمال صالحہ ہیں اور آخرۃ کی مضرت دوزخ ہے اور اس سے بچنے کا طریق بد اعمالیوں سے بچنا ہے خلاصہ یہ کہ اعمال صالحہ کو اختیار کیا جاوے اور ذنوب سے بچا جاوے اور جو ہو چکے ہیں۔ ان سے توبہ کی جاوے۔ خلاصہ یہ کہ مقصود دو شئے ہیں اصلاح اعمال۔ محو ذنوب اور محو ذنوب کے معنے یہ ہیں کہ گذشتہ سے توبہ کی جاوے اور آئندہ سے بچنے کا عزم کیا جاوے۔

اعمال صالحہ لوگوں پر بہت گراں ہیں بالخصوص حج اور اس کے متعلق بعض اعتراض اور ان کے جواب

لیکن اعمال صالحہ کی تحصیل اور گناہ سے بچنا اوّل تو اکثر لوگوں پر

ہمیشہ ہی سے گراں اور ثقیل[1] ہے۔ پھر خصوصاً اس زمانہ میں تو اعمال صالحہ لوگوں پر بہت ہی بھاری ہیں چنانچہ بڑے ضروری اعمال۔ صلوٰۃ، صوم۔ حج، زکوٰۃ ہیں لیکن دیکھا جاتا ہے کہ سب کے اندر بیحد سستی کی جاتی ہے بلکہ مصیبت سمجھتے ہیں۔ یہاں تک کہ اخبار میں شائع ہوا تھا کہ نماز نے ترقی کو روک دیا ہے۔ کیونکہ یہ سنکر کہ مسلمان ہو کر پانچ وقت نماز پڑھنی پڑھے گی۔ اسلام سے بعضے آدمی رک جاتے ہیں۔ اس لئے اس کو اسلام سے خارج کر دیا جاوے نعوذ باللہ ان احمقوں سے کوئی پوچھے کہ جس اسلام میں نماز نہیں وہ اسلام کیا ہوا اس بیہودہ رائے سے معلوم ہوا کہ ان عقل پرستوں پر نماز بہت ہی بھاری ہے۔

حکایت۔ ہمارے مدرسہ دیوبند میں ایک طالب علم نو وارد آئے تھے منطقیوں کی صحبت میں بہت رہے۔ دین کی مطلق پرواہ نہ تھی۔ نماز کی پابندی نہ تھی۔ اور یہاں دیوبند میں نماز کا بڑا اہتمام ہے۔ پانچ وقت سب طلبہ پابندی کے ساتھ نماز پڑھتے ہیں تو جب نماز کا وقت آتا۔ ان کو بھی زبردستی لے جاتے ایک روز کہنے لگے کہ حضور معراج میں تشریف لے گئے تھے۔ وہاں پچاس نمازیں فرض ہوئی تھیں۔ پھر کم ہوتے ہوتے پانچ رہی تھیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ

---

[1] بھاری۔ اور یہ صرف اسی وقت تک ہے۔ جبتک کرتے نہیں بچہ پر چلنا پڑھنا لکھنا بہت بھاری ہوتا ہے مگر خوب کرتے کرتے بہت ہلکا اور مزیدار بن جاتا ہے۔

دیوبند میں پوری پچاس کی پچاس ہی باقی ہیں۔

معلوم ہوتا ہے کہ نماز ان کو سخت مصیبت معلوم ہوتی تھی۔ حق تعالےٰ بھی فرماتے ہیں اِنَّهَا لَكَبِيْرَةٌ اِلَّا عَلَى الْخٰشِعِيْنَ یعنی بیشک نماز بہت بھاری ہے مگر ان لوگوں پر جو خشوع کرنے والے ہیں۔ اسی واسطے میں تو نمازی کو ولی سمجھتا ہوں۔ حق تعالےٰ کا فضل ہی ہے کہ نماز پابندی کے ساتھ ادا ہوتی ہے۔

علیٰ ہذا روزہ کو بہت ثقیل سمجھتے ہیں۔ کانپور میں ایک شخص تھے انہوں نے کبھی روزہ ہی نہیں رکھا۔ میں نے ان سے کہا تو کہنے لگے کہ میں کسی طرح متحمل[1] ہی نہیں۔ میں نے کہا کہ امتحان کے لئے ایک تو رکھو۔ چنانچہ رکھا اور پورا ہوگیا۔ تب معلوم ہوا کہ یہ خیال کتنا غلط تھا کہ میں متحمل ہی نہیں۔

بعضے لوگ حج کا نام سُنکر وہاں کی بہت مذمت کرتے ہیں کہ وہاں بدو مار ڈالتے ہیں لُوٹ لیتے ہیں اور بعضے تو گئے بھی نہیں مگر اوروں سے سن سُنکر وہ بھی مذمت کیا کرتے ہیں۔ یہ سب کم ہمتی کی باتیں ہیں۔ میں[2] ان کو قسم دے کر پوچھتا ہوں کہ کیا ہندوستان میں ایسے واقعات نہیں ہوتے بلکہ اگر وہاں کے مجمع پر نظر کی جائے تو حق تو یہ ہے کہ جس قدر واقعات ہونا چاہیئے ان سے بہت کم ہوتے ہیں۔

---

[1] برداشت کر سکنے والا [2] اور آج کل تو سب سے زیادہ امن وہیں ہے۔

ہندوستان میں اگر اس کا عشر عشیر[1] بھی مجمع ہو جائے تو بہتیرے واقعات ہو جاتے ہیں۔ بلکہ بغیر مجمع کے بھی راستوں میں واقعات ہو جاتے ہیں۔ ہم یہ نہیں کہتے جیسا بعض کہتے ہیں کہ بدوؤں کو لوٹ مار حلال ہے۔ اس لئے کہ وہ دائی حلیمہ سعدیہ[2] کی اولاد ہیں۔ یہ تو بالکل لغو ہے۔ وہ اگر ایسا کرتے ہیں زیادہ گنہ گار ہوتے ہیں لیکن یہ ضرور کہیں گے کہ تم اس کو یاد رکھو کہ حج کا سفر سفر عشق ہے راہ عشق میں تو سب کچھ پیش آتا ہے بلکہ پیش نہ آنا عجیب ہے۔ دنیا کے محبوب سے ملنے کے لئے کیسی کیسی مصیبتیں پیش آتی ہیں مگر سب گوارا کرتے ہیں ؎

نسازد عشق را کنج سلامت[3] — خوشا رسوائی کوئی ملامت[4]

عشق مولیٰ کے کم از لیلےٰ بود[5] — گوئے گشتن بہر او اولےٰ بود

حکایت۔ ایک بزرگ ایسے باہمت تھے کہ انہوں نے ۴۴ حج کئے تھے ایک شخص مولوی منظور احمد صاحب بنگالی تھے۔ مدینہ

---

[1] دسواں حصہ [2] ایسے بزرگ خاندان کے لوگوں کے واسطے تو بعض وہ چیزیں بھی حلال نہیں رہتیں جو دوسروں کے لئے حلال ہوتی ہیں بلکہ ان کو گناہ بھی زیادہ ہوتا ہے [3] عشق کے واسطے سلامتی کا کونہ مناسب نہیں ہوتا۔ ملامت کے کوچہ کی [4] رسوائی ہی کیسی اچھی چیز ہے [5] خدا کا عشق لیلے کے عشق سے کب کم ہو سکتا ہے اس کے واسطے تو گیند کی طرح لڑھکنا ہی بہتر ہے۔

طیبہ میں رہتے تھے مگر ہر سال حج کیا کرتے تھے اور حج کر کے مدینہ طیبہ لوٹ جاتے تھے۔ حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ان کو دیکھ کر ایک بار یہ شعر پڑھا ؎

زہے[1] سعادت آں بندہ کہ کرد نزول
گہے بہ بیت خدا و گہے بہ بیت رسول

اور بعضے ایسے بھی ہیں کہ قریب بیت اللہ شریف کے رہتے ہیں اور ان کو اب تک بھی حاضری نصیب نہیں ہوئی۔ ایک صاحب فرماتے تھے کہ ایک بدوی بیس پچیس برس سے مکہ معظمہ آتا تھا۔ اس نے ایک دن پوچھا کہ یہ لوگ اطراف و جوانب سے اس کثرت سے یہاں کیوں آتے ہیں۔ اللہ اکبر اس کو اتنی بھی خبر نہیں کہ یہاں کیوں آتے ہیں۔

علی ہذا زکوٰۃ میں گرانی ہوتی ہے۔ چالیس ہزار میں سے جب ایک ہزار روپیہ نکلتا ہے تو گراں گزرتا ہے۔ حالانکہ چالیسواں حصہ بہت ہی کم ہے۔ امم[2] سابقہ پر چوتھائی حصہ مال کا فرض تھا۔ یہ حق تعالیٰ کا فضل ہے کہ چالیسواں حصہ ہی فرض کیا گیا۔ یہ بھی لوگوں پر بھاری ہے۔

---

[1] شاباش ہے اس بندہ کی نیک بختی پر جو کبھی خدا کے گھر پہنچے کبھی رسول ؐ کے گھر [2] پہلی اُمتوں پر ۔

حاصل یہ کہ جس قدر احکام شرعیہ ہیں سب کے اندر لوگوں کو گرانی ہوتی ہے اور جو احکام کرنے کے ہیں۔ ان میں گرانی ہو تو زیادہ تعجب نہیں ہے۔ جن امور سے منع کیا گیا ہے ان میں بھی گرانی ہوتی ہے حالانکہ ترک فعل[1] سے اسہل ہے۔ فعل میں تو ایک کام کا کرنا ہوتا ہے اور ترک میں کیا مشقت ہے بلکہ سہولت ہونا چاہیئے۔ دیکھئے ایک ادنےٰ سی شئے غیبت ہے کہ بجز مضرت کے اس میں اور کچھ نہیں اور گناہوں میں تو کچھ حظ یا نفع دنیوی بھی مرتکب[2] کے زعم میں ہوتا ہے اور اس میں تو کچھ بھی نہیں ہے لیکن ہم لوگوں سے یہ نہیں چھوٹتی غرض کہ احکام شرعیہ خواہ متعلق فعل کے ہوں یا ترک کے سب میں لوگوں کو گرانی ہوتی ہے اور جب ایک ایک فعل اور ایک ایک ترک بھی گراں ہے تو جبکہ پچاس عمل کرتے کے ہوں اور پچاس نہ کرنے کے جیسے احکام کی اب موجودہ حالت ہے تو سو مشقتیں ہوئیں سن کر جی گھبرا جاوے گا کہ میاں یہ تو بڑی مصیبت آپڑی کہ یہ کام کرو وہ نہ کرو۔ سخت اُلجھن اور دشواری ہے۔ کوئی میاں فلسفی بتلائے تو سہی کہ یہ معما کس طرح حل ہو اور یہ دُشوار کس طرح سہل ہو۔ اگر تمام فلاسفہ قدیم وجدید جمع ہو کر سوچیں تو ہرگز کوئی طریقہ ایسا نہیں نکال سکتے جس سے یہ پیچیدگی اور گل جھڑی کھلے اور

---

[1] ایک چیز کا چھوڑ دینا کرنے سے زیادہ آسان ہے [2] کرنے والے کے گمان میں نہ کہ واقع میں

اگر کوئی سوچ بچار کر کوئی طریقہ نکالے بھی تو وہ سہل نہ ہوگا۔

زبان کی درستی اور خدا تعالے کے خوف پیدا کر لینے سے پھر کوئی گرانی اعمال صالحہ میں نہیں رہتی

حق تعالے شانہ نے اپنے بندوں کی اس مشقت اور اس الجھن کو دفع کرنے کے لئے ایک طریقہ نہایت مختصر لفظوں میں ارشاد فرمایا ہے[1] یَا اَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰہَ وَ قُوْلُوْا قَوْلًا سَدِیْدًا یُّصْلِحْ لَکُمْ اَعْمَالَکُمْ وَ یَغْفِرْ لَکُمْ ذُنُوْبَکُمْ وَ مَنْ یُّطِعِ اللّٰہَ وَ رَسُوْلَہٗ فَقَدْ فَازَ فَوْزًا عَظِیْمًا ط اس آیۃ کریمہ میں اسی طریقہ کا بیان ہے یہ حاصل ہے اس تقریر کا اجمالاً اور تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ اول ثابت ہو چکا ہے کہ دو شے مقصود ہیں اعمال صالحہ کا حاصل کرنا اور محو ذنوب اور ان میں بھی گرانی اس کی سہولت کے لئے دو طریق ارشاد فرماتے ہیں کہ ان کو اختیار کر لو تو وہ دو چیزیں جو بڑی مشقت کی تھیں وہ آسان ہو جاویں گی۔ ان میں سے ایک اتقوا اللہ ہے اور دوسرے قولوا قولاً سدیدا ہے یعنی اللہ سے ڈرو

---

[1] اے ایمان والو اللہ سے ڈرو اور ٹھیک بات کہا کرو اللہ تعالیٰ تمہارے عمل نیک بنا دینگے اور تمہارے گناہ بخش دیں گے اور جو بھی اللہ رسول کی فرمانبرداری کر لیتا ہے وہ بڑی ہی کامیابی سے کامیاب ہو جاتا ہے۔

اور بات ٹھیک کہو۔ اس پر دو شے مرتب فرمائی ہیں یُصْلِحْ لَکُمْ اَعْمَالَکُمْ وَ یَغْفِرْ لَکُمْ ذُنُوْبَکُمْ یعنی اگر تم ان دو باتوں کو اختیار کر لوگے تو اللہ تعالےٰ تمہارے اعمال کی اصلاح فرما دیں گے اور تمہارے گناہ بخش دیں گے اور ان ہی میں تم کو گرانی تھی جس کا اوپر بیان ہوا۔ حاصل یہ کہ تقوےٰ جس کا ترجمہ خدا کا خوف ہے۔ فعل قلب کا ہے اور کہنا فعل زبان کا ہے۔ خلاصہ طریق کا یہ ہوا کہ دل اور زبان کو تم درست کر لو باقی سب کام ہم کر دیں گے۔ قلب ایک شے ہے اس کے متعلق صرف ایک شے بتلاتی ہے کچھ جھگڑے کی بات نہیں ہے۔ ایک نہایت مختصر کام فرمایا کہ اللہ تعالےٰ کا ڈر پیدا کر لو۔ جیسے کسی شخص سے کہا جاوے کہ یہ پچاس گاڑیاں ہیں۔ ان کو ایک دم سے چلاؤ اور وہ سخت پریشان ہو کہ میں کس طرح چلاؤں یہ تو سخت مشکل ہے۔ پھر اس کو ایک طریق بتلایا جاوے کہ اسی میں انجن[1] لگا دو۔ سب گاڑیاں خود بخود چل پڑیں گی۔ واللہ ایسی بے نظیر تعلیم ہے کہ کوئی حکیم کوئی فلسفی کوئی عاقل مثل نہیں لا سکتا اور کیوں نہ ہو یہ ایک مطب ہے ایسی ذات پاک کا جو انسان کے رگ پٹھوں کے ریشہ ریشہ سے واقف ہے اس لئے

---

[1] دل انجن ہے جس سے سب اعضا جڑے ہوئے ہیں خدا کا خوف اسکی اسٹیم ہے وہ آناً فاناً میں کھینچ لے جائے گا۔

اس کی حالت کو دیکھ کر علاج تجویز کیا ہے[+]

زبان کی درستی اور خدا تعالیٰ کے خوف کو اصلاح اعمال اور محو ذنوب میں کیا دخل ہے

اب دیکھنا چاہیئے کہ ان دونوں چیزوں کو اصلاح اعمال اور محو ذنوب میں دخل ہے یا نہیں تو بعد تامل یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ ہمارے افعال کی ترتیب یوں ہے کہ اول قلب سے ارادہ پیدا ہوتا ہے اس کے بعد صدور ہوتا ہے۔ گویا انجن قلب ہے تو اگر قلب درست ہوگیا تو سب کچھ درست ہو جائے گا بلکہ اگر غور سے دیکھا جاوے تو یہ دنیا کا سارا جہاز اور تمام بکھیڑے سب کے سب قلب ہی کے خیال پر چل رہے ہیں۔ یہ پہاڑ کی برابر عمارتیں یہ ہرے بھرے باغ یہ طرح طرح کے سامان سب کا انجن خیال ہی ہے۔ اسی واسطے تو حدیث[1] میں آیا ہے کہ اِنَّ فِی الْجَسَدِ مُضْغَةً اِذَا صَلَحَ صَلَحَ الْجَسَدُ کُلُّهٗ وَ اِذَا فَسَدَ فَسَدَ الْجَسَدُ کُلُّهٗ یعنی آدمی کے جسم میں گوشت کا ایک ٹکڑا ہے جب وہ درست ہوتا ہے تو تمام جسم درست ہو جاتا ہے اور جب وہ بگڑتا ہے تو تمام جسم

---

[1] بخاری

بگڑ جاتا ہے اور یہ مسئلہ طبی قاعدہ سے بھی درست ہے۔ اس لئے کہ امراض قلب تمام امراض میں بہت سخت ہیں۔ اگر قلب صحیح اور قوی ہے تو اور امراض کو طبیعت خود دفع کر دیتی ہے۔ اور اگر قلب میں ضعف اور مرض ہو تو اور جسد کتنا ہی قوی ہو سب بیکار ہے جب یہ بات ثابت ہو گئی کہ قلب کی درستی سے تمام اعمال کی درستی ہوتی ہے تو قلب کی درستی کس شے سے ہو؟ تو ہم دیکھتے ہیں کہ قلب کے بھی بہت سے اعمال ہیں تو اگر حق تعالےٰ تمام افعال کا حکم فرما دیتے یا اجمالاً یہ فرما دیتے کہ اپنے قلب کو درست کر دو تو اس صورت میں بھی نفس کو ایک مشقت ہوتی کہ قلب کو کس طرح درست کریں۔ کیا رحمت ہے کہ قلب کے تمام افعال میں صرف ایک مختصر سی بات فرمائی کہ صرف ہمارا خوف اختیار کر لو۔ باقی سب ہم درست کر دیں گے اور وجہ یہ ہے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ حاکم کا اگر ڈر دل میں بیٹھ جاتا ہے تو اس کی مخالفت پر جرأت نہیں ہوتی۔ اسی طرح اگر خدا تعالےٰ کا خوف کسی کے دل پر بیٹھ جائے تو اس سے گناہ نہ ہوں گے اور اعمال کی اصلاح ہو جاوے گی اور گذشتہ سے توبہ اور آئندہ کے لئے عزم ترک بھی کرے گا۔ یہ محو ذنوب ہوا۔ پس معلوم ہو گیا کہ تقوےٰ کو اصلاح اعمال اور محو ذنوب میں پورا دخل ہے اور تقوےٰ اصلاح اعمال کے لئے بمنزلہ علت[1] تامہ کے ہے۔

---

[1] وہ علت جس سے معلول ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔

خوف سے روکنے والی چیزوں کا بیان اور خدا تعالیٰ کے غفور رحیم ہونے کا مطلب

اب اس کے بعد سمجھنا چاہیئے کہ ہر شے کے لئے کچھ موانع ہوتے ہیں اور کچھ ذرائع اس کی تحصیل کے ہوتے ہیں۔ اسی طرح خوف کے لئے موانع کو بیان کیا جاتا ہے اور طریقہ تحصیل آخر میں بیان کیا جاویگا تو سمجھنا چاہیئے کہ خوف سے روکنے والی صرف دو چیزیں ہیں۔ اوّل تو عدم ایمان دوسرے تسویلِ[1] شیطانی۔ عدم ایمان تو ظاہر ہے۔ کہ بفضلہ تعالیٰ یہاں نہیں ہے۔ اس لئے اس کے متعلق تو کچھ کلام کرنا ضروری نہیں البتہ تسویلِ شیطانی میں ابتلائے عام ہو رہا ہے اس کو بیان کیا جاتا ہے کہ شیطان نے سب کو یہ پٹی پڑھا رکھی ہے کہ میاں جو کچھ کرنا ہے کر لو۔ اللہ تعالیٰ بڑا غفور رحیم ہے۔ اخیر میں توبہ کر لیں گے۔ سب بخش دیں گے۔ چنانچہ ارشاد بھی ہے[2] قُلْ یٰعِبَادِیَ الَّذِیْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓی اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ

---

[1] دھوکہ بازی۔

[2] آپ کہہ دیجئے اے میرے وہ بندو جنہوں نے اپنی ذاتوں پر زیادتی کر لی ہے تم اللہ کی رحمت سے ناامید مت ہو جاؤ (اس جملہ تک) بے شک وہ تو بہت بخشنے والے بڑے مہربان ہیں۔

اِلَیۡ اِنَّہٗ ھُوَ الۡغَفُوۡرُ الرَّحِیۡمُ۔ تو سن لیجئے کہ حق تعالیٰ بیشک غفور رحیم ہے لیکن غفور رحیم کے وہ معنی نہیں ہیں جو یہ لوگ سمجھتے ہیں بلکہ غفور رحیم کے معنی یہ ہیں کہ جو لوگ نافرمانیاں کر چکے ہیں اور نادم ہیں لیکن ان کو یہ تردد ہوتا ہے۔ کہ آئندہ کے لئے تو خیر یہ تدبیر ہے کہ گناہ نہ کریں لیکن گذشتہ کرتوت کی اصلاح کیسے ہو توان کے لیئے فرماتے ہیں کہ اللہ تعالےٰ گذشتہ گناہوں کو بخشنے والا ہے چنانچہ شانِ نزول میں اسی خیال کے جواب میں نازل ہونا اس آیت کا مصرحاً[۱] مذکور ہے۔ پس یہ آیت گناہان ماضی کے لیئے ہے نہ یہ کہ آئندہ کے لئے بھی گناہ کی اجازت دے رہے ہیں اب لوگ مستقبل کے لئے بھی اسی آیت کو اپنا متمسک[۲] بناتے ہیں۔ یہ سراسر غلطی ہے۔

توبہ اور گناہوں کی مثال

یاد رکھو کہ توبہ کی مثال مرہم کی سی ہے اور گناہ کی مثال آگ کی سی ہے مرہم تو اس لیئے ہے کہ اتفاق سے اگر جل جاوے تو مرہم لگا دیا جاوے۔ اس لئے نہیں ہے کہ اس اعتماد پر کہ ہمارے پاس مرہم ہے۔ آگ میں جھلسا کریں۔ جس شخص کے پاس نمک سلیمانی ہو اس کو

---

[۱] بیان تک [۲] صفائی سے [۳] دلیل۔

یہ کب روا ہے کہ جان جان کر بہت سا کھایا کرے۔ نمک سلیمانی تو اس واسطے ہے کہ اگر اتفاق سے بہت کھا جاوے تو نمک سلیمانی کھا لیا جاوے۔ اس سے ہضم ہو جاوے گا اور جو ایسا کریگا تو ایک روز جان سے ہاتھ دھوئے گا۔ اسی طرح جو شخص توبہ کے اعتماد پر گناہ کرتا رہے گا ایک دن عجب نہیں وہ ایمان سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ غرضکہ توبہ کے بھروسہ گناہ کرنا بہت حماقت ہے [۱]

بہ نسبت اور اعضا کے زبان کی درستی زیادہ ضروری ہے اور اس کی درستی سے تمام اعضا کی درستی ہو جاتی ہے

اس تمام تقریر سے معلوم ہو گیا ہوگا کہ طریقہ اصلاح اعمال و محو ذنوب کا فقط اتنا ہی ہے کہ اللہ تعالےٰ کا خوف پیدا کر لو۔

---

[۱] خصوصاً جبکہ موت کا وقت معلوم نہیں اور یہ بھی معلوم نہیں کہ موت آنے کے وقت اتنی مہلت مل سکے گی یا نہیں جس میں توبہ کر لی جائے اگر ہارٹ فیل فالج یا ایکسیڈنٹ جیسی اچانک بات ہو گئی تو کیا ہوگا اور جیسے غفور رحیم حق تعالےٰ کی صفتیں ہیں جبار و قہار منتقم بھی صفتیں ہیں اگر ان میں کسی کا ظہور ہو گیا تو کیا ہوگا اس لئے ہر وقت توبہ ضروری ہے۔

تو اسی سے تمام اعمال درست ہو جاویں گے اور زبان کی درستی بھی اگرچہ اس میں داخل ہے مگر پھر زبان کی درستی کو استقلالاً طریقہ کا جزو کیوں بنایا گیا اس میں کیا راز ہے بس تجائے اِتَّقُوا اللّٰهَ وَقُوْلُوْا قَوْلًا سَدِیْدًا کے یوں فرماتے یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتقوا اللّٰہ یستی لکم لسانکم ویصلح لکم الخ یوں نہیں فرمایا بلکہ وَقُوْلُوْا قَوْلًا سَدِیْدًا کا اِتَّقُوا اللّٰهَ پر عطف کیا۔ اور اس کو مستقل طریقہ قرار دیا تو وجہ اس کی یہ ہے کہ اعمال بہت سے ہیں ایک وہ جو ہاتھ پاؤں آنکھ وغیرہ سے ہوتے ہیں ایک وہ جو زبان سے ہوتے ہیں اور ان دونوں قسموں میں کئی قسم کا تفاوت ہے۔ ایک یہ کہ سوائے لسان کے اور سب جوارح عمل کرنے سے تھک جاتے ہیں۔ پاؤں تھک جاتے ہیں کثرت سے چلنے سے ہاتھ تھک جاتا ہے ان اعمال سے جو ہاتھ سے کئے جاتے ہیں۔ آنکھ تھک جاتی ہے زیادہ دیکھنے سے مگر یہ لسان بولنے سے نہیں تھکتی اگر لاکھ برس تک بک بک کرو تو ہرگز نہ تھکے گی۔ یہ بات دوسری ہے کہ کثرت بولنے سے دل کے اندر بے رونقی سی پیدا ہو کر بولنے

۱؎ الگ مستقل طور سے ۲؎ اللہ سے ڈرو اور ٹھیک بات کہو ۳؎ اے ایمان والو اللہ سے ڈرو وہ تمہاری زبان ٹھیک کر دیں گے اور تمہارے عمل نیک بنا دینگے اور گناہ بخش دیں گے ۴؎ جیسے ڈرو مستقل طریقہ فرمایا ٹھیک بات کو بھی مستقل قرار دیا۔

سے نفرت ہو جاوے۔ لیکن زبان کو فی نفسہ[1] کوئی ٹھکان نہ ہوگا۔ اس سے معلوم ہوا کہ لسانی[2] اعمال سب جوارح کے اعمال سے عدد میں زیادہ ہوں گے پس گناہ بھی اس سے زیادہ ہوں گے۔ ایک تو یہ تفاوت ہوا دوسرے یہ کہ زبان مثل برزخ کے ہے۔ درمیان قلب و جوارح کے قلب سے بھی اس کو مشابہت ہے اور جوارح سے بھی۔ اور مشابہت خلقی بھی ہے اور باطنی بھی۔ خلقی یہ کہ قلب بالکل مخفی و مستور ہے اور جوارح بالکل ظاہر اور زبان مستور من[3] وجہ و مکشوف من وجہ ہے۔ چنانچہ شارع نے بھی اس کا اعتبار کیا ہے کہ صائم اگر منہ میں کوئی چیز لے کر بیٹھ جائے روزہ نہیں ٹوٹتا اس میں اس کے مکشوف ہونے کا اعتبار کیا گویا جوف میں وہ چیز نہیں گئی اور اگر تھوک نگلے تو بھی روزہ نہیں ٹوٹتا۔ اس میں مستور ہونے کا اعتبار کیا گویا جوف سے جوف میں ایک چیز چلی گئی اور غسل میں کلی کرنا فرض ہوا یہ مکشوف ہونے کا اعتبار[4] فرمایا اور باطنی مشابہت یہ ہے کہ جیسے قلب کی اصلاح سے تمام بدن کی اصلاح ہوتی ہے اسی طرح زبان کی اصلاح سے تمام اعمال جوارح کی اصلاح ہو جاتی ہے جو شخص ساکت ہو کر بیٹھ جائے اس کے ہاتھ سے ظلم نہ ہوگا۔ نہ زیادتی ہوگی نہ کسی سے لڑائی ہوگی نہ

---

[1] خود [2] زبان کے کام سب اعضائے ظاہری سے تعداد میں زیادہ ہوں گے۔ [3] ایک طرح [4] اور وضو میں فرض نہیں فرمایا تو مستور ہونیکا اعتبار فرمایا

منکرار ہوگا اس لئے کہ زبان چلانے ہی سے نوبت ہاتھ پاؤں تک پہنچتی ہے ان سب سے حدیث کی بھی تنویر ہو گئی اِذَا اَصْبَحَ ابْنُ اٰدَمَ فَاِنَّ الْاَعْضَاءَ کُلَّھَا تُکَفِّرُ اللِّسَانَ تَقُوْلُ اِتَّقِ اللہَ فِیْنَا فَاِنَّا نَحْنُ بِکَ فَاِنِ اسْتَقَمْتَ اسْتَقَمْنَا وَاِنِ اعْوَجَجْتَ اعْوَجَجْنَا۔ یعنی جس وقت ابنِ آدم صبح کرتا ہے تو اس کے تمام اعضا زبان کو قسم دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ (اے زبان) ہمارے بارے میں اللہ سے ڈر کیونکہ ہم تیرے ساتھ ہیں پس اگر تو راست ہوگی تو ہم سب راست رہیں گے۔ اور اگر تو کج ہوگی تو ہم سب کج ہو جاویں گے۔

تنبیر[۱] تفاوت دیگر جوارح اور لسان میں یہ ہے کہ زبان قلب کی معبّر[۲] ہے زبان سے جو کچھ کہا جاتا ہے اس سے پوری حالت قلب کی معلوم ہو جاتی ہے اور اگر ساکت رہے تو کچھ حال معلوم نہ ہوگا کہ یہ شخص کیسا ہے۔ زبان ہی سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ شخص متواضع ہے یا متکبر ہے۔ قانع ہے یا حریص۔ عاقل ہے یا احمق۔ دشمن ہے یا دوست۔ خیر خواہ ہے یا بد خواہ۔ بخلاف ہاتھ پاؤں کے سب میں شبہ ہو سکتا ہے ایک ہی طرح کا فعل ہاتھ پاؤں سے دوست دشمن سے صادر ہو سکتا ہے۔ مثلاً قتل واقع ہوا تو اس سے یہ فیصلہ

---

[۱] وضاحت [۲] حالت بیان کرنے والی۔

نہیں کر سکتے کہ یہ قاتل دشمن ہی تھا۔ ممکن ہے دوست ہو اور وہ کسی اور کو قتل کرنا چاہتا ہو اور ہاتھ چوک گیا ہو۔ چنانچہ ایک جگہ کا واقعہ ہے کہ ایک بھائی نے بندوق چلائی دوسرے بھائی کی آنکھ میں ایک چھرہ لگا۔ اسی طرح سے مار پیٹ کبھی عداوت سے ہوتی ہے کبھی تادیب کے لئے ہوتی ہے غرض ایک شق معین کرنے کے لئے خارجی قرائن کی ضرورت ہوتی ہے بخلاف لسان کے کہ یہ پوری نائب ہے قلب کی چوتھا تفاوت یہ ہے کہ تعلقات دو قسم کے ہیں ایک اپنے نفس کے ساتھ دوسرے غیروں کے ساتھ، غیروں کے ساتھ جو تعلق اخوت، محبت عداوت کا ہوگا وہ بدولت زبان کے ہوگا اور یہ ظاہر ہے کہ اعمال صالحہ میں ہم کو دوسروں کی امداد کی ضرورت ہے بغیر دوسروں کی امداد کے ہم رکعت تک نہیں پڑھ سکتے۔ اس لئے کہ نماز کا طریقہ ہم کو کسی نے نہیں بتلایا ہے اس لئے ہم نماز پڑھتے ہیں۔ قرآن شریف کسی نے نہیں پڑھایا اس لئے ہم پڑھتے ہیں روزہ کی فرضیت اور اس کی تاکید اور اس کی ماہیت کسی نے بتائی اس لئے روزہ رکھتے ہیں۔ علیٰ ہذا تمام اعمال صالحہ کو ان کے بتلانے سکھلانے والوں نے بلا تعلق تو بتلایا نہیں اور وہ تعلق پیدا ہوا ہے لسان سے اور نیز تعلیم بھی ہم کو بذریعہ لسان کی گئی تو اس اعتبار سے لسان کو تمام اعمال صالحہ میں دخل ہوا گویا یہ تمام اعمال صالحہ بدولت اسی لسان ہی کے ہم سے صادر ہوتے ہیں جبکہ دیگر جوارح اور لسان میں

لہ ادب و تہذیب سکھانا۔

اس قدر تفاوت ہوئے اور لسان کو اعمال صالحہ کے وجود میں ایک دخل عظیم ہوا اس لئے حق تعالےٰ شانہ نے اس کو مستقل جزو طریقہ اصلاح کا بنا دیا۔ اگرچہ تقوےٰ سے جو درستی ہوگی درستی لسان بھی اس کا فردِ عظیم ہے خلاصہ یہ ہے کہ ہمارے ذمہ دو کام ہوئے ایک خدا کا خوف دوسرے زبان کی اصلاح ان دونوں کے جمع ہونے سے آئندہ کے لئے اعمال کی اصلاح ہوگی اور گذشتہ گناہ محو ہو جائیں گے۔

اصلاحِ اعمال میں ہم کو اپنے اوپر نظر نہ ہونا چاہیئے

اور یُصْلِحْ[1] کی نسبت جو اپنی طرف فرمائی حالانکہ بظاہر اصلاح اعمال کا کام عبد کا ہے تو وجہ اس کی یہ اشارہ ہے کہ ہم کو اپنے اوپر نظر نہ ہونا چاہیئے۔ اور یہ نہ سمجھیں کہ یہ کام ہم نے کیا ہے۔ اس لئے فرماتے ہیں کہ ناز مت کرو جو کچھ کرتے ہیں ہم کرتے ہیں اور خیر اگر ہمارے اختیار میں بھی ہے تو یہ ہے کہ مثلاً ہم نماز پڑھتے ہیں لیکن پوری درستی جو مفہوم ہے یصلح کا یعنی یہ کہ جیسے چاہیئے اس طرح کی نماز پڑھنا اور قلب کا اس میں حاضر ہو جانا یہ سب خدا کی طرف سے ہے۔ اور اس نسبت میں ایک اور لطیف نکتہ ہے وہ یہ کہ گویا فرماتے ہیں کہ یہ اعمال

---

[1] اللہ تعالےٰ تمہارے عمل نیک درست کر دیں گے۔

تو تم نے کر لیئے لیکن ہم اس کی اصلاح کر کے فرشتوں کے معرفت پیش کرا دیں گے جیسے بچہ سے کہا کرتے ہیں کہ یہ شئے اُٹھا لاؤ اور وہ اٹھا نہیں سکتا تو خود اُٹھاتے ہیں اور اس کا ہاتھ بھی لگوا دیتے ہیں اور اٹھانے کی نسبت ان کی طرف کرتے ہیں اور اس پر انعام دیتے ہیں ایسے ہی ہمارا نماز روزہ ہے کہ خود توفیق دیتے ہیں خود رکھواتے ہیں اور خود ہی انعام عطا فرماتے ہیں اللہ اکبر کس قدر رحمت ہے اور دوسری شے جو اِتَّقُوا اللّٰہَ[1] پر مرتب فرمائی وہ یَغْفِرْ لَکُمْ ذُنُوْبَکُمْ[2] ہے۔ بظاہر تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ بجائے یَغْفِرْ لَکُمْ ذُنُوْبَکُمْ کے یُجَنِّبْکُمْ ذُنُوْبَکُمْ فرماتے یعنی تم کو گناہوں سے بچالیں گے، یہ نہیں فرمایا اس لئے کہ گناہوں سے بچانا تو یُصْلِحْ لَکُمْ میں آچکا ہے[3]، ذنوب ماضیہ باقی تھے۔ ان کی نسبت فرمایا کہ ان کی بھی فکر نہ کرو ان کو بھی اللہ تعالےٰ محو فرما دیں گے۔

تحصیلِ خوف کا نہایت عمدہ طریقہ

اب میں آپ کو خوف (کہ جس سے تمام اعمال درست ہو جاتے ہیں) اس کے حاصل ہونے کا طریقہ بتلاتا ہوں اور وہ طریقہ گویا ایک

---

[1] اللہ سے ڈرو [2] تمہارے گناہ بخش دیں گے [3] کیونکہ جب نیک نیک عملوں کی توفیق دینگے آئندہ گناہ نہ ہوں گے ان سے بھی بچاؤ ہو گیا [4] پہلے کے گناہ۔

گرتا ہے اور وہ میں اپنی طرف سے نہیں کہتا بلکہ وہ بھی حق تعالےٰ ہی کا ارشاد ہے وہ یہ ہے۔[1] وَلْتَنْظُرْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ لِغَدٍ یعنی فکرِ آخرت کیا کرو اور فکرِ آخرت کا طریقہ یہ ہے کہ ایک وقت مقرر کر لو مثلاً سوتے وقت روزمرہ بلاناغہ بیٹھ کر سوچا کرو کہ معاد[2] کیا ہے اور مرکر ہم کو کیا پیش آنے والا ہے مرنے سے لے کر جنت میں داخل ہونے تک جو واقعات ہونے والے ہیں سب کو سوچا کرو۔ کہ ایک دن وہ آئے گا کہ میرا اس دارِ فانی سے کوچ ہوگا۔ سب سامان مال واسباب باغ نوکر چاکر اولاد بیٹا بیٹی ماں باپ بھائی خویش اقارب دوست دشمن یہیں رہ جاویں گے۔ میں تن تنہا سب کو چھوڑ کر قبر کے گڑھے میں جا لیٹوں گا اور وہاں دو فرشتے آویں گے اگر میرے دن بھلے ہیں تو اچھی صورت میں ورنہ خدانخواستہ ڈراؤنی صورت میں نہایت ہولناک آواز سے آکر سوالات کریں گے۔ پس اے نفس اس وقت کوئی تیرا مددگار نہ ہوگا۔ تیرے اعمال ہی وہاں کام آویں گے۔ اگر سوالات کے جواب درست ہوں گے تو سبحان اللہ جنت کی طرف کھڑکی کھل جاوے گی اور اگر خدانخواستہ امتحان میں ناکام رہا تو قبر حفرۃ من[3] النار ہوگی اس کے بعد تو قبر سے اٹھایا

---

[1] اور ہر جان اسپر غور کرے کہ اس نے کل کے لئے کیا عمل آگے کئے ہیں [2] لوٹنے کی جگہ آخرت [3] دوزخ کا ایک گڑھا۔

جاوے گا۔ اور نامۂ اعمال اڑائے جاویں گے۔ حساب کتاب کے لئے پیش کیا جاوے گا۔ پل صراط پر چلنا ہوگا۔ اے نفس تو کس دھوکے میں ہے اور ان سب واقعات پر تیرا ایمان ہے اور یقیناً جانتا ہے کہ یہ ہو کر رہیں گے۔ پھر کیوں غفلت ہے اور کس وجہ سے گناہوں کے اندر دلیری ہے کیا دنیا میں ہمیشہ رہنا ہے اے نفس تو ہی اپنا غمخوار بن اگر تو اپنی غمخواری نہ کرے گا تو تجھ سے زیادہ کون تیرا خیر خواہ ہوگا۔ اسی طرح گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ روزانہ ان واقعات کو تفصیل سے سوچا کرے۔ میں دعویٰ سے کہتا ہوں کہ انشاء اللہ چند ہی روز کے بعد دیکھو گے کہ خوف پیدا ہو گیا۔ اور خوف پیدا ہونے کے بعد آپ کو معاصی سے توبہ کی فکر ہوگی، اور آئندہ کے لئے اطاعت کی توفیق ہوگی۔ اس وقت آپ کو مشاہدہ ہوگا اتقو اللہ پر کیسے اصلاح اعمال و محو ذنوب مرتب ہو گئے۔

اطاعت کاملہ کا محبت پر موقوف ہونا اور محبت کے پیدا کرنے کا طریقہ

وَمَن يُطِعِ اللّٰهَ وَرَسُولَهُ فَقَدْ فَازَ فَوْزًا عَظِيمًا یعنی جو شخص اللہ و رسول کی اطاعت کرے وہ بڑی کامیابی کو پہنچا یُطِعِ

میں اشارہ ہے کہ جو شخص خوشی سے کہنا مانے اس لئے کہ یہ طوع[1] سے مشتق ہے اور خوشی سے کہنا ماننا بدون محبت اللہ و رسول کے نہیں ہوتا اور اللہ کی محبت حاصل ہونے کا طریقہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا یاد کرنا ہے۔ اس کے لئے بھی ایک وقت مقرر کر کے سوچا کرو کہ ہم پر اللہ تعالیٰ کی کسقدر نعمتیں ہیں۔ چند روز کے بعد آپ کو مشاہدہ ہوگا کہ ہم سر تا سر عنایت اور نعمتوں میں غرق ہیں اس سے آپ کے قلب میں حق تعالیٰ کی محبت اور اپنی ناکارگی اور تقصیر جاگزیں ہوگی اور جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم کہ یُطِع[2] کا تعلق آپ سے بھی ہے۔ آپ کے ساتھ محبت کا طریقہ بھی یہی ہے کہ حضور نے جو ہمارے لئے مشقتیں اٹھائیں اور اپنی امت پر شفقت فرمائی۔ اس کو سوچا کرو۔ جب محبت پیدا ہوگی، اطاعت خوشی سے ہوگی۔ ادھر محبت ہوگی اور پہلے جو طریقہ بیان کیا اس سے خوف ہوگا۔ یہ دونوں شئے آپ کے دین و دنیا دونوں درست کر دیں گے اور بڑی کامیابی سے یہی مراد ہے۔

---

[1] جس کے معنے خوش خوش کہنا ماننے کے ہیں اور ناخوشی سے ماننا کرنا کہلاتا ہے۔ [2] اطاعت کرنے کا تعلق حضور سے بھی ہے آیت میں ان کی فرمانبرداری کو بھی فرمایا ہے۔ اسکو بھی خوشی خوشی ہی کرنا ہے اسکا ذریعہ بھی محبت ہے اور محبت پیدا کرنیکا یہی طریقہ ہے۔

عالم غیب[1] کی وسعت اور اس کے کشف سے اس کا اشتیاق اور عدم کشف کا موجب نقصان نہ ہونا

عالم غیب میں اس قدر وسعت ہے کہ یہ عالم اس سے وہ نسبت رکھتا ہے جو سوئی پر لگا ہوا ایک قطرہ سمندر سے نسبت رکھتا ہے۔ یعنی یہ عالم دنیا اس کے سامنے مثل ایک قطرہ کے ہے اور وہ اس کے اعتبار سے مثل سمندر کے ہے۔ اہل کشف نے لکھا ہے کہ دونوں عالموں میں وہی نسبت[2] ہے جو کہ رحم مادر اور عالم دنیا میں ہے۔ بچہ اول رحم مادر میں رہتا ہے اور اس کے لئے وہ ایک عالم ہوتا ہے اور اس سے اس قدر مانوس ہوتا ہے اگر شاید وہاں سے اس کی رائے لے کر عالم دنیا میں لایا جائے تو وہ کبھی گوارا نہ کرے اور مچل جاوے لیکن اگر اس کو کسی طرح وہاں

---

[1] وہ جہان جو اس دنیا کے بعد ہے اور اس وقت نظروں سے غائب ہے آخرت کا جہان

[2] یعنی قریب قریب کی نسبت یہ ہے بلکہ حقیقت میں یہ بھی نسبت نہیں دونوں نسبتوں (قطرہ و سمندر اور رحم و جہان) میں بات یہ ہے کہ جہان کو سمندر کے سامنے رحم یا قطرہ نہ ہونے کے برابر ہے

سے نکال لیا جاوے جیسا کہ اسی طرح لایا جاتا ہے اور عالم دنیا میں وہ یہاں کی رونق چہل پہل یہاں کی آبادی اور معمورۂ دنیا کو دیکھے تو عالم رحم اس کو بالکل ہیچ اور عدم معلوم ہونے لگے۔ اسی طرح اہل دنیا جو کہ اس عالم میں محبوس اور اسیر ہیں جنہوں نے آنکھ کھولنے کے وقت سے آنکھ بند کرنے تک اس کے سوا اور کسی عالم کو دیکھا ہی نہیں۔ جب ان سے اس عالم کو چھوڑ دینے اور دوسرے عالم میں چلنے کے لئے کہا جاتا ہے تو وہ سخت پریشان ہوتے ہیں۔ ان کا دل مضطرب ہوتا ہے اور وہ کسی طرح اس عالم کی جدائی گوارا نہیں کرتے[۱]۔ ہاں وہ لوگ جن کو خدا تعالیٰ نے عیناً[۲] یا ذوقاً عالم مکاشفہ دیا ہے اور وہ اس عالم کو مشاہدہ کر چکے ہیں۔ ان کو اس کی جدائی کا نہ قلق ہوتا ہے۔ نہ وہ اس سے گھبراتے ہیں بلکہ وہ اس عالم سے انتقال کے متمنی اور آرزومند رہتے ہیں۔ لیکن یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ پہلے لوگوں کے مقابلہ میں یہ لوگ[۳] زیادہ مقبول اور صاحب کمال ہیں اس واسطے

---

[۱] مگر وہاں پہنچ جائیں گے تو جیسے جہان میں رہ کر رحم میں رہنے کا خیال تک نہیں آتا۔ وہاں جا کر اس جہان کا یہی عالم ہوگا کہ خیال کے قابل بھی نہ رہے گا [۲] یعنی کشفی آنکھ سے یا دل کے ادراک سے۔

[۳] بے کشف والوں کے مقابلہ پر کشف والے۔

کہ ان کی فضیلت یا تو اشتیاق کی وجہ سے ہو سکتی ہے یا کشف کی وجہ سے۔ سو اشتیاق کی وجہ سے تو اس لئے یہ صاحب فضیلت نہیں کہ جب عالم غیب اور اس کے نعم[1] و لذائذ کو دیکھ چکے ہیں، پھر اس کی رغبت کرنا اس کا مشتاق ہونا کیا کمال کی بات ہے۔ خوشنما باغیچہ کو جو شخص بھی دیکھے گا، سیر کا متمنی ہوگا۔ اور کشف کی وجہ سے اس لئے صاحب فضیلت نہیں کہ کشف دلیل بزرگی اور مقبولیت کی نہیں۔ اس کی بنا محض مجاہدہ اور کثرت ریاضت پر ہے اکثر ہنود[2] کو بھی ہونے لگتا ہے اور مرنے کے بعد تو سب ہی کو ہوگا۔ البتہ اہل کشف کو اس اعتبار سے ضرور فضیلت ہے کہ دنیا میں رہ کر جو ذوق[3] ان کو حاصل ہے، دوسروں کو نہیں۔

---

[1] نعمتیں اور لذتیں۔

[2] کیونکہ روح عالم بالا کی چیز ہے اور وہاں ہر چیز کی مثالی صورت موجود ہے اس خاکی جسم کے پردوں سے روح کے انکشافات بند ہیں اب جتنا یہ علاقہ کم ہوگا ادھر کا بڑھ جائے گا وہ مثالی صورتیں منکشف ہونے لگیں گی۔ یہ خاکی جسم سے علاقہ کم کرنا مجاہدہ سے ہوتا ہے خواہ صحیح غرض سے ہو کہ رضائے حق کے راستہ پر ہو یا کسی باطل غرض سے ہو۔

[3] دل کی کیفیت۔

کشف نہ ہونے کی صورت میں عمل کا زیادہ موجب کمال ہونا

اور کشف کی حقیقت (یعنی تحقیق) معلوم ہو جانے سے یہ بات بھی واضح ہو گئی کہ بعض ناواقف لوگ جو کشف کے درپے ہوتے ہیں اور اس کو بڑی چیز سمجھتے ہیں یہ ان کی غلطی ہے[1] بلکہ اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ کشف نہ ہونے کی صورت میں اگر عمل ہو تو وہ زیادہ کمال کی بات ہے۔ چنانچہ خداوند جل و علا جائے مدح میں فرماتے ہیں اَلَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ[2] اور حدیث میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ سے فرمایا اَیُّ الْخَلْقِ اَعْجَبُهُمْ اِیْمَانًا یعنی تمام خلق میں سب سے زیادہ عجیب ایمان کس کا ہے۔ صحابہ نے عرض کیا اَلْمَلٰئِکَةُ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ الخ یعنی فرشتوں کا ایمان سب سے زیادہ عجیب ہے۔ آپ نے فرمایا ان کے ایمان نہ لانے کی کیا وجہ ہوتی جبکہ ہر وقت کلام و احکام سے مشرف ہوتے ہیں۔ صحابہ نے کہا کہ پھر انبیاء

---

[1] اگر مقصود یعنی رضائے الٰہی کا ذریعہ ہے تو درست ورنہ بیکار بلکہ مضر

[2] وہ لوگ جو اَن دیکھی باتوں پر ایمان لاتے ہیں۔

علیہم السلام کا آپ نے فرمایا بھلا وہ کیوں ایمان نہ لاتے ہر وقت تو ان پر وحی نازل ہوتی ہے۔ صحابہ نے کہا کہ پھر ہم ارا آپ نے فرمایا کہ تم کیوں ایمان نہ لاتے ہر وقت مجھے دیکھتے ہو مجھ سے سنتے ہو آخر صحابہ نے عرض کیا کہ حضور پھر کون لوگ۔ آپ نے فرمایا وہ لوگ جو میرے بعد آویں گے۔ جنہوں نے نہ مجھ کو دیکھا ہوگا نہ نزول قرآن کی کیفیت دیکھی ہوگی۔ محض چند لکھے ہوئے کاغذ دیکھ کر ایمان لاویں گے۔ ان کا ایمان زیادہ عجیب ہے۔ مقصود اس سے یہ ظاہر کرنا ہے کہ مکاشفہ کی نسبت عدم کلام مکاشفہ کی حالت زیادہ تفضیل اور اسلم ہے لیکن اس سے یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ مطلقاً غیر مکاشفین مکاشفین سے افضل ہیں اگر اہل کشف میں اور فضائل بھی ہوں جیسے انبیا علیہم السلام تو وہ افضل ہوں گے۔ اور اعجب ہونا دوسری بات ہے۔

لہ قرآن و حدیث اور ان کی تشریحات ۲ہ فضیلت اور زیادہ سلامتی والی ۳ہ ہر ایک بے کشف کشف والوں سے۔

۴ہ ایمان کا زیادہ عجیب ہونا اور بات ہے کہ یہ ذرائع کے زیادہ نہ مشہود ہونے پر ہے اور ایمان قوی ہونا اور بات ہے وہ انہی حضرات کو حاصل ہے۔

جن لوگوں کو عالم غیب منکشف نہیں ہوا انہیں عالم دنیا کے چھوڑنے سے قبل موت سے وحشت ہوتی ہے لیکن اگر اہل ایمان ہو تو وہ وحشت بعد انکشاف باقی نہیں رہتی۔

جن لوگوں کو عالم غیب منکشف نہیں ہوا وہ لوگ اس دنیا کو چھوڑتے وقت گھبراتے اور مضطرب ہوتے ہیں۔ جالینوس کے متعلق مشہور ہے کہ جب مرنے لگا تو یہ تمنا کرتا تھا کہ میری قبر میں ایک سوراخ رہے کہ دنیا کی ہوا آتی رہے لیکن غیر مکاشفین[1] اگر اہل ایمان کامل ہیں تو گو ان کو طبعاً[2] اس عالم کو چھوڑنا (قبل موت) گراں گزرے اور وہ موت سے گھبرا دیں جیسا کہ حضرت عائشہ رضی فرماتی ہیں کہ اِنَّا لَنَکۡرَہُ الۡمَوۡتَ مگر عین مرنے کے قریب جب مبشر[3] ہوتا ہے اور اسی طرح مرنے کے بعد جب اس عالم کی سیر کریں گے اور اس کو دیکھیں گے اور اس کی وسعت آنکھوں کے سامنے ہوگی تو ان کی وہی حالت ہوگی جو کہ رحم مادر سے نکل کر اور عالم دنیا دیکھ کر

---

[1] غیر اہل کشف [2] طبیعت کو نہ کہ عقل کو [3] ہم میں سے تو ہر ایک موت کو ناگوار سمجھتا ہے یہ طبیعت کی ناگواری ہے [3] بشارت و خوشخبری دیا ہوا۔

بچے کی حالت ہوتی ہے کہ وہ اس کو بھول جاتا ہے اور عالم دنیا کے سامنے اپنے اس پہلے عالم کو ہیچ بلکہ لاشئ محض سمجھنے لگتا ہے۔
حکیم سنائی رح اسی کی نسبت فرماتے ہیں ؎

آسمانہاست در ولایت جاں[1] — کار فرمائے آسمان جہاں
در رہ روح[2] پست و بالاہست — کوہ ہائے بلند و صحرا ہست

مرید کو متعارف[3] طور پر توجہ دینے میں خرابی اور اس کے ضرر مع چند شبہات اور ان کے جوابات

اکثر محققین صوفیہ نے مرید دل پر متعارف توجہ دینے کے طریق کو بالکل ترک فرما دیا۔ اس وجہ سے کہ اس طریق توجہ میں مریدین کے اندر کسی کیفیت کے القاء[4] کے لئے اس قدر استغراق[5] کرنا شرط تصرف ہے کہ بجز اس مقید[6] القاء کے کسی طرف التفات نہ ہو اور

---

[1] روح کی مملکت میں بھی کئی آسمان ہیں جو دنیا کے آسمانوں کی طرح کام انجام دیتے ہیں
[2] روح کے راستہ میں بھی اونچا نیچا ہے [3] بلند بلند پہاڑ اور جنگل ہیں [3] رواجی کہ پیر مرید کی طرف خوب متوجہ ہو کر دل کو اس کے دل سے ملا دینے اور اپنے دل کی سوز و گداز و عشق و آگ کی کیفیت مرید کے دل میں پیوست کرنے کی کوشش کرنا [4] دل میں ڈالنا [5] ڈوب جانا کہ سب سے ہی الگ ہو کر اسمیں لگ جانا [6] اثر کرنے کی شرط ہے [7] صرف اثر دل میں ڈال دینے کی توجہ کے سوا۔

تمام تر خیالات سے بالکل خالی ہو جاوے۔ حتیٰ کہ واقعی اس وقت حق تعالےٰ کی طرف بھی توجہ کم ہو جاتی ہے۔ سو اس قدر توجہ مستغرق[1] ہونا خاص اللہ تعالےٰ کا حق ہے ان کو غیرت آتی ہے اور ان پر سخت گراں گزرتا ہے کہ یہ شخص خدا سے بالکل غائب ہو جاوے۔ ایک اور ضرر شیخ کو توجہ متعارف میں یہ ہوتا ہے کہ اپنے تصرفات دیکھ کر چند روز میں عجب[2] پیدا ہو جاتا ہے۔ دوسرا یہ ضرر ہوتا ہے کہ اس متعارف طریق توجہ سے شہرت ہو جاتی ہے اور جس شہرت کے اسباب مقدور الترک[3] ہوں وہ اکثر مضر ہوتی ہے۔ تیسرا یہ ضرر ہوتا ہے کہ شیخ اگر ضعیف القویٰ[4] ہو تو بیمار پڑ جاتا ہے۔ یہ تین ضرر شیخ کو ہوتے ہیں اور مرید کو یہ ضرر ہوتا ہے کہ وہ شیخ پر اتکال[5] کر لیتا ہے اور خود کچھ نہیں کرتا۔ اس لئے اس کی نسبت محض انعکاسی[6] ہوتی ہے اکتسابی[7] نہیں ہوتی اور نسبت انعکاسی کو قیام نہیں ہوتا اگر کسی کو شبہ ہو کہ یہ توجہ خود حدیث سے ثابت ہے چنانچہ حضرت جبرائیل علیہ السلام کی نسبت حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ غطنی[8]

---

[1] ڈوبی ہوئی توجہ کہ دوسری ہر طرف سے ہٹی ہوئی ہو [2] خود بینی کہ میں ایسا ہوں [3] ذرائع چھوڑنے کی قدرت میں ہوں [4] جسمانی کمزوری [5] بھروسہ [6] شیخ کی نسبت مع اللہ کا عکس جیسے آئینہ میں صورت کا عکس جو الگ ہونے پر نہیں رہتا [7] خود حاصل کی ہوئی جو ہمیشہ رہتی [8] جبرائیل علیہ السلام نے مجھ کو دبایا تو مجھ کو مشقت تک پہنچا دیا

فَبَلَغَ مِنِّی الْجُھْدَ سو اس کے دو جواب ہیں ایک تو یہ کہ اس غطّ[1] کو توجہ کہنا محض بے دلیل ہے۔ اس کا حاصل ضمِّ الصادق بالصدر[2] مع شدۃ ہے نہ کہ توجہ متعارف اور اگر تسلیم بھی کیا جاوے تو ممکن ہے کہ حضرت جبرائیل علیہ السلام کو بوجہ قوت ملکی توجہ میں اس قدر استغراق کی ضرورت نہ ہوتی ہو جو توجہ الی الحق کی مانع ہو۔[3] وذٰلک لیفیض اگر کہا جاوے کہ ممکن ہے کہ منفعل کے[4] تفاوت استعداد سے کسی وقت کمال استغراق کی ضرورت نہ ہو تو جواب یہ ہے کہ فاعل[5] کو تو ہر صورت میں کمال استغراق کی ضرورت ہو گی۔ البتہ تفاوت استعداد سے منفعل میں فرق ہو گا کہ تام الاستعداد[6] بسہولت اور جلد متاثر ہو گا اور ناقص الاستعداد[7] بدیر متاثر ہو گا۔

---

[1] دبانے کو [2] سینہ کے ساتھ زور سے ملا دینا [3] اور یہ یعنی ملکی قوت کی وجہ سے وہ استغراق جو حق تعالےٰ کی طرف توجہ سے روکتا ہے نہ ہو مضر نہیں ہے [4] اثر لینے والے کی طاقت کے کم و بیش ہونے کی وجہ سے [5] توجہ دینے والے کو [6] اثر لینے کی پوری طاقت والا [7] اثر لینے کی کم طاقت والا یعنی اثر لینے والے کی قابلیت کے کم زیادہ ہونے سے جو نتیجہ نکل سکتا ہے وہ اثر لینے والے کے ہی حق میں ہو سکتا ہے کہ زیادہ قابلیت والا جلد اثر لے اور کم والا دیر میں۔ لیکن اثر کرنے والے پیر کو تو دونوں صورتوں میں پوری توجہ اور حق تعالیٰ سے غیر متوجہ ہونا پڑے گا۔ یہی خطرہ کی بات ہے۔

فیض رسانی کی وہ صورتیں جن میں کوئی خرابی اور ضرر نہیں مع زیادت تحقیق توجہ متعارف

ہاں دو صورتیں فیض رسانی کی اور ہیں ایک تو ان کے اختیار سے بھی خارج ہے وہ یہ کہ ان کی ذات بابرکت کے فیوض برکات سے کہ ان کو اس طرف التفات بھی نہیں عالم مستفیض[1] ہوتا ہے جس طرح بارش کہ اس کے برسنے سے ہر قابل حصہ زمین میں قوت نمو پیدا ہو ہی جاتی ہے۔ خواہ بارش چاہے یا نہ چاہے یا آفتاب کہ اس کے طلوع کے وقت جو چیز اس کے مقابل ہوگی ضرور منور ہوگی۔ دوسری اختیاری ہے جیسے مریدین کے لئے دعا کرنا ان کے حال کی نگرانی کرنا۔ شفقت سے نصیحت کرنا۔ اس کو بھی توجہ بالمعنی اللغوی[2] کہا جاتا ہے مگر اصطلاحی توجہ بمعنی تصرف[3] نہیں سو اس کا کچھ مضائقہ نہیں بلکہ مسنون ہے کیونکہ طریق[4] توجہ کے ترک کا سبب محض یہ تھا کہ اس میں ذات باری سے غیبت ہے اور چونکہ اس دوسرے طریق[5] میں ترک[6] التفات الی اللہ نہیں بلکہ زیادت[7] التفات

---

۱ فیض لینے والا ۲ لغت کے معنی سے کہ توجہ تو ہے مگر رواجی معنے کہ دل کو ہر طرف سے ہٹا کر اس سے دوسرے کے دل میں کیفیت کا ڈالنا ہو نہیں ہے ۳ تصرف کے معنی ہیں مرید کے دل میں دو دیل کہ دنیا ہے رواجی توجہ۔ ۴ اللہ تعالیٰ کی طرف کی توجہ کا ترک کرنا اور ان سے غائب ہونا نہیں بلکہ ان کی طرف زیادہ توجہ ہے ۵ یعنی رواجی توجہ کے طریقہ ۶ اللہ کی طرف کی توجہ کو چھوڑ دینا ۷ اللہ کی طرف توجہ کی زیادتی

الی اللہ ہے اس لئے یہ مذموم نہیں بلکہ مطلوب ہے اور گو اس وقت توجہ الی الخلق[1] بھی ہوتی ہے مگر وہ توجہ صارف عن[2] التوجہ الی الخالق نہیں ہے بلکہ دعا کی تو حقیقت ہی توجہ الی الخالق[3] ہے گو لنفع الخلق[4] سہی اور یہ نفع بھی خاص مرضی حق[5] ہے اور نگرانی و نصیحت و تعلیم وغیرہ میں بھی اعتدال[6] توجہ الی الخلق غیر مانع عن الحق ہے اور وہ بھی باذن[7] الخالق ہے تو ہے انہماک[8] فی الخلق و غیب عن الحق نہیں ہے حاصل یہ ہے کہ توجہ کی دو قسمیں ہیں ایک وہ کہ جس میں خدا تعالیٰ سے غیبت[9] ہے۔ دوسرے وہ کہ اس میں احداث[10] التفات الی الخلق ہو پہلی قسم کملاء[11] کے ہاں متروک ہے دوسری قسم مطلوب و محمود ہے البتہ پہلی قسم کی توجہ سے اگر اپنے تصرف[12] کا اظہار یا زیادت جاہ مقصود ہو تو مذموم ہے۔ پس اس کا وہی مرتبہ ہے جو غلام پہلوان اور رنجیت سنگھ کی کشتی کا۔ جس درجہ میں یہ کشتی محمود و مذموم ہے بالکل اسی درجہ میں یہ توجہ بھی ہے۔ خلاصہ یہ ہوا کہ توجہ مروج[13] فی نفسہ

---

[1] مخلوق کی طرف توجہ [2] خالق کی طرف سے توجہ ہٹانے والی نہیں [3] خالق کی طرف توجہ [4] مخلوق کے فائدہ کے لئے [5] پسند حق [6] متوسط درجہ میں مخلوق کی طرف توجہ حق تعالیٰ سے روکنے والی نہیں [7] حق تعالیٰ کی اجازت سے ہے [8] مخلوق میں کھپ جاتا تو ہے حق تعالیٰ سے غائب ہو جانا نہیں [9] غائب ہونا [10] مخلوق کی طرف متوجہ ہونے کو وجود میں لانا [11] کامل بزرگوں کے [12] مریدوں پر ظاہر کرنا نام و عزت بڑھانا ریاکاری ہو کر بڑا ہے [13] رواجی توجہ خود۔

کوئی محبوب و مطلوب چیز نہیں ہے لیکن اگر اسکی غایت محمود ہو تو اس میں بالعرض مطلوبیت کی شان پیدا ہو جاتی ہے۔ جس طرح ورزش کہ اگر اس سے غرض محض اظہار قوت[1] وصولت ہے تو لغو ہے اور اگر اعانت مخلوق اس کی غرض ہے تو محمود ہے۔ پس یہ توجہ ایک مرتبہ میں طاعت ہے لیکن اس سے زیادہ درجہ میں وہ توجہ ہے جو کہ انبیاء اپنے اصحاب و امت پر فرماتے تھے۔ یہی انبیاء کا طریق توجہ ہے جس کو کاملین نے اختیار کیا ہے کہ اس میں وہ خطرہ نہیں ہے جو کہ مروج طریق میں ہے اور وہ توجہ ہے خلق کی طرف جو کہ سالک کے لئے نہایت مضر ہے۔ حتیٰ کہ ابتدا میں مطلق افادہ کے ارادہ سے بھی توجہ کرنا مضر ہوا ہے۔

حکایت: ایک بزرگ کی حکایت مشہور ہے کہ اپنے ایک مرید کو مدت تک ذکر و شغل بتلاتے رہے اور اس میں تغیر و تبدیلی بھی کرتے رہے لیکن مرید کو کچھ نفع نہ ہوا۔ آخر مدت کے بعد اس سے یہ پوچھا کہ تم یہ ذکر و شغل کس نیت سے کرتے ہو اس نے کہا کہ حضرت یہی نیت ہے کہ اگر کسی قابل ہو جاؤں گا تو دوسروں کو نفع پہنچاؤں گا۔

---

[1] جیسے ورزش سے مقصود قوت بڑھا کر کمزوروں کو فائدہ پہنچانا ہے تو تعریف کی چیز ہے ظلم کرنا ہے تو بری خصلت ہے ایسے ہی توجہ کا فائدہ کوئی مطلوب شے ہے تو اس کی وہ جیسی بھی مطلوب ہے [2] رعب [3] خطرہ مخلوق کی طرف پوری توجہ ہے کچھ بھی فائدہ

شیخ نے کہا توبہ کرو یہ شرک[1] ہے کہ ابھی سے بڑے بننے کا خیال ہے اور خلق[2] مقصود بالنظر ہے۔ جب اس نے اس خیال سے توبہ کی فوراً فائدہ محسوس ہوا۔ گویا افادہ کی غرض سے بھی جو کہ بظاہر محمود ہے خلق کی طرف توجہ کرنا ابتداءِ سلوک میں مضر ہوتا ہے۔

شیخ کامل[3] مرید کی اصلاح سے نہ خود مایوس ہوتا ہے نہ اس کو مایوس کرتا ہے

اور اس حکایت سے اس بات کا بھی پتہ چلتا ہے کہ شیخ کامل کبھی مایوس نہیں ہوتا نہ مرید کو مایوس کرتا ہے۔ جیسا یہ شیخ مدت تک تغیر و تبدل کرتے رہے اور نفع نہ ہونے سے جواب نہیں دیا بلکہ اسی کاوش میں رہے حتیٰ کہ مرض اور اس کا علاج نکال ہی لیا وہ طبیب حاذق کی طرح کسی نہ کسی ادھیڑ بن میں لگا ہی رہتا ہے۔ برخلاف ظاہری اور ناقص پیروں کے وہ ایسے موقع پر گھبرا جاتے ہیں اور دوسرے کو بھی مایوس کر دیتے ہیں۔ اسی پر حافظ شیرازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں ؎

---

[1] شرک خفی ہے یعنی ریا اور غیر اللہ کی نیت سے کرنا ہے [2] نظر میں مخلوق مقصود ہے نہ کہ خالق [3] سچا اور ماہر فن پیر

بندۂ پیر خراباتم کہ لطفش دائم است
زانکہ لطف شیخ و زاہد گاہ ہست و گاہ نیست

مصرع ثانی میں شیخ سے مراد شیخ ناقص ہے بلکہ اگر کشف سے بھی کسی کی شقاوت ظاہر ہو جائے تب بھی مایوس نہیں ہوتے بلکہ دعا تبدل بالسعادۃ کی کرتے ہیں۔ البتہ اگر کسی نبی کو وحی سے کسی کا ختم علی الکفر معلوم ہو جاوے تو اس وقت مایوس ہونا وہ خدا ہی کے حکم سے ہے۔

ہر شخص منصب ارشاد کی لیاقت نہیں رکھتا

نیز اسی حکایت سے یہ بات بھی ظاہر ہو گئی کہ ہر شخص منصب ہدایت کی لیاقت نہیں رکھتا۔ بہت سے نام کے ایسے ہادی ہیں کہ جن کی غرض ہدایت سے محض طلب جاہ ہے اسی لئے حدیث میں ارشاد ہے لَا یَقُصُّ اِلَّا اَمِیْرٌ اَوْ مَامُوْرٌ اَوْ مُخْتَالٌ یعنی وعظ کہنے کی ہمت وہی کرے گا کہ یا خود امیر المومنین ہے یا امیر المومنین کی طرف سے مامور ہے یا متکبر اور نفس پرور

لے میں تو میکدہ کے ایسے پیر کا غلام ہوں جسکی توجہ دائمی ہے کیونکہ زاہد اور پیر کی توجہ تو کبھی ہے کبھی نہیں ٢ بد بختی ٣ نیک بختی سے بدلجانیکی ٤ کفر پہ مہر لگ جانا ٥ مریدوں کی اصلاح و تربیت۔

ہے۔ اس لئے کہ جب ہدایت عامہ کا کام امیر المومنین کی ذمہ داری میں ہے تو اس کو وہ خود کرے گا یا خود نہ کرے گا تو کسی کو اس خدمت پر مامور کرے گا۔ پس جو شخص نہ یہ ہے نہ وہ ہے اور پھر بھی ایسا کرتا ہے تو معلوم ہؤا کہ آپ بھی خواہ مخواہ آپ کو پانچوں سواروں میں گنتے ہیں۔

آج کل مخلص واعظوں پر مختال ہونے کا شبہ مع جواب اور اس کی تحقیق کہ وعظ کہنا کس کو جائز ہے۔

لیکن اس سے یہ شبہ نہ کیا جاوے کہ جب بغیر امیر یا مامور ہوئے وعظ کہنا مختال ہونے کی علامت ہے تو آج کل کے تمام وُعاظ میں سے تو ایک شخص بھی امیر یا مامور نہیں تو کیا یہ سب کے سب حدیث کی تیسری شق میں داخل ہیں۔ جواب یہ ہے کہ فقہ کا یہ مسئلہ ہے کہ جس جگہ حاکم نہ ہو وہاں اگر متقی پرہیزگار اہل الرائے مسلمان کسی ایک شخص کو کوئی منصب دے دیں تو وہ سب مل کر امیر کے قائم مقام سمجھے جاویں گے اور ان کا اعطا امیر ہی کا اعطا ہو گا کیونکہ اگر غور کر کے دیکھا جاوے تو

ل متکبر ۲ واعظ کی جمع ۳ متکبر ۴ منصب دینا

اعطاء مناصب کا اختیار جو امام کو ہے وہ بھی درحقیقت اہل اسلام ہی کو ہے اور امام بحیثیت ان کا نائب ہونے کے ان کا کام کرتا ہے کیونکہ امام کا امام ہونا تو خود اہل اسلام کے اتفاق پر ہے پس اگر وہ موجود نہ ہو تو خود ان کا فعل ضرور جائز ہوگا۔ جیسے جمعہ کی نماز کے لئے انتخاب امام کا کہ اگر امیر موجود نہ ہو اور مسلمان مل کر کسی کو منتخب کرلیں تو وہ امام صحیح ہو جاتا ہے یا ناظر وقف[۱] کو امام کی عدم موجودگی میں اہل اسلام کے انتخاب سے کسی خاص شخص کو عہدۂ نظارت[۲] وقف دیا جا سکتا ہے۔ پس جب دیندار فہیم مسلمانوں نے مل کر ایک شخص کو وعظ و نصیحت کے لئے انتخاب[۳] کر لیا ہو خواہ قولاً یا حالاً تو ایسے شخص کو وعظ کہنا جائز ہے۔

جو لوگ وعظ کہنے کے اہل نہیں ہیں ان کے وعظ سے گمراہی پھیلتی ہے

بدون اہل دین اور اہل عقل کے انتخاب کے جو لوگ اس کام کو کر رہے ہیں اور اہل نہیں ہیں وہ وعظ کے رنگ میں گمراہی پھیلا رہے ہیں۔

---

[۱] وقف کا منتظم [۲] ناظم وقف [۳] اگر کم علم غیر دیندار کو واعظ بنایا تو دونوں گنہگار ہیں۔

ہیں ۔ ضروری مسائل تک کی ان کو واقفیت نہیں ہوتی اور وعظ کہنے کی جرأت کر بیٹھتے ہیں

حکایت: سہارنپور میں ایک جاہل دیہاتی نے آکر وعظ کہا انداز یہ کہ آپ نے قبل از نماز پوچھا کہ یہاں اُداج[1] تو نہیں ہوتی معلوم ہوا کہ نہیں بس نماز کے بعد پکار مارا کہ سہا ہو (صاحبو) اُداج (وعظ) ہوگی ۔ سنتیں پڑھ کر وعظ کہنے بیٹھے ۔ اعوذ بسم اللہ غلط سلط پڑھ کر تیسین شروع کی ۔ آئتیں اُلٹی سیدھی پڑھ کر ترجمہ کیا خوبصورت ہوا ۔ اے محمد ۔ اے محمد ۔ اے محمد اگر تجھ کو پیدا نہ کرتا نہ زمین پیدا کرتا نہ آسمان نہ عرش و کرسی وغیرہ وغیرہ پھر فرماتے ہیں بھائیو تھکے ماندے ہیں اس لئے آدھی اُداج اب ہوئی آدھی پھر ہوگی ۔ کوئی نابینا ذی علم اس مجلس میں موجود تھے انہوں نے واعظ صاحب کو اپنے پاس بلا کر بٹھلایا اور پوچھا آپ کی تسیل (تحصیل)[2] کہاں تک ہے ۔ فرماتے ہیں کہ ہماری تحصیل ہے نابڑ (ہماری تحصیل ہے نابوڑ) بس ایسے واعظ رہ گئے ہیں لیکن اگر غور کیا جاوے تو معلوم ہو جاوے گا کہ یہ لوگ گولغو ہیں اور اپنی اور دوسروں کی تضییع اوقات کرتے ہیں ۔ پھر بھی ان بیچاروں سے

---

[1] غلط بیان کا گناہ یعنے غلطی و گمراہی میں ڈالتے ہیں ۔ [2] وعظ کو بگاڑا ہوا لفظ [3] علم کی تحصیل و فراغت کہاں تک ہے ۔

اس قدر نقصان نہیں ہوتا اور اتنی گمراہی نہیں پھیلتی جتنی وہ لوگ پھیلاتے ہیں کہ آب وتاب کی تقریریں مشق کئے ہوئے ہیں۔ بڑے بڑے الفاظ یاد ہیں۔ صوفیہ کی اصطلاحات ازبر ہیں۔ حافظ کا دیوان پیش نظر ہے زبان ہے کہ آب رواں کی طرح بہتی چلی جاتی ہے لیکن واقفیت اور حقیقت دیکھو تو محض ہیچ۔ یہی لوگ ہیں کہ ان سے امت کے اکثر افراد تباہ ہوئے اور ہو رہے ہیں۔ کسی نے خوب کہا ہے۔

حرفِ درویشاں بدزدد مرد دوں تا بہ پیش جاہلاں خواند فسوں

اور یہی لوگ ہیں جن کو حدیث میں مُختالٌ کے لفظ سے فرمایا گیا ہے۔

ابتدأ سلوک میں وعظ کہنا ممنوع ہے

غرض اس حدیث سے یہ بات صاف معلوم ہوگئی کہ وعظ طاعت

لے گمراہ اور کفر تک پہنچنے والے فرقے بن کر اسلام کے ٹکڑے کردیئے قصور ان لوگوں کا زیادہ ہے جو ان کی چرب زبانی اور لطیفوں ہنسانے رلانے کے قصوں کہانیوں گانے اور ٹھٹکنے کے لطف لینے میں اپنے ایمان پر ڈاکہ ڈلواتے ہیں اور نہ ان کو روکتے ہیں نہ خود سننا چھوڑتے ہیں یہی حال مضامین اور تحریروں کا ہے اردو لکھنے وار دکھیں اور لٹو ہوکر ایمان بھینٹ چڑھا بیٹھے ہیں۔ اسی سے گمراہی اور کفر پھیل رہا ہے ٹے بزرگوں کے لفظوں کو کم حیثیت لوگ چرا لیتے ہیں تاکہ ناواقفوں پر ان کا منتر پڑھ کر گرویدہ بنالیں ٹے متکبر

ہے لیکن اگر اس میں نیت خراب ہو تو وہی گناہ ہو جاتا ہے۔ صوفیہ نے اسی راز کو سمجھ کر ابتداءِ سلوک میں وعظ گوئی سے بالکل منع فرمایا ہے کہ قبل اصلاحِ نفس اس میں اغراضِ فاسدہ غالب ہوتے ہیں۔

محقق شیخ کی کیسی شان ہوتی ہے

پس معلوم ہوا کہ ہر شخص اہلیت ارشاد کی نہیں رکھتا۔ سو شیخ ہونا ہر شخص کا کام نہیں ہے دیکھو محقق شیخ کی وہ شان ہوتی ہے کہ جو اوپر کی حکایت میں مذکور ہوئی کہ کس دقیق مرض کو مرید کے سمجھ لیا۔ جس کی بنیت ذکر و شغل سے بڑا بننا اور خلق کو مطمح نظر بنانا تھا۔

محققین کے نزدیک متعارف توجہ اور تصورِ شیخ کے ناپسندیدہ ہونے کی وجہ اور غیر اللہ سے محبت کی حد

یہ توجہ اگرچہ [2] (بالغیر) طاعت ہو لیکن وہ کاملین کے لئے طاعت نہیں کیونکہ اس ہی مخلوق کی طرف کامل توجہ لازمی ہے اور ان کی حق میں غیر اللہ کی طرف التفات کرنا سخت گناہ ہے۔

---

[1] خود پسندی جاہ طلبی کبر و غرور اور بعض اوقات گمراہ ہو جانا اور کر دینا۔ [2] یعنی کو دوسرے کے دل میں عمدہ کیفیت پیدا ہو کر خدا تعالیٰ سے لگاؤ و نسبت کچھ نہ کچھ ہو سکنے کی وجہ سے اس کے لئے ثواب کا ذریعہ ہو۔

بہر چہ از دوست وامانی چہ کفر آں حرف چہ ایماں
بہر چہ از یار دور افتی چہ زشت آں نقش وچہ زیبا

خلاصہ یہ ہے کہ نفس توجہ اگرچہ زیبا ہو لیکن جب کہ اس نے خدا سے ہٹا دیا تو یقیناً زشت ہے۔ اسی طرح تصورِ شیخ کا شغل بھی محققین نے اکثروں کو تبلانا بالکل ترک کر دیا ہے سبب یہی ہے کہ تصورِ شیخ میں مرید کی پوری توجہ شیخ کی طرف ہوتی ہے ذات باری کی طرف بالکل التفات نہیں ہوتا اور یہ عیب کاملین کے یہاں جرم ہے۔ خوب کہا ہے ؎

یک چشم زدن غافل ازاں شاہ نباشی
شاید کہ نگاہے کند آگاہ نباشی

ممکن ہے کہ جس وقت یہ شخص پیر کے تصور میں مصروف ہے۔ وہی وقت ادھر کی توجہ کے نافع ہونے کا ہو۔ اسی لئے کاملین کی طبیعت اچٹتی ہے اور ان کو سخت وحشت ہوتی ہے۔ اہل

لہ مراد اس حرف سے ہے کہ تم دوست سے پیچھے رہ جاؤ کفر ہو یا ایمان کا اور مراد اس نقش سے ہے کہ محبوب سے دور ہو جاتے ہو زشت ہو یا خوبصورت سب سے بچو لہ اچھی ہو کہ مرید میں کچھ نہ کچھ بھلائی پیدا کر دے لہ مری کے پیر کے تصور کا شغل کہ مرید ہر طرف سے دل و ذہن کو خالی کر کے پیر کا تصور اور اس فیض کے دل پر مثل پانی کے نالہ کے آنے کا قوی ترین خیال کیا کرے لہ ایک پلک جھپکنے کو بھی اس شاہ سے غفلت نہ کرنا ایسا نہ ہو کہ وہ توجہ کرے اور تم غافل رہو۔ لہ لہذا یہ شغل ناجائز تو نہیں مگر ناپسند ہے۔

بیں ادیب قرامات کو قلب سے نکال نکال کر پھینک رہے ہیں۔ التکشف صلا بحوالہ بند الرشید
[دسمبر ۱۹۹۳ء ص ۳]
ھذا یہ قصہ صحیح میں مذکور کب ہے۔ پناہ بخدا! ایسی ہی خدائی کجاسی زنی !!!

کی بالکل ایسی مثال ہے جیسے ادھبڑی کہ اس کو حلال تو ضرور کہیں گے اگر غلاظت سے صاف ہو لیکن ایک لطیف المزاج آدمی سے پوچھو کہ اس کے خیال سے بھی وحشت ہوتی ہے اور صاحبو اصل تو یہ ہے کہ جب ایک دل میں دو خیال نہیں آسکتے، ایک نیام میں دو تلواریں نہیں رہ سکتیں پھر کیوں کر کہا جاوے کہ جو توجہ کہ اس میں خدا کا خیال ضعیف اور مخلوق کا خیال غالب ہو پھر اس کو قصداً پیدا کیا جاوے تو وہ مطلوب ہوگی۔

حکایت: حضرت ابراہیم ادھم کا واقعہ مشہور ہے کہ جب بیٹے سے جو شیخ محمود کے نام سے مشہور ہیں ملے اور مسرت کا جوش غالب ہوا تو ندا آئی کہ ؎

حب حق ہو دل میں یا حب بسیر　　　جمع ان دونوں کو تو ہرگز نہ کر

آخر وہ حجاب بھی مرتفع ہو گیا اور ان کا انتقال ہو گیا لیکن اس سے یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ بیٹے سے بالکل محبت ہی نہ کرے جس قدر ان کا حق شرعی ہے وہ حب حق پر غالب نہ ہو عین سنت ہے بس شیخ سے بھی ایسی محبت نہ ہونی چاہئے جو کہ خدا کو بالکل بھلا دے جیسا آج کل جاہل فرقوں میں متعارف ہے اسی طرح بیوی بچوں سے وہ محبت نہ ہو کہ خدا کی طرف توجہ نہ رہے لَا تُلْهِكُمْ أَمْوَالُكُمْ[1]

---

[1] بیٹے کا ؎ تم کو تمہارے مال اور اولاد اللہ کے ذکر سے غافل نہ کر دیں۔

وَلَا اَوْلَادُکُمْ عَنْ ذِکْرِ اللّٰہِ۔ الطاف خداوندی کے قربان ہو جئیے یہ حکم نہیں فرمایا کہ اولاد سے بالکل محبت نہ کرو کیونکہ جانتے ہیں کہ محبت اولاد طبعی ہے۔ امتثال نہ ہو سکے گا۔ اس لئے یوں فرماتے ہیں کہ اس قدر ان کے درپے نہ ہو کہ خدا کو بھول ہی جاؤ۔

ترک توجہ متعارف پر ایک شبہ اور اس کا جواب

ممکن ہے کہ کسی کو یہ شبہ پیدا ہو کہ توجہ تو اس قدر مذموم ٹھہری اور جو غرض[۱] توجہ کی ہے وہ ضروری پس اگر توجہ ترک کریں تو امر ضروری[۲] کا ترک لازم آتا ہے اور توجہ اختیار کریں تو امر مذموم کا اختیار لازم ہے۔ سو اس کا جواب یہ ہے کہ توجہ سے جو غرض ہے اس کا حصول توجہ ہی میں منحصر نہیں کیونکہ اگر اس کا حصول اسی میں منحصر ہوتا تو انبیا علیہم السلام اسی طریق کو اختیار فرماتے۔ جب انہوں نے ایسا نہیں کیا تو معلوم ہوا کہ اسی طریق میں اس کا انحصار نہیں[۳] ہے بلکہ دوسرا طریق بھی موجود ہے یعنی تعلیم وارشاد شفقت و دعا اور یہ طریق ایسا ہے جس میں نہ کوئی خطرہ ہے نہ کچھ اندیشہ۔

---

۱ مرید کے دل میں کیفیت کو پیوست کرنے کا۔ ۲ خدا تعالیٰ سے توجہ کا ہٹانے کا۔

۳ بلکہ اس سے تو عارضی فائدہ ہوتا ہے جیسے آگ کے سامنے ہونے سے گرمی اور تربیت وتعلیم سے دائمی ہوتا ہے جیسے ورزش سے گرم مزاجی

قرآن شریف جمالِ حق کے لئے آئینہ ہے اور اُس کی خوبیاں

قرآن کی تعریف میں ایک بزرگ فرماتے ہیں ؎

چیستؔ قرآں اے کلام حق شناس ــــ رونمائے رب ناس آمد بناس
حرف حرفش راست در بر معنئے ــــ معنئے در معنئے در معنئے

اور رونما اس واسطے کہا کہ خدا تعالےٰ کو دنیا میں بلا واسطہ تو دیکھ نہیں سکتے۔ پس کلام اللہ کو پڑھنا گویا دیدارِ خداوندی سے محظوظ ہونا ہے۔ اس موقع پہ ایک حکایت یاد آئی۔ اس سے اس کی پوری حقیقت ظاہر ہوگی۔ ایک مرتبہ ایران کے بادشاہ کے خیال میں اتفاقاً ایک مصرع آگیا۔ ع

دُرِ ابلق کسے کم دیدہ موجود

مصرعہ کہہ کر بڑی خوشی ہوئی لیکن دوسرا مصرعہ تیار نہ کر سکے۔ شعراء کو جمع کیا اور

۱؎ قرآن شریف اے حق کلام کو پہچاننے والے کیا ہے ۲؎ لوگوں کے رب کا جلوہ لوگوں کو دکھانے والا بن کر آیا ہے ۳؎ اس کے ایک ایک حرف کی بغل میں معنے ہیں اور معنی میں معنی، معنی میں معنی ۴؎ لطف اندوز ۵؎ ابلق یعنی سیاہ و سفید موتی کسی نے کم موجود دیکھا ہوگا۔

مصرعہ لگانے کی فرمائش کی۔ کسی سے مصرعہ نہ لگ سکا کیونکہ ایک مہمل مضمون ہے آخر سب کو زندان کی دھمکی دی۔ ان لوگوں نے پریشان ہو کر ہندوستان میں عالمگیر کے پاس خط لکھا کہ تمہارے یہاں بڑے بڑے شاعر ہیں کسی سے مصرعہ کہلا کر ہماری جان بچاؤ۔ چنانچہ شعراء کو وہ مصرعہ دیا گیا لیکن مضمون ایسا بے تکا تھا کہ کسی کی کچھ سمجھ میں ہی نہ آیا۔ شدہ شدہ زیب النسا متخلص بہ مخفی کو بھی اس کی خبر پہنچی۔ اس نے بھی غور کیا لیکن مصرعہ نہ لگ سکا۔ اتفاقاً ایک روز مسند پر بیٹھی آنکھوں میں سرمہ ڈال رہی تھی۔ آئینہ سامنے تھا کہ سرمہ کی تیزی سے آنکھ سے ایک آنسو گرا اس کی ہیئت کو دیکھ کر فوراً دوسرا مصرعہ اس کے ذہن میں آگیا۔ ع

"مگر اشک بتانِ سرمہ آلود"

چنانچہ عالمگیر کو خبر ہوئی اور شعر پورا کر کے ایران بھیجا گیا۔ جب بادشاہ نے مصرعہ سنا اس کے اور تمام شعراء کے دل میں اس شاعر کی بڑی قدر ہوئی اور شاہ ایران نے عالمگیر کو لکھا کہ اس شاعر کو ہمارے پاس بھیج دو۔ عالمگیر کو جب اس پیغام کی خبر پہنچی تو بہت پیچ و تاب ہوا کہ اگر شاعر کو ظاہر کرتا ہوں تب بھی مشکل ہے اور انکار کرتا ہوں تو بھی مشکل ہے۔ آخر اس نے

لے سوائے حسینوں کے سرمہ ملے ہوئے آنسو کے۔

زیب النساء سے کہا کہ تمہاری شاعری کا یہ نتیجہ ہوا۔ زیب النسا نے کہا کہ تم اس کے جواب میں میری طرف سے یہ لکھ دو کہ ؎

در سخن مخفی منم چوں بوئے گل در برگ گل[1]
ہر کہ دیدن میل دارد در سخن بیند مرا

چنانچہ یہ لکھ کر بھیج دیا گیا معلوم ہوا کہ مستورات سے ہے پس اسی طرح ہمارا مطلوب حقیقی جس کے دیدار کے ہم متمنی ہیں بوجہ اس کے کہ ہم اس کے دیدار کی تاب نہیں لا سکتے اور ہم اس کو دیکھ نہیں سکتے گویا یہ فرما رہے ہیں کہ ؎

در سخن مخفی منم چوں بوئے گل در برگ گل
ہر کہ دیدن میل دارد در سخن بیند مرا

اور وہ سخن بھی کلام اللہ ہے جس کی شان یہ ہے کہ معنے[2] در معنے در معنے " جس قدر زیادہ پڑھتے جاؤ اسی قدر زیادہ علوم منکشف ہوتے جاویں گے چنانچہ حدیث میں ہے لا تنقضی عجائبہ[3] اور پھر لطف یہ کہ جاہلوں کو بھی لطف آتا ہے اور عالم کو بھی مزا

---

[1] میں کلام کے اندر اس طرح مخفی یعنی پوشیدہ ہوں جیسے پھول کی خوشبو اس کی پنکھڑیوں میں جو کوئی مجھے دیکھنا چاہے کلام کے اندر ہی مجھے دیکھ لے۔

[2] معنے کے اندر معنے، معنے کے اندر معنے

[3] اس کے عجیب عجیب مضامین قیامت تک ختم نہ ہوں گے۔

آتا ہے۔ صاحب ظاہر بھی جان کھوتا ہے اور صاحب باطن بھی قربان ہوتا ہے۔ ؎

بہار عالم حسنش دل وجاں تازہ میدارد
برنگ اصحاب صورت را ببو ارباب معنی را

حدیث میں ہے لَا يَخْلَقُ مِنْ كَثْرَةِ التَّرْدِيْدِ واقع میں مشاہدہ ہوتا ہے کہ کتنا ہی سنو جی نہیں بھرتا نیا مزا آتا ہے۔

قرآن شریف کی دلچسپی پر ایک شبہ اور اس کا جواب

اگر کہا جاوے کہ یہ سارا لطف خوش آوازی کی وجہ سے ہوتا ہوگا تو ہم کہیں گے کہ آخر وہ لطف اور وہ ربودگی جو قرآن پڑھنے سے ہوتی ہے۔ شعر پڑھنے سے کیوں نہیں ہوتی اس میں وہ مزا کیوں نہیں حاصل ہوتا اور اگر کسی کو اس میں زیادہ مزا آتا ہو تو وہ ابھی قابل خطاب ہی نہیں ہوا۔ اس کو چاہیئے کہ صحت ادراک وسلامت حال پیدا کرنے کی کوشش کرے پھر موازنہ کرے۔

لہ ایسکے حسن کی عالم کی بہار دل اور روح دونوں کو تازہ رکھتی ہے ظاہر والوں کو رنگ سے باطن والوں کو خوشبو سے لہ بہت بہت پڑھنے سے بھی پرانا نہیں ہوتا۔

صاحبو قرآن تو قرآن ہے کبھی اگر مکہ میں جا کر وہاں کی تکبیر اگر نماز میں سنو جو ایک جزو ہے قرآن کا تو معلوم ہو کہ کیا چیز ہے۔ سچ سچ اس وقت وہ تکبیر ایسی معلوم ہوتی ہے جیسے ذبح کے وقت کی تکبیر کہ دل میں چھری نکلتی جاتی ہے۔

طاعت میں اگر مزہ نہ آوے تو اس کو ترک نہ کرنا چاہیئے اور لذت حاصل کرنے کی تدبیر

لیکن اگر کسی کو مزہ نہ آوے وہ تلاوت ترک نہ کرے جیسا بعض لوگ کہتے ہیں کہ صاحب ہم تو اس وقت قرآن پڑھیں گے کہ جب ہم کو مزہ آنے لگے مگر یہ خیال بالکل ہی لغو ہے اس کی تو ایسی مثال ہے کہ کسی شخص سے کہا جاوے کہ تم مقویات کھا کر جلدی سے بالغ ہو جاؤ تاکہ تم کو سن بلوغ کے لطف حاصل ہو جائیں اور وہ جواب میں یوں کہے کہ صاحب پہلے سن بلوغ کی لذت کو میں دیکھ لوں کیسی ہوتی ہے۔ تب اس کی تدبیر کروں گا۔ فرمائیے کہ اس احمق کو کس طرح وہ لذت دکھلا دی جائے۔ اور سوائے اس کے اور کیا جواب اس کو دیا جاوے گا کہ تم جب بالغ ہو جاؤ گے خود تم کو معلوم ہوں گے۔ اس کے سوا کوئی تدبیر اس کے حصول کی نہیں اسی طرح ان نابالغ پیروں کو یہ جواب دیا جاتا ہے کہ اس

ؔ جو جاہل اور ذکر کی کیفیات سے خالی یعنی فن کے نابالغ ہیں۔ گو عمر میں بوڑھے ہوں۔

لذت کے حاصل کرنے کی کوئی تدبیر اس کے سوا نہیں کہ ہمت کرکے
پڑھتے لگو چند روز میں جب تمہارا قلب عالمِ طفلی سے نکل کر سنِ بلوغ
میں پہنچے گا۔ خود بخود اس کو یہ لذت حاصل ہوگی۔ البتہ یہ ضرور ہے
کہ یہ خاص بلوغ اس وقت حاصل ہوگا کہ تلاوت و دیگر اعمال میں
ہوائے نفسانی کا دخل نہ ہو بلکہ مطلقاً[1] اس ہوائے نفسانی کا اتباع چھوڑ دو
اور اطاعت خدا و رسول میں سرگرم ہو جاؤ کہ طریقت کا بلوغ یہی ہے

[2]خلق اطفالند جز مست خدا
نیست بالغ جز رہیدہ از ہوا

اور بعینہٖ یہی غلطی اکثر اہلِ سلوک کو ہوتی ہے کہ وہ ابتداء میں
یہ چاہتے ہیں کہ ہم کو ذکر میں لذت آنے لگے اور جب لذت حاصل
نہیں ہوتی تو پریشان ہوتے ہیں اور بعض اوقات ذکر کو چھوڑ دیتے
ہیں۔ حالانکہ یہ سخت غلطی ہے۔ کیونکہ ذکر میں لذت آنے کا اس کے
سوا اور کوئی طریقہ نہیں کہ ذکر کی زیادتی کرے۔ جس قدر ذکر زیادہ
ہوگا قلب زیادہ معتاد[3] ہوگا۔ دوسرے خیالات کمزور پڑیں گے۔
ذکر میں خود بخود لذت حاصل ہوگی۔ اس کی مثال یوں سمجھئے کہ فن
شاعری میں جو ملکہ پیدا ہو جاتا ہے کہ ایک شعر سن لیا اور طبیعت تلملا گئی

---

[1] ہر بات میں۔ [2] ساری مخلوق نابالغ بچے ہیں سوائے مردِ خدا کے اور کوئی بھی
بالغ نہیں سوائے اس کے جو خواہشات سے الگ ہوگیا ہو۔ [3] عادت والا۔

گئی ایک عمدہ بات کان میں پڑی کہ چہرہ کھل گیا۔ آخر یہ بات کب پیدا ہوتی ہے (اور دیکھو یہ کب پیدا ہوتی ہے) ظاہر ہے کہ ایک مدت کے بعد اور کثرتِ مشق و ممارست سے ہوتی ہے اور ابتداء میں ہرگز یہ حالت نہیں ہوتی بلکہ اول تو محض مشقت ہی ہوتی ہے۔ دیکھئے بچہ کو مکتب میں بٹھلاتے ہیں۔ سبق فارسی کا پڑھاتے ہیں مارتے ہیں پکڑ لاتے ہیں۔ اسی طرح جب سلسلہ جاری رکھا جاتا ہے۔ اس کو زبان دانی و سخن فہمی کا ایسا سلیقہ پیدا ہو جاتا ہے کہ کلام لطیف سنکر کیسا کچھ محظوظ ہوتا ہے پس کیا کسی شخص نے محض اس وجہ سے کہ ہم کو غالب اور مومن کا سا وجد کیوں نہیں پیدا ہوتا۔ شاعری کی مشق چھوڑ دی ہے یا کسی شاگرد نے اپنے استاد سے یہ فرمائش کی ہے کہ میں اس وقت شاعری شروع کروں گا کہ جب آپ کی طرح مجھے شعر میں لطف آنے لگے گا۔

صاحبو کیا قرآن شریف کی تلاوت اتنی بھی ضروری اور مرغوب نہیں جتنی فارسی اور شاعری کی تحصیل۔ صاحبو جس طرح اس مثال میں ظاہری کیفیات میں ایک وقت وہ تھا کہ نہ تھیں اور ایک وقت وہ ہے کہ علیٰ وجہ الکمال ہیں۔

---

[1] بہت استعمال و برتنے سے۔ [2] پوری پوری طرح بس ایسے سے ہی ایک وقت وہ ہوگا کہ تلاوت میں کوئی کیفیت اور مزا نہ ہوگا پھر ایک وقت بہت لطف و کیف آئے گا۔

سالک کا کام محض طلب ہے، اگر کیفیات باطنی نہ ہوں تب بھی کام کئے جائے

اسی طرح باطنی کیفیات بھی گو اس وقت حاصل نہیں لیکن اگر کام کئے جاؤ گے تو ایک وہ وقت بھی ضرور آوے گا کہ سب حاصل ہو جاویں گے۔ ارشاد ہوتا ہے کَذٰلِكَ كُنْتُمْ مِّنْ قَبْلُ فَمَنَّ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ[1] ؎

اندریں رہ می تراش و می خراش | تا دمِ آخر دمے فارغ مباش
تا دمِ آخر دمے آخر بود[2] | کہ عنایت با تو صاحب سِر بود

اس قسم کے مواقع پر حضرت حاجی امداد اللہ صاحب نور اللہ مرقدہ یہ پڑھا کرتے تھے ؎

یا بم او را یا نیابم جستجوئے میکنم[3] | حاصل آید یا نیاید آرزوئے میکنم

---

[1] ایسے ہی تھے تم بھی پہلے پھر اللہ تعالیٰ نے تم پر احسان فرمایا ہے [2] اس راستہ میں تو کاٹ چھیل کرتے ہی رہو آخر وقت تک ایک منٹ کو بھی خالی نہ بیٹھو۔

[3] آخری وقت تک کہ ایک آخری سانس ہو تا کہ ان کی عنایت تمہاری رازدار بن جائے [3] میں اس کو پاؤں یا نہ پاؤں تلاش و طلب کرتا رہتا ہوں وہ حاصل ہو یا نہ ہو میں آرزو کرتا ہی رہتا ہوں۔

جو کچھ بھی ہو تم کام کئے جاؤ۔ تمہارا کام محض طلب ہے کیونکہ تمہارے اختیار میں وہی ہے۔ ثمرہ کا ملنا نہ ملنا یہ اُن کا کام ہے تم اس کے درپے نہ ہو ؎

فراق و وصل چہ باشد رضائے دوست طلب[1]
کہ حیف باشد ازو غیر او تمنّائے

ایک دوسرے بزرگ اس سے بڑھ کر فرماتے ہیں ؎

اُرِیْدُ وِصَالَہٗ وَیُرِیْدُ ھَجْرِیْ[2] فَاَتْرُکُ مَا اُرِیْدُ لِمَا یُرِیْدُ

اور صاحبو اگر یہ نہ کہا جاوے تو کیا خدا سے بدلا لینا ہے اگر وہ ہمارا کام نہیں کرتے تو ہم ان کا کام کیوں کریں۔ غور کیجیو اگر ایک مُردار بازاری عورت سے تعلق ہو جاتا ہے تو قلب پر کیا کیا صدمے گذرتے ہیں۔ کس کس انداز سے وہ امتحان اور آزمائش کرتی ہے۔ کتنا موقع بہ موقع ستاتی ہے لیکن آتش محبت مشتعل ہوتی چلی جاتی ہے یہ نہیں ہوتا کہ اس کے امتحانات یا غمزوں سے گھبرا کر اس کو چھوڑ دیں تو کیا ذات باری جلّ مجدہٗ کی محبّت اور عظمت مسلمان کے دل میں اتنی بھی نہ ہو جتنی ایک بازاری عورت

---

[1] ہجر و وصل کیا ہوتا ہے۔ محبوب کی خوشی طلب کر دکیونکہ اس سے اس کے سوا کچھ طلب کرنا ہی افسوسناک چیز ہے [2] میں تو اس کا وصل طلب کرتا ہوں اور وہ میرا ہجر تو میں اپنی طلب کو اسکی طلب پر نثار کرتا اور چھوڑ دیتا ہوں۔

کی حیف ہے ہم پیر او رہبارِ اسلام پہ ؎

عشقِ مولیٰ[1] کے کم از لیلیٰ بود　　گوی گشتن بہر او اولیٰ بود

طالب کیسا ہونا چاہیئے

حکایت: ایک عارف کا واقعہ لکھا ہے کہ ان کو ایک روز یہ آواز آئی کہ کتنی ہی عبادت کرو کچھ قبول نہیں اس آواز کو ان کے ایک مرید نے بھی سُنا۔ دوسرا دن ہوا تو وہ بزرگ پھر عبادت کے لئے اُٹھے پھر وہی آواز آئی جب کئی مرتبہ ایسا ہوا تو مرید نے کہا کہ آپ بھی عجیب آدمی ہیں اُدھر کوئی پوچھتا بھی نہیں اور آپ ہیں کہ خواہ مخواہ گرے جاتے ہیں۔ جب قبول ہی نہیں تو محنت سے کیا فائدہ۔ ان بزرگ نے جواب میں فرمایا ؎

تو[2] انی از آن دل بپرداختن　　کہ دانی کہ بے او توان ساختن

کہا کہ بھائی چھوڑ تو دوں لیکن یہ تو بتلا دو کہ چھوڑ کر کس در پہ جا پڑوں اس جواب پر رحمتِ باری کو جوش ہوا اور آواز آئی ؎

قبول[3] ست گرچہ ہنر نیستت　　کہ جز ما پناہِ دگر نیستت

---

[1] خدا کا عشق لیلیٰ کے عشق سے کب کم ہو سکتا ہے اس کیلئے تو گیند کی طرح لڑھکتے رہنا ہی بہتر ہے [2] تم اس وقت دل کو خالی کر سکتے ہو کہ جان لو کہ بے اُسکے بھی بن سکتی ہے [3] قبول ہے گو ہنر تمہارے پاس خود چیز نہیں ہے کیونکہ ہمارے سوا تمہارے لئے کوئی پناہ بھی نہیں ہے۔

کہ اگرچہ تمہاری عبادت تو کسی ڈھنگ کی نہیں لیکن خیر جب ہمارے سوا تمہارا کوئی نہیں ہے تو تم کو بھی ہم ہی لے لیں گے۔

صاحبو طالبین کی یہ حالت ہونی چاہیئے کہ ؎

طلب گار باید صبور و حمول ؎۱ — کہ نشنیدہ ام کیمیا گر ملول

افسوس ہے کہ طلب خدا طلب کیمیا کی بھی برابر نہ ہو کہ اس میں تو انسان سالہا سال گنوا دے۔ مال و متاع غارت کر دے۔ چین و آرام کو خیرباد کہہ دے اور طلب خدا میں کچھ بھی نہ ہو سکے طالب کی تو یہ حالت ہوتی ہے کہ ؎

؎۲ برند از برائے دلے بارہا — خورند از برائے گلے خارہا

اور اس کی یہ حالت ہوتی ہے کہ ؎

؎۳ خوشا وقت شوریدگان غمش — اگر ریش بنید و گر مرہمش

گدایانے از بادشاہی نفور — بامیدش اندر گدائی صبور

؎۱ طلب والے کو تو صبر و تحمل والا ہونا ضروری ہے کیونکہ ہم نے کسی کیمیا کے دھنی کو اکتا جانے والا نہیں سنا ؎۲ ایک دل کی وجہ سے بہت بوجھ اٹھا لیتے ہیں اور ایک پھول کی وجہ سے بہت سے کانٹے کھا لیتے ہیں

؎۳ کیسا اچھا وقت ہے ان کے غم کے سرمستوں کا اگرچہ زخم دیکھیں یا اس کا مرہم دیکھیں ؎ وہ فقیر لوگ کہ بادشاہی سے نفرت کرنے والے صرف ان کی امید پر ہی فقیری میں صبر کرنے والے۔

دما دم شراب الم درکشند ۔۔۔ اگر تلخ بینند دم درکشند

اور جو شخص صرف مرہم کا طالب ہو وہ بیچارے تو بجائے حصول کے امید پر ہی نظر لگائے بیٹھے ہیں۔ جیسا کہ اوپر کے شعر میں ہے۔

بامیدش اندر گدائی صبور ایک طالب کا قول ہے ؎

اگرچہ دور افتادم بدیں اُمید خرسندم
کہ شاید دست من بار دگر جانان من گیرد

طالب وہی ہے کہ اگر ہزار مرتبہ اس کو کہا جاوے کہ تو دوزخی ہے تو مایوس نہ ہو اور دس ہزار مرتبہ کہا جاوے کہ تو جنتی ہے تو کاہل اور سست نہ بنے اس کی طلب کی یہ حالت رہے ؎

اے برادر بے نہایت درگہیست ۔۔۔ ہرچہ بروے میرسی بروے مایست

طالب کے کیسے کیسے امتحان لئے جاتے ہیں

حکایت: ایک شخص کی نسبت لکھا ہے کہ اس کو روزانہ یہ

---

[۱] غم کی شراب دمبدم پیتے رہتے ہیں اگر بہت کڑوی دیکھینگے تو دم کھینچ لیں گے [۲] اگرچہ میں دور پڑا ہوں مگر اس امید پر خوش ہوں کہ شاید میرا محبوب اور ایک مرتبہ میرا ہاتھ پکڑ لے [۳] اے بھائی وہ تو ایسی درگاہ ہے جس کی کوئی انتہا ہی نہیں۔ جس جگہ تم پہنچ گئے۔ وہیں نہ کھڑے رہ جاؤ۔

آواز آتی کہ تو کافر ہو کر مرے گا۔ جب ایک مدت تک یہ آواز آئی تو شیخ سے ذکر کیا۔ انہوں نے فرمایا کہ میاں یہ دشنام محبت ہے مایوس نہ ہو جانا۔ محبوبوں کی عادت ہے کہ محب کو چھیڑا کرتے ہیں خوب کہا ہے ؎

بدم گفتی و خورسندم عفاک اللہ نکو گفتی[۱]
جواب تلخ می زیبد لب لعل شکر خارا

اور یہ ایک قسم کا امتحان ہے۔

سارے امتحانات اس وقت برداشت ہوتے ہیں جبکہ دل میں خدا کی محبّت پُوری پُوری ہو

لیکن یہ ساری باتیں اس وقت برداشت ہوتی ہیں کہ دل میں خدا کی محبت پوری پوری ہو پس اسکی کوشش کرو۔

خدا تعالیٰ کی محبّت حاصل کرنے کا طریقہ

اور اس طریق کے دو امر ہیں۔ ذکر کی کثرت اور اہل اللہ کی

---

[۱] تم نے مجھے بُرا کہا تو میں خوش ہوں اللہ تم کو معاف کرے تم نے ٹھیک ہی کہا کیونکہ سرخ شکر چبانے والے میٹھے شیریں لبوں کو کڑوا جواب ہی زیب دیتا ہے۔

صحبت، ان کے پاس آنا جانا اس سے تدریجاً ماسوی اللہ سب تمہارے دل سے نکلنے شروع ہو جاویں گے اور یہ حالت ہو گی ہے

[۱] عشق آں شعلہ است کو چوں بر فروخت ہر چہ جز معشوق باقی جملہ سوخت
[۲] تیغ لا در قتل غیر حق براند در نگر آخر کہ بعد لا چہ ماند
[۳] ماند الا اللہ باقی جملہ رفت مرحبا اے عشق شرکت سوز زفت

سلوک کی ترتیب

اس تقریر سے ترتیب سلوک کی یہ نکلی کہ اول کسی صاحب محبت کو ڈھونڈ کر اس کے پاس جا پڑو اور اس کی حسب ہدایت کام میں لگ جاؤ۔ ثمرات کے طالب نہ ہو۔ خود بخود ہوں تو خدا کا فضل سمجھو۔ طاعت میں لذت نہ ہو تو اس کو چھوڑو مت۔ کثرت سے ذکر کرو اس میں قرآن بھی داخل ہے۔

---

[۱] عشق تو وہ شعلہ ہے کہ جب بھڑک اٹھتا ہے تو سوائے معشوق کے باقی سب کو پھونک دیتا ہے [۲] لا (نہیں) کی تلوار حق کے سوا سب کے قتل میں پھیر ڈالی پھر دیکھو آخر لا کے بعد کیا رہ گیا ہے۔

[۳] الا اللہ رہ گیا باقی سب چلتا ہو گیا۔ اے پیٹرول کی طرح شرکت کو جلا دینے والے عشق مرحبا مرحبا

تلاوت قرآن کے لئے تصحیح[1] الفاظ بقدر طاقت ضروری ہے اور خلوص قلب اس سے زیادہ ضروری ہے

اگر پڑھتے ہوئے طبیعت اکتانے لگے تو اسی کی کثرت کرو۔ اگر الفاظ بھی صحیح نہ ہوں تو اپنے امکان بھر کوشش تصحیح کی کرو۔ اگر پوری[2] کامیابی نہ ہو تو دلگیر مت ہو اسی طرح قبول ہے الفاظ پر تو انہیں سے گرفت ہوگی جو الفاظ درست کر سکتے ہیں اور پھر نہیں کرتے ورنہ زیادہ تر دیکھ بھال اور چھان بین دلوں کی ہوگی اگر موٹی زبان کا آدمی غلط پڑھتا ہے لیکن دل سے پڑھتا ہے تو خدا کے نزدیک یہ غلط اس صحیح سے ہزار درجہ بہتر ہے جس کی غرض ریا یا اظہار کمال ہو۔

حکایت۔ اس موقع پر مجھے ایک شخص کی حکایت یاد آئی۔

---

[1] لفظوں کو صحیح کرنا اور ان کے حرفوں کو صحیح مخرج اور صفتوں کے ساتھ اپنی طاقت کے موافق نکالنا [2] کوشش کرنے پر بھی پوری کامیابی نہ ہو اور اگر کوشش نہ کی گئی تو نہ سیکھنے کا گناہ رہے گا۔

ایک شخص مجھ سے تعلق رکھتا تھا مجھ سے کہنے لگا کہ میں کسی فقیر سے طالب ہو جاؤں میں اس پر ناراض ہوا اور سمجھا دیا چند روز کے بعد پھر آیا تو میں اس سے مزاحاً کہنے لگا کہ کیوں کسی فقیر کے طالب بھی ہوئے تو وہ نہایت خلوص اور تازگی سے جواب دیتا ہے کہ بس اب تو تیرا ہی پلہ پکڑ لیا اس کا تیرا یہ کہنا ہزاروں حضور اور جناب سے زیادہ لذت بخش تھا کیونکہ دل سے تھا۔

بعض وقت بہ نسبت نرمی کے سختی سے زیادہ اصلاح ہوتی ہے

جس طرح نرمی علاج ہے گرمی بھی اس سے بڑھ کر علاج ہے اور یہی وجہ ہے بعضے بزرگ درشت مزاج مشہور ہو جاتے ہیں تو خوب سمجھ لو وہ درشت مزاج نہیں بات یہ ہے کہ بعض اوقات اگر ایک بات کو نرمی سے سمجھایا جاوے تو دل پر اس کا اتنا اثر نہیں ہوتا اور نہ وہ اتنی مدت تک یاد رہتی ہے جتنا کہ بدرشتی سمجھانے سے کالنقش علی الحجر[1] ہو جاتی ہے۔

---

[1] سختی سے سمجھانے سے پتھر پر لکیر کی طرح

جس کا دِل محبت سے بھرا ہُوا ہو اس کو اگر صحیح بولنے پر
قدرت نہ ہو تو اس کا غلط بولنا بھی پیارا معلوم ہوتا ہے،
غرض غلط بولنا جو پیارا معلوم ہوتا ہے اسکی وجہ یہ
ہوتی ہے کہ اس سے زیادہ پر قدرت نہیں ہوتی۔

حکایت: چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں راعیؑ
کا قصہ مشہور ہے کہ زمین پر بیٹھا ہُوا محبت کے جوش میں خداتعالیٰ
کو خطاب کرکے یہ کلمات کہہ رہا تھا ؎

تو کجائی تا شوم من چاکرت ۔ چارقت دوزم کنم شانہ سرت

وامثال ذالک. اتفاقاً حضرت موسیٰ علیہ السلام اس طرف
سے گذرے۔ یہ کلمات سنکر فرمایا کہ میاں کس کو کہہ رہے ہو اس
نے کہا کہ خدا سے حضرت موسےٰ نے ڈانٹا اور ڈانٹ کر چلے گئے
راعی نے جو سُنا تو مارے خوف کے تھرا گیا اور سخت پریشان ہُوا

ؑ چرواہے کا ۔ ۲ے تو کہاں ہے تاکہ میں تیرا خادم بنوں تیرے کپڑے سیوں تیرے
سر میں کنگھی کیا کروں ۳ے اور بھی ایسی باتیں ۔

اسی وقت حضرت موسےؑ پر وحی آئی کہ اے موسےؑ تم نے ہمارے
بندے کو ہم سے جدا کر دیا اسی حکایت کو مولانا روم فرماتے ہیں ؎

زیں نمط بیہودہ میگفت آن شبان ۔ گفت موسیٰ باکیستت اے فلاں
گفت باآں کس کہ مارا آفرید ۔ ایں زمین و چرخ ازو آمد پدید
گفت موسیٰ ہائے خیرہ سر شدی ۔ خود مسلماں نا شدہ کافر شدی
گفت اے موسیٰ دہانم دوختی ۔ وز پشیمانی تو جانم سوختی
وحی آمد سوئے موسیٰ از خدا ۔ بندۂ مارا چرا کردی جدا
تو برائے وصل کردن آمدی ۔ نے برائے فصل کردن آمدی

حضرت موسےؑ نے جو یہ سنا تو گھبرا گئے اور جلدی سے آکر
چرواہے سے معافی چاہی یہاں چرواہے کی عجب حالت تھی موسیٰؑ
نے جو معافی چاہی تو اس نے یہ جواب دیا کہ اے موسیٰؑ ایسا تازیانہ

لے وہ چرواہا ایسی بیہودہ باتیں کر رہا تھا کہ موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا اے فلاں
تو کس کے ساتھ بات کر رہا ہے ؂ بولا اس ذات کے ساتھ جس نے ہم کو پیدا کیا ہے
اور یہ زمین و آسمان سب اسی سے پیدا ہوئے ہیں ؃ موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا ہائے تو تو
بے مراہو گیا خود مسلمان ہی نہیں رہا کافر ہو گیا کہ خدا تعالیٰ کو کپڑے سرکنگھا اور خدمت کا فرد حمد
قرار دیدیا ۔ ؄ عرض کیا اے موسیٰ آپ نے تو میرا منہ سی دیا اور شرمندگی سے میری جان ہی پھونک
ڈالی ؅ حضرت موسیٰ علیہ السلام پر خدا تعالیٰ کی طرف سے وحی آئی کہ تم نے ہمارے بندہ کو ہم سے
بچھوڑا جدا کر دیا ؆ تم تو بندوں کو مولا سے ملانے کیلئے آئے ہو جدا کرنے کے لئے نہیں آئے۔

لگا ہے کہ میں بڑی دُور پہنچ گیا ع

آفریں بر دست و بر بازوئے تو[1]

اس جملہ حکایت سے معلوم ہو گیا ہو گا کہ اگر زبان پر بوجہ کم سمجھی اور کم عقلی کے گستاخانہ الفاظ بھی ہوں لیکن دل محبت سے معمور ہو تو الفاظ پر نظر نہیں ہوتی لیکن یہ ضرور ہے کہ ان فروگذاشتوں کی معافی انہیں لوگوں کے لئے ہے کہ جن کو تصحیح پر قدرت نہیں ہے ورنہ اگر قدرت کے باوجود ایسا کرے تو ضرور گناہ گار ہو گا۔

تصحیح الفاظ کیلئے کتابیں پڑھنا کافی نہیں کسی قاری سے مشق کرنا ضروری ہے اور بعض لوگوں کے ایک نامعقول عذر کی تردید

افسوس ہے کہ اس وقت اس امر تصحیح الفاظ کی طرف سے ایسی بے توجہی ہے کہ لوگ اس کو بالکل ضروری نہیں سمجھتے۔ اکثر لوگ پوری درسیات ختم کر جاتے ہیں لیکن ان کو قرآن پڑھنے کا سلیقہ نہیں ہوتا سمجھتے ہیں کہ صرف کی کتابوں میں صفات حروف و مخارج پڑھ لے

---

[1] تمہارے ہاتھ اور بازو کو شاباش ہو۔

ہیں اس سے زیادہ اور کیا چاہیئے ۔ حالانکہ یہ بالکل غلط خیال ہے قرآن کا پڑھنا اس وقت تک نہیں آتا کہ جب تک خاص کسی سے اس کو نہ سیکھا جائے ۔ نری درسیات سے کچھ نہیں ہوتا ۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ جب ہم نے مشق نہیں کی تو ہم کو غلط پڑھنا جائز ہونا چاہیئے اور ہم کو معذور سمجھنا چاہیئے لیکن یہ عذر ایسا ہے کہ میں نے ایک سپارہ پڑھنے والے طالب علم سے کہا کہ حاجی جی کو بلا لا ۔ وہ حافظ جی کو بلا لایا ۔ میں نے کہا یہ کیا حماقت ہے ۔ کہاں حافظ جی کہاں حاجی جی ان کے تو حروف بھی الگ الگ ہیں تو کہتا ہے جی میں نے مخارج کی مشق نہیں کی تو کیا یہ عذر قبول ہو سکتا ہے ۔ تو جیسا یہ شخص اس غلطی سے بچ سکتا تھا ۔ اسی طرح جب مشق ممکن ہے تو ایسے اغلاط سے ان کو بچنا ممکن ہے صاحبو یہ سب بہانے ہیں ۔ بات اصلی وہی ہے کہ خدا کی محبت اور اس کا خوف دل سے جاتا رہا اگر آج یہ اشتہار دے دیا جائے کہ جو شخص مخارج حروف صحیح کر کے سنا دے اس کو فی حرف پانچ روپے ملیں گے تو آج ہی شہر کے شہر قرائت شروع کر دیں اور کچھ نہ کچھ تصحیح کر کے انعام لینے کھڑے ہو جائیں لیکن افسوس ہے کہ خدا کی رضا کے لئے امنگ نہیں پیدا ہوتی یہ تو تفریط تھی متعلمین کی۔

لہ ان بہانوں سے نہ سیکھنے کا گناہ نہیں ہٹ سکتا ۱۲ کوتاہی پڑھنے والوں کی ۔

جسے تصحیح الفاظ پر قدرت نہ ہو وہ جس طرح پڑھ سکے جائز ہے

اب افراط[1] سنئے بعض معلمین و مصلحین[2] کا کہ جن سے بالکل نہ ہو سکے وہ ان کو بھی مجبور کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ بدوں اس کے قرآن پڑھنا ہی بے فائدہ ہے جیسا مشہور ہے کہ ایک پیر جی صاحب نے ایک دیہاتی سے پوچھا کہ روزہ کی نیت بھی یاد ہے۔ اس کو چونکہ کوئی خاص عبارت یاد نہیں تھی اس لئے اس نے کچھ نہیں بتلائی۔ پیر جی نے فرمایا کہ بے نیت روزہ نہیں ہوتا دیکھ روزہ کی نیت یوں کر تَصُوْمِ غَدٍ نَوَیْتُ اس بیچارے نے کاہے کو کبھی اس قسم کے الفاظ سنے تھے فوراً تو یاد کر نہ سکا نتیجہ یہ ہوا کہ دوسرے دن روزہ نہ رکھا۔ ان ہی بزرگ نے پوچھا تو یہ کہا کہ بلا نیت روزہ نہیں ہوتا اور نیت یاد نہیں ہوتی غرض جو لوگ صحیح پڑھ سکتے ہیں وہ تو صحیح پڑھیں اور جو لوگ اس پر قادر نہیں ان کو جس طرح وہ پڑھ سکیں جائز ہے۔ بعض لوگ کہا کرتے ہیں کہ صاحب ہماری آواز چونکہ اچھی

---

[1] زیادتی پڑھانے اور اصلاح کرنے والوں کی[3] میں نے کل کے روزہ کی نیت کر لی ہے

[2] لیکن صحیح کرنا سیکھتے رہیں ورنہ نہ سیکھنے کا گناہ رہے گا۔

نہیں اس لئے ہم نہیں پڑھتے سوا یسے لوگوں کو یاد رکھنا چاہئے کہ تحسین صوت اس کو نہیں کہتے کہ خوب راگنی سے گا کر پڑھا جاوے۔ تحسین صوت کے معنی جیسا بزرگوں سے منقول ہے یہ ہیں کہ سننے والے کو اس کی آواز سنکر یہ معلوم ہو کہ اس کے دل پر کسی با عظمت کا رُعب چھایا ہوا ہے۔

عشرۂ اخیرہ کے فضائل اور ضعفا اور اقویا کے لئے اس میں عبادت کرنے کا دستور العمل

جب قرآن[ا] ایسا مشرف و معظم ہے تو جس ماہ میں اس کا یہ نزول دفعی[ا] ہوا ہے وہ بھی معظم ہوگا بالخصوص وہ عشرہ خاص ماہ رمضان کا کہ جس میں شب قدر ہے کیونکہ رمضان کو جب قرآن کی وجہ سے

ا اور ایک حدیث میں یوں بھی ہے جب تم قرآن شریف پڑھو تو روؤ اور اگر نہ روؤ تو روتے بن جاؤ یعنی ایسی آواز نکالو جس سے دل میں درد معلوم ہو ۲ بیس رمضان شریف بعد مغرب سے عید کا چاند نظر آنے تک آخر کی دس دن راتیں

۳ جس کا سرخی (قرآن شریف جمال حق کے لئے آئینہ ہے الخ) میں بیان ہوا۔

۴ ایک دم کہ لوح محفوظ سے آسمان دنیا پر ایک دم لیلۃ القدر میں نزول ہوا ہے اور نیچے تیئیس سال میں۔

شرف حاصل ہوا تو رمضان کا وہ حصہ خاص جس میں نزول ہوا ہے دوسرے حصوں کی نسبت اشرف ہوگا اس لئے کہ دوسرے حصوں میں شرف اس حصہ کی بدولت آیا ہے۔ پس جب نزول شب قدر میں ہوا ہے اور شب قدر جیسا کہ حدیثوں سے ثابت ہے عشرہ اخیرہ میں ہوتی ہے تو عشرہ اخیرہ بقیہ حصہ رمضان سے ضرور افضل ہوا ایک فضیلت تو عشرہ اخیرہ کی اس نزول قرآن سے ہوئی دوسری فضیلت اس کی اس سے ہے کہ اس میں شب قدر ہے جس کی فضیلت کے لئے خدا تعالےٰ ارشاد فرماتے ہیں وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا لَيْلَةُ الْقَدْرِ لَيْلَةُ الْقَدْرِ خَيْرٌ مِّنْ اَلْفِ شَهْرٍ کیونکہ حدیثوں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ شب قدر عشرہ اخیرہ کی طاق راتوں میں ہے یعنی ۲۱۔ ۲۳۔ ۲۵۔ ۲۷۔ ۲۹ اور بعض حدیثوں میں مطلق عشرہ اخیرہ بھی آیا ہے۔ دونوں کے ملانے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یا تو ایک حدیث دوسری کی تفسیر ہے یا اکثر تو طاق راتوں میں ہوتی ہے لیکن کبھی کبھی جفت راتوں میں بھی ہو جاتی ہے نیز بعض لوگوں کو جفت راتوں

لہ کیونکہ آیت شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ (رمضان ہی وہ مہینہ ہے جس میں قرآن نازل کیا گیا) بتاتی ہے کہ پورے رمضان کو فضیلت قرآن شریف کے نازل ہونے سے ہوئی ہے لہ اور کیا معلوم ہے آپ کو کیا ہے لیلۃ القدر لیلۃ القدر ایک ہزار مہینہ (۸۳ سال ۴ ماہ) سے بہتر ہے ÷

میں کبھی ہوتا مکشوف بھی ہوتا ہے تو قوی اور تندرست لوگوں کو تو یہ مناسب ہے کہ وہ اس عشرہ کی ہر رات میں اور شبوں سے زیادہ عبادت کریں اور ضعفاء کے لئے یہ مناسب ہے کہ وہ کم از کم طاق راتوں میں ضرور جاگ لیں۔ صاحبو ایسی برکت اور خیر کی چیز ہے کہ اس سے محروم ہو جانا گویا تمام چیز سے محروم ہو جانا ہے چنانچہ حدیث میں ہےؔ مَنْ حُرِمَ لَيْلَةَ الْقَدْرِ فَقَدْ حُرِمَ الْخَيْرَ كُلَّهٗ

لیلۃ القدر کی فضیلت اکثر حصہ شب میں جاگنے سے بھی حاصل ہو جاتی ہے اور تمام رات جاگنے کی زیادہ فضیلت اور ترغیب

لیکن اس میں بعض لوگ یہ سمجھے ہوئے ہیں کہ اگر جاگا جاوے تو تمام شب جاگا جاوے اور اگر تمام شب نہ جاگا جاوے تو کچھ فائدہ نہ ہوگا یہ خیال بالکل لغو ہے۔ اگر اکثر حصہ شب میں بھی جاگ لے تب بھی لیلۃ القدر کی فضیلت حاصل ہو جاتی ہے اور

ؔ جو لیلۃ القدر سے محروم کر دیا گیا وہ ہر چیز سے محروم کر دیا گیا۔

میں کہتا ہوں کہ اگر ساری رات بھی جاگ لیا جاوے تو کیا مشکل ہے یہ مبارک رمضان سال بھر کے بعد آتے ہیں۔ آپ کو معلوم ہوگا کہ پچھلے سال رمضان میں بہت سے لوگ ایسے تھے کہ وہ اس وقت دنیا میں نہیں رہے ہم کو کیا خبر ہے کہ آئندہ رمضان تک کس کس کی باری ہے اس لئے اگر ایسی بڑی نعمت حاصل کرنے کے لئے کوئی ایک دو رات جاگ ہی لیا تو کیا دقت کی بات ہے۔

اگر تمام رات عبادت کرنے کی ہمت نہ ہو تو بہتر ہے کہ اس کے لئے اخیر شب تجویز کی جاوے اور

اخیر شب کی خوبیاں

لیکن خیر اگر تمام رات کی ہمت نہ ہو تو اکثر حصہ کو تو چھوڑنا ہی نہ چاہیئے اور بہتر یہ ہے کہ یہ اکثر حصہ اخیر شب کا تجویز کیا جاوے کیونکہ اول تو اس وقت معدہ کھانے سے پُر نہیں ہوتا دُعا میں جی لگتا ہے دوسرے حدیث میں آیا ہے کہ خدائے تعالیٰ اخیر شب میں روزانہ اپنے بندوں کے حال پر رحمت خاص متوجہ فرماتے ہیں اس کے علاوہ اخیر شب میں ویسے بھی سکون ہوتا ہے اور اس میں ہر شب[1] شریک ہے۔

[1] آخر شب میں رحمت خاص اور سکون ہونے میں ہر رات شریک ہے سب میں یہ بات موجود ہے۔

شب قدر کو کیسا شخص پا سکتا ہے

کسی نے خوب کہا ہے[1] مَنْ لَمْ يَعْرِفْ قَدْرَ اللَّيْلَةِ لَمْ يَعْرِفْ لَيْلَةَ الْقَدْرِ یا اور اس قول کی وجہ یہ ہے کہ لیلۃ القدر انہیں راتوں میں سے کسی رات میں ہوگی تو جو شخص راتوں کی قدر کریگا وہ لیلۃ القدر بھی پا دے گا، جو بیقدری کر کے خواب غفلت میں گذارے گا وہ حسب عادت لیلۃ القدر سے بھی محروم رہے گا اس لئے بعضے بزرگوں نے کہا ہے[2] مَنْ اَحْيَى السَّنَةَ كُلَّهَا اَدْرَكَ لَيْلَةَ الْقَدْرِ کیونکہ جب سال بھر تک برابر شب بیداری کرے گا تو لیلۃ القدر میں عبادت ضرور ہو جاوے گی کہ انہیں راتوں میں ایک رات وہ بھی ہے۔ بوستان میں حکایت ہے کہ کسی شاہزادہ کا ایک لعل شب کے وقت کسی جگہ گر گیا تھا اس نے حکم دیا کہ اس مقام کی تمام کنکریاں اٹھا کر جمع کریں اس کا سبب پوچھا۔ تو کہا کہ اگر کنکریاں چھانٹ کر جمع کی جاتیں تو ممکن تھا کہ لعل ان میں نہ آتا اور جب ساری کنکریاں اٹھا لی گئی ہیں تو لعل ضرور آگیا ہے کسی نے اسی کا ترجمہ خوب کیا ہے۔

---

[1] جو رات کی عزت نہ پہچانے گا وہ لیلۃ القدر کو بھی نہ پہچانے گا [2] جو سارے سال شب بیداری کرے گا لیلۃ القدر کو پا ہی لے گا۔

اےؔ خواجہ چہ پرسی ز شب قدر نشانی
ہر شب شب قدر است اگر قدر بدانی

رمضان کے عشرہ اخیرہ خاصکر ستائیسویں رات میں ضرور بیدار رہنا چاہیئے کہ اگر اس میں شب قدر نہ ہوئی تب بھی اُمید ہے کہ شب قدر کا ثواب ملے گا

لیکن خیر ایسے باہمت لوگ تو اس وقت کہاں ہیں کہ وہ اس گوہرِ بے بہا کی تلاش میں سال بھر شب بیداری کریں مگر رمضان کے عشرہ اخیرہ میں تو ضرور ہی بیدار رہنا اور عبادت کرنا چاہیئے کیونکہ ان راتوں میں شب قدر کا ہونا اغلب ہے اور اگر کوئی شخص نہایت ہی کمزور اور کم ہمت ہو تو خیر وہ ستائیسویں رات کو ضرور ہی بیدار رہے کہ وہ شب اکثر شبقدر ہوتی ہے اور میں کہتا ہوں کہ اگر اتفاق سے وہ رات شب قدر نہ بھی ہوئی تو تم نے بہ گمان شب قدر اس میں عبادت کی تو انشاء اللہ تعالےٰ تم کو شب قدر

لہ اے بزرگ تم لیلۃ القدر کی نشانی کیا پوچھتے ہو ہر رات شب قدر ہے اگر اسکی قدر پہچان لو یعنی ہر آخر شب کی عبادت کو دوسرے وقتوں پر فضیلت و قدر ہے اگر قدر کرو +

ہی کا ثواب عطا ہوگا اور یہ کوئی گھڑی ہوئی بات نہیں ہے حدیث میں اس کی اصل ہے حضور ارشاد فرماتے ہیں اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّیَّاتِ پھر ممکن ہے کہ اس کلیہ سے کسی کی تشفی نہ ہو تو دوسری حدیث موجود ہے حضور ارشاد فرماتے ہیں اَلصَّوْمُ یَوْمَ تَصُوْمُوْنَ وَالْفِطْرُ یَوْمَ تُفْطِرُوْنَ وَالْاَضْحٰی یَوْمَ تُضَحُّوْنَ ۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ اگر ایک شخص نے نہایت کوشش سے رمضان کے چاند کی تحقیق کی اور اس تحقیق کی بنا پر روزے رکھنے شروع کر دئیے پھر ختم رمضان پر عید کے چاند کی اسی طرح چھان بین کی اور اس کی بنا پر عید کر لی اسی طرح عید الضحٰے میں بھی کیا اور چند دنوں کے بعد معلوم ہوا کہ تینوں تحقیق خلاف واقع تھیں تو اس صورت میں دل شکستہ نہ ہونا چاہیئے ۔ بلکہ جس دن روزہ رکھا وہی دن عند اللہ باعتبار قبول روزہ کا تھا اور جس دن عید کی وہی دن عید کا تھا یعنی روزہ اور عید دونوں مقبول ہیں بس اسی طرح میں کہتا ہوں کہ اگر شب قدر کی نیت سے عبادت ہوئی ہے اور اتفاق سے وہ شب قدر نہ ہوئی تو ثواب شب قدر کامل جاوے گا ۔ صاحبو اس تقریر کے بعد تو بہت ہی آسان معاملہ ہو گیا ۔ اب بھی اگر ہمت نہ کی جاوے تو غضب ہے ۔ یہ

لے تمام عملوں کا ثواب نیتوں سے ہی ہوتا ہے ۲ے روزہ اس دن ہے جب تم لوگ روزہ رکھتے ہو اور فطر اسی دن ہے جس دن تم افطار کرتے ہو اور اضحی اس دن ہے جس روز تم اضحیہ کرتے ہو یعنی قربانی کرتے ہو ۔

دوسری فضیلت تھی عشرہ اخیرہ کی۔

رجوع بجانب امر ثانی (عشرۂ اخیرہ کے فضائل) (۲)

تیسری فضیلت اس عشرہ میں یہ ہے کہ اس میں اعتکاف مشروع ہے اور ممکن ہے کہ یہ پہلی فضیلت کا تتمہ ہو جیسا کہ بعض نے کہا کہ اعتکاف شب قدر ڈھونڈنے کے لئے ہے اور ممکن ہے کہ یہ مستقل فضیلت ہو جبکہ اعتکاف کو دوسری حکمتوں سے بھی مشروع کہا جاوے خیر جو کچھ بھی ہو ہم کو اس سے کیا غرض ہم کو کام کرنا چاہیئے احکام کے حکم اور مصالح کی تلاش اور کاوش ہمارا کام نہیں کیونکہ یہ علوم فکریہ[1] نہیں ہیں کہ سوچنے اور غور کرنے سے سمجھ میں آجاویں گے یہ الہامی علوم ہیں خدا جس کو دے۔ اس لئے جب تک شرح صدر نہ ہو جاوے اس وقت تک کسی ایک کی تعیین نہ کرنی چاہیئے۔ دونوں احتمال ہیں۔

---

[1] عقلی علم نہیں کہ عقل سے اسکی حکمتیں اور مصلحتیں معلوم کر لی جائیں یہ تو وحی الٰہی کے حکم ہیں اور حکم پر گردن جھکا دینا ہے سمجھ میں آئے یا نہ آئے مگر حکمتیں اور مصلحتیں حکمت والے رب کے حکم میں ضرور یہ یقینی ہے اب الہام والوں پر مصلحتوں کو ظاہر کیا جاتا ہے جیسے اپنے خاص خاص پر اسرار ظاہر کئے جاتے ہیں ہر ایک پر نہیں کئے جاتے

اعتکاف کے دو درجہ ہیں اور اس کا بیان کہ معتکف کو ہر وقت نماز کا ثواب ملتا رہتا ہے

اور اس اعتکاف میں دو درجہ ہیں ایک درجہ کمال کا ہے وہ تو یہ ہے کہ ۲۰ تاریخ کو قبل از مغرب اعتکاف میں بیٹھے اور عید کا چاند دیکھ کر باہر نکلے اور دوسرا درجہ اس سے کم ہے اور وہ یہ ہے کہ دس دن سے کم ہو لیکن یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ اگر درجہ کمال حاصل نہ ہو تو ناقص درجہ کے حاصل کرنے سے فضیلت حاصل نہیں ہوتی۔ اگر اس قدر نہ ہوگی تو کچھ تو ضرور ہو جاوے گی۔ صاحبو اگر دس دن ممکن نہ ہو سکے ۹ دن سہی اس قدر بھی نہ ہو سکے سات دن سہی۔ غرض جس قدر بھی ہو سکے اور جتنے دن بھی ہو سکے چھوڑنا نہ چاہئے۔ اور ایک بہت بڑی فضیلت اعتکاف کی یہ ہے کہ معتکف کو ایام اعتکاف میں ہر وقت وہی ثواب ملتا ہے جو کہ نمازی کو نماز میں ملتا ہے۔ دلیل اس کی یہ حدیث ہے لَا یَزَالُ اَحَدُکُمْ فِی الصَّلٰوۃِ مَا انْتَظَرَ الصَّلٰوۃَ جس کا ماحصل یہ ہے کہ اگر مسجد میں بیٹھ کر نماز کا انتظار کیا جاوے تو وقت انتظار میں بھی وہی ثواب ہوتا ہے۔ جو کہ وقت اداء الصلوٰۃ میں ہوتا ہے اور ظاہر ہے کہ معتکف جب ہر وقت مسجد میں رہے گا تو اس کو صلوٰۃ کا انتظار ضرور رہے گا اگر یہ

سو وے گا بھی تو اس نیت سے کہ اُٹھ کر فلاں نماز پڑھنی ہے
کوئی کام بھی کرے گا تو اس نیت کے ساتھ کہ فلاں نماز تک یہ
کام ہے غرض اس کا سونا جاگنا اُٹھنا بیٹھنا ہر ہر حرکت صلوٰۃ کے
حکم میں لکھی جائے گی۔ صاحبو اس سے زیادہ اور کیا فضیلت ہوگی؟

رجوع بجانب مسرخی (عشرہ اخیرہ کے فضائل الخ)

یہ تقریر تو اس پر مبنی تھی کہ عشرہ اخیرہ میں ایک فضیلت
اعتکاف سے ہوئی اور یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ اعتکاف میں جو
فضیلت آئی ہے وہ عشرہ اخیرہ کی وجہ سے ہے کہ زمانہ افضل
میں عبادت کی زیادہ فضیلت ہوتی ہے لیکن یہ ہم کو کچھ مضر نہیں کیونکہ
کبھی زمانہ میں بالذات ہی فضیلت ہوتی ہے جیسا کبھی بالغیر بوجہ
اس کے مظروف کے ہوتی ہے پس غرض خواہ اعتکاف میں عشرہ کی
وجہ سے فضیلت ہو یا عشرہ میں اعتکاف کی وجہ سے دونوں صورتوں
میں اعتکاف کی فضیلت ثابت ہے ہم کو اس کا حاصل کرنا ضروری
ہے اس کے بعد کی ضرورت نہیں کسی نے خوب کہا ہے ؎

بخت اگر مدد کند دامنش آورم بکف
گر بکشد زہے طرب ور بکشم زہے شرف

لہ کبھی تو فضیلت زمانہ میں خود ہوتی ہے پھر اس کی فضیلت سے کام میں فضیلت آجاتی ہے اور
کبھی زمانہ میں تو فضیلت نہیں ہوتی۔ اس میں فضیلت والا کام ہونے اور اس کے لیے اس کا
زمانہ ہونے سے اس میں فضیلت آجاتی ہے ۲ اگر قسمت موافقت و مدد کرلے تو اسکے
دامن کو ہاتھ میں لیلوں پھر اگر وہ کھینچے تو عین مسرت ہے اور میں کھینچ لوں تو کیا ہی عزت ہے

صاحبو چار دواؤں کا مرکب آپ کے مرض کو مفید ہے آپ کو اسے استعمال کرنا چاہیئے۔ اس تفتیش کی ضرورت نہیں کہ اس دوا سے اُس میں قوت بڑھی یا اس سے اُس میں یہ تفتیش دوسرے کا کام ہے جو اس فن کو من حیث الفن حاصل کرے۔ مریض کا کام صرف استعمال ہے۔

کار کن کار بگذر از گفتار[۱] | کاندریں راہ کار باید کار
قدم باید اندر طریقت نہ دم | کہ اصلے ندارد دم بے قدم

والدین کی خدمت کی فضیلت اور اسکے ترک پر ملامت خاصکر جبکہ بوڑھے ہوں اور اسکی شکایت کہ آدمی اکثر ان کی تنگ مزاجی سے تنگ ہوتے ہیں اور اس کی وجہ

حدیث میں آیا ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے

---

[۱] کام کرو کام باتیں بنانے سے گذر جاؤ کیونکہ اس راستہ میں تو کام چاہیئے کام ہے طریقت میں تو قدم رکھنا ضروری ہے نہ کہ دم بھرنا کیونکہ دم بھرنا بغیر قدم رکھنے کے کوئی اصلیت نہیں رکھتا

ایک مرتبہ صحابہ کے مجمع میں فرمایا رَغِمَ اَنفُہٗ رَغِمَ اَنفُہٗ رَغِمَ اَنفُہٗ ؎ صحابہ یہ الفاظ سُنکر گھبرا گئے اور عرض کیا یا رسول اللہ کون شخص آپ نے فرمایا کہ ایک تو وہ شخص کہ اپنی زندگی میں بوڑھے ماں باپ کو پا دے اور ان کی خدمت کر کے جنت حاصل نہ کرے۔ حضور نے بوڑھے کی قید اس لئے بڑھادی کہ اگر ماں باپ خود جوان ہیں تر ادل تو وہ اس کے محتاج نہیں ہونگے جیسے اس کے ہاتھ پیر چلتے ہیں ان کے ہاتھ پیر بھی چلتے ہیں۔ دوسرے ان کی خدمت سے دل بھی نہیں گھبراتا۔ اس لئے اگر ان کی کچھ خدمت بھی کردی تو کچھ بڑی بات نہیں بخلاف بوڑھے ماں باپ کے کہ وہ اس کے محتاج ہوتے ہیں اور چونکہ اکثر قوٰی بالکل کمزور ہو جاتے ہیں خود کچھ بھی نہیں کر سکتے اور اکثر کام مرضی موافق نہیں ہوتے۔ تو تنگ مزاج بہت ہو جاتے ہیں اس لئے ایسے ماں باپ کی خدمت کرنا بوجہ ان کی معذوری کے ضروری اور ان کی تنگ مزاجی سے تنگ ہو جانا اور نافرمانی کرنا گناہ کبیرہ ہے مگر اکثر آدمی تنگ ہونے لگتا ہے۔ جس کی بڑی وجہ یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنے زمانہ طفولیت و عالم احتیاج کو بھول جاتا ہے کہ اس وقت والدین نے کیسے کیسے ناز

؎ مٹی میں مل جاوے اسکی ناک (عزت) تین بار فرمایا +

اٹھائے ہیں اگر وہ یاد رہیں تو بڑا نفع ہو۔

حکایت: ایک بنئے کی حکایت مشہور ہے اس نے اپنے بڑھاپے میں ایک مرتبہ اپنے ایک لڑکے سے دریافت کیا کہ بھائی یہ دیوار پر کیا چیز بیٹھی ہے۔ صاحبزادہ اول تو اس پر دل میں بہت خفا ہوئے کہ اس لغو سوال کی آپ کو ضرورت ہی کیا تھی مگر تہذیب سے کام لے کر بتلا دیا کہ ابا جان کوا ہے بنئے نے پھر پوچھا کہ بھائی یہ دیوار پر کیا چیز بیٹھی ہے۔ صاحبزادہ نے کہا ابھی تو بتلا دیا تھا کہ کوا ہے تیسری بار اس نے پھر پوچھا تو صاحبزادہ نے بگڑ کر جواب دیا کہ تمہارا تو دماغ چل گیا ہے چپکے پڑے رہو۔ اس پر بنئے نے اپنا بہی کھاتہ منگایا اور کھول کر دکھلایا کہ صاحبزادہ دیکھو تم نے ایک سو بار مجھ سے اپنے بچپن میں یہی سوال کیا تھا اور میں نے ہر مرتبہ محبت سے جواب دیا تھا۔ تم دو ہی بار میں گھبرا گئے۔

بوڑھے ماں باپ کی تُنک مزاجی سے تنگ ہونے کو جو منع کیا جاتا ہے۔ اُس پر شبہ اور اسکا جواب اور قرآن کے کلام الٰہی ہونے کی ایک لطیف دلیل

لیکن شاید کوئی شخص یہ کہے کہ صاحب بوڑھوں کی تُنک مزاجی سے ناگواری تو امر طبعی ہے اگر اس پہ بھی باز پُرس ہے تو سخت مشکل کی بات ہوگی تو اس کا جواب یہ ہے کہ امور طبعیہ پر خداتعالےٰ نے کہیں باز پُرس نہیں فرمائی۔ باز پُرس امور اختیاریہ میں ہے۔ کلام مجید اس شبہ کا خود ازالہ فرما رہا ہے۔ پارہ سُبْحَانَ الَّذِی میں حقوق والدین کا ذکر فرماتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے۔ رَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِمَا فِيْ نُفُوْسِكُمْ اِنْ تَكُوْنُوْا صَالِحِيْنَ فَاِنَّهٗ كَانَ لِلْاَوَّابِيْنَ غَفُوْرًا[۱] جس کا خلاصہ یہ ہے کہ والدین کی ہر وقت کی تنک مزاجی سے جو گھبراہٹ تمہارے دلوں میں پیدا ہوگئی ہے۔ یہ تو امر طبعی ہے۔ اگر کوئی خشک کلمہ منہ سے

---

[۱] تمہارا رب خوب جانتا ہے ان چیزوں کو جو تمہارے دلوں میں ہیں اگر تم واقعی نیک ہو گے تو وہ خدا کی طرف رجوع کرنے والوں کے لئے بہت بخشنے والے ہیں۔

نکل جاوے اس میں معذور ہو لیکن خدا تعالیٰ دل کی نیت کو جانتا ہے اگر دل میں ان کی اطاعت ہے اور غالب تم میں صلاحیت ہے تو ایسی بے اعتنائی سے معذرت کرنے کو بخش دیتا ہے صاحبو بظاہر نظر میں اس جگہ پر یہ آیت بالکل بے جوڑ معلوم ہوتی ہے لیکن تقریر بالا سے سمجھ میں آ گیا ہوگا کہ مضمون بالا سے کس قدر چسپاں ہے اگر غور کیا جاوے تو معلوم ہوگا کہ قرآن کے کلام اللہ ہونے کی یہ بھی ایک بہت بڑی دلیل ہے کہ اس میں ہر ہر بات کے وہ وہ مخفی پہلو لئے گئے ہیں کہ دوسرے کے کلام میں اس قدر رعایت ممکن نہیں اسی طرح کلام مجید کی تمام آیتیں ایک دوسرے سے مربوط ہیں مگر افسوس ہے لوگ کلام اللہ کو رسمی طور پر پڑھتے ہیں اور دیکھتے ہیں۔ اس کے سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نام سُن کر درود نہ پڑھنے پر ملامت

ایک شخص تو رغم انفہٗ کا محل یہ ہُوا دوسرا وہ جس کے سامنے میرا نام آوے اور وہ درود نہ پڑھے۔

ٹ مٹی میں مل جاوے اسکی ناک یعنی عزت

رمضان میں توبہ اور اعمال صالحہ کرنا موجب مغفرت ہیں اور ان کے ترک پر ملامت اور اسکا بیان کہ مغفرت کا حاصل کرنا ہر شخص کے اختیار میں ہے

تنبیہ رے وہ شخص کہ رمضان تشریف آئے بھی اور گذر بھی گئے اور اس نے اپنی مغفرت نہ کرائی یعنی ایسے عمل اور توبہ نہ کرلی جس سے گناہ معاف ہوجاتے ایک دوسری حدیث میں بھی مغفرت سے رمضان کے تعلق کی نسبت ارشاد ہوتا ہے[1] ھُوَ شَھْرٌ اَوَّلُہٗ رَحْمَۃٌ وَّ اَوْسَطُہٗ مَغْفِرَۃٌ وَّ اٰخِرُہٗ عِتْقٌ مِّنَ النِّیْرَانِ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ رمضان کا مہینہ سراپا رحمت و مغفرت ہے پس اس میں انسان اپنی مغفرت کا سامان کرے اور مغفرت حاصل کرنے کا طریقہ یہی ہے کہ نیک عمل کرلے اور اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ مغفرت کی تحصیل امر اختیاری ہے چنانچہ خدا تعالےٰ ارشاد فرماتے ہیں وَسَارِعُوْٓا اِلٰی مَغْفِرَۃٍ مِّنْ رَّبِّکُمْ وَجَنَّۃٍ عَرْضُھَا السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ

لہ رغم انفہ کا محل ہے ۱۲   [1] وہ ایسا مہینہ ہے کہ اس کا شروع رحمت درمیان بخشش اور آخر دوزخ سے آزادی ہے۔

اُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِيْنَ اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ الخ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ خدا کی مغفرت اور اس کی جنت کی طرف دوڑو جس کو متقی لوگوں کے واسطے تیار کیا گیا ہے تو جو شخص اس رستہ چلے اور اس مقرر شدہ قانون پر عمل کرے گا وہ مغفرت کو حاصل کرے گا جو شخص ایسا نہ کرے گا محروم رہے گا۔ پس معلوم ہوا کہ مغفرت کا حاصل کرنا خود ہمارے اختیار میں ہے اگر ہم چاہیں اس کو خود حاصل کر سکتے ہیں کہ متقی بن جاویں۔

بے علم واعظوں کی غلطی اور اس کا بیان کہ خدا تعالیٰ کے یہاں ہر کام کا ایک قانون مقرر ہے

اس موقعہ پر بے علم واعظوں کی ایک غلطی کا بیان کرنا بہت ضروری ہے کہ واعظوں میں کہا کرتے ہیں کہ خدا تعالےٰ کی ذات بالکل بے پرواہ ذات ہے وہ چاہے تو ایک نکتہ میں بخشدے اور چاہے تو ایک نکتہ میں جہنم بھیجدے اور یہ بات ایسے طور سے کہتے ہیں جس سے لوگ یوں سمجھتے ہیں کہ نعوذ باللہ خدا تعالےٰ کے ہاں کوئی مقرر شدہ قانون نہیں بلکہ یوں ہی اناپ شناپ بے ٹھکے طور پر جو چاہتے ہیں کر دیتے ہیں اس قسم کے مضامین سننے سے اکثر لوگ بالکل مایوس ہو جاتے ہیں۔ اور عبادت ریاضت سب چھوڑ بیٹھتے ہیں۔ اس لیے کہ وہ ڈرتے ہیں کہ خدا جانے کس نکتہ پر اچانک پکڑے ہو جاویں

اور ساری محنت برباد ہی جاوے اسی طرح اکثر لوگ خوب جی بھر کر معاصی کا ارتکاب کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ جب خدا تعالیٰ کے ہاں کوئی مقرر شدہ قانون ہی نہیں ایک نکتہ ہی پر عذاب ثواب کا مدار ہے تو اپنی خواہشات کو کیوں ترک کریں اور خواہ مخواہ کی مصیبت کیوں اختیار کریں۔ ممکن ہے اسی میں سے کوئی نکتہ پسند آجائے کہ اس پر نوازش ہو جاوے گویا کارخانہ خداوندی اندھیر نگر کی سلطنت ہے کہ جہاں ہمارے کام بے ڈھنگے ہی ہوتے ہیں۔

حکایت: مشہور ہے کہ چیلہ گرو سفر کرتے ہوئے ایک شہر پہنچے نام پوچھا تو اندھیر نگر معلوم ہوا جس کے معنی ہیں بے انصافی کا شہر اشیاء کا نرخ دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ اناج سے لے کر گھی دودھ تک ہر ہر چیز سولہ سیر کی ملتی ہے یہ سنکر چیلہ تو بہت خوش ہوا کہ خوب گھی دودھ کھا کر فربہ ہوں گے مگر گرو نے کہا کہ بھائی اس جگہ قیام کرنا مناسب نہیں یہ شہر تو بہت ہی بے تکا معلوم ہوتا ہے کہ چھوٹے بڑے میں کچھ امتیاز ہی نہیں مگر چیلہ نے اصرار کیا آخر رہ پڑے۔ چند روز میں سیر کرتے کرتے عدالت کی طرف پہنچے۔ دیکھا کہ ایک مقدمہ راجہ صاحب کے اجلاس میں درپیش ہے اور لوگوں کا ہجوم ہے پوچھنے سے معلوم ہوا کہ کوئی چور مدعی ہے نہاتن

ہندو جوگی گرو اس کا شاگرد چیلہ ہے۔

مدعا علیہ ہے۔ دعوےٰ یہ ہے کہ ہم دونوں چوری کرنے اس کے گھر گئے نقب لگایا میرا رفیق اندر جانے لگا تو دیوار اوپر سے آپڑی مر گیا قصاص چاہتا ہوں۔ مدعا علیہ سے باز پرس ہوئی کہ وہ دیوار ایسی کیوں بنائی تھی اس نے کہا معمار سے پوچھئے بنانے والا وہ ہے وہ بلایا گیا اس نے کہا گارہ دینے والے سے پوچھا جاوے اس کو بلایا گیا اُس نے کہا کہ گارہ بنانے والے سے پوچھئے اس کو بلایا اس نے کہا سقہ نے پانی ڈال دیا جس سے گارہ پتلا ہو گیا اس کو بلایا اس نے کہا سرکاری ہاتھی جھنجھناتا ہوا آتا تھا۔ خوف سے پانی زیادہ نکل پڑا فیلبان کو بُلایا۔ اس نے کہا ایک عورت پازیب پہنے آتی تھی اس کی جھنکار سے ہاتھی دوڑ پڑا۔ عورت کو بُلایا۔ اس نے کہا۔ سنار نے ایسا ہی باجا ڈال دیا تھا اُس کو بلایا وہ جواب نہ دے سکا حکم ہوا کہ سنار کو پھانسی دے دی جائے۔ پھانسی کے لئے لے چلے اس کو پھانسی پر چڑھایا گیا تو پھانسی کا حلقہ اس کے گلے سے بڑا نکلا لوگوں نے آکر راجہ صاحب سے عرض کیا کہ حلقہ اس کے گلے سے بڑا ہے راجہ صاحب نے فرمایا کہ اچھا تو کسی موٹے آدمی کو پھانسی دے دو۔ غرض موٹے آدمی کی تلاش شروع ہوئی۔ اتفاق سے مجمع بھر میں اس چیلے سے زیادہ موٹا کوئی نہ نکلا۔ آخر اسی کو تجویز کیا گیا۔ اب تو چیلہ صاحب بہت گھبرائے اور گرو سے کہا خدا کے لئے بچاؤ۔ اس نے جواب دیا میں

نہ کہتا تھا یہاں رہنا اچھا نہیں۔ آخر نتیجہ دیکھا آخر گروؤ نے یہ تدبیر نکالی کہ پھانسی کے وقت خود بڑھ کر کہا کہ صاحبو اس کو پھانسی نہ دو مجھ کو دے دو۔ لوگوں نے وجہ پوچھی تو اس نے کہا اس وقت میں نے جوتش میں جو دیکھا تو معلوم ہوا کہ اس وقت جو شخص پھانسی دیا جائے گا وہ سیدھا بیکنٹھ[۱] میں جا وے گا۔ راجہ صاحب نے جو یہ سنا تو بڑھ کر فرمایا کہ اچھا جب ایسی بات ہے تو ہم کو پھانسی دے دو۔ تاکہ جنت ہمیں حاصل کرلیں۔ چنانچہ راجہ صاحب کو پھانسی دے دی گئی[۲] خس کم جہاں پاک صادق ہوا۔ تو ان نیم واعظوں کے ایسے بیانوں سے یوں سمجھا جاتا ہے کہ گویا نعوذ باللہ کارخانہ خداوندی بھی دوسرا اندھیر نگر ہے۔ صاحبو یاد رکھو کہ خدا تعالیٰ کے ہاں ہر کام کا ایک قانون مقرر ہے۔ ثواب کا بھی ایک قانون ہے۔ عذاب کا بھی ایک قانون مقرر ہے۔

مغفرت کا حاصل کرنا امر اختیاری ہے اور اسکا طریقہ

ثواب کا قانون تو یہی ہے جو اس آیت میں ارشاد ہوتا ہے۔ وَسَارِعُوا[۳] الخ یعنی تقوے حاصل کرلو اور مغفرت و جنت لے لو معلوم ہوا کہ مغفرت و رحمت کا لینا بالکل ہمارے اختیار میں ہے ورنہ اگر

---

۱ جنت ۲ کم ظلم الخ جہاں صاف ہوگیا ۳ جنت و مغفرت کی طرف دوڑ پڑو۔

اس کو اختیار میں نہ مانا جاوے تو سَارِعُوا کے کوئی معنی نہیں ہوں گے کیونکہ تکلیف[2] مالا یطاق محال ہے اور خلاف نص ہے اور یہاں امر ہوا مسارعۃ الی المغفرۃ[3] کا تو ضرور وہ تحت الاختیار ہے پس جب رحمۃ اور مغفرۃ کا حاصل کرنا ہمارے اختیار میں ہے تو اس کی تحصیل کی کوشش کرو۔

توبہ میں تاخیر نہ کرنا چاہئیے اگرچہ آیندہ ٹوٹ جانے کا اندیشہ ہو کیونکہ توبہ کرنا اس حالت میں بھی مفید ہے اور اس کا ترک مضر ہے

اگر یہ خوف ہو کہ توبہ ٹوٹ جاوے گی اور گناہوں سے باز نہ رہ سکیں گے تو بھی ہمت نہ ہارو کیونکہ پھر توبہ کر لینا۔ دیکھو[4] اگر ایک کپڑا پھٹ جاتا ہے تو اس کو بالکل پھٹا ہوا نہیں چھوڑتے کہ سینے کے بعد پھر پھٹ جاوے گا بلکہ سی کر پھر کام میں لاتے ہیں

---

[1] دوڑ پڑو [2] طاقت سے باہر کام کا ذمہ دار بنانا۔ [3] بخشش کی طرف دوڑ پڑنے کا [4] یا یوں کہئے کہ میلا ہو جاتا ہے تو دھوتے یا دھلواتے ہیں حالانکہ جانتے ہیں کہ پھر میلا ہو جائے گا۔

بس یہی حالت توبہ کی ہے کہ محض اس کے ٹوٹنے کے احتمال سے اس کو ترک کرنا نہ چاہیئے بلکہ اس وقت پھر توبہ کر لینا چاہیئے باب توبہ بند نہیں ہوا بلکہ اگر دن میں سو دفعہ بھی توبہ ٹوٹ جاوے تو پھر توبہ کر لو۔ مایوس نہ ہو جاؤ خوب کہا ہے ؎

بازآ بازآ ہر آنچہ ہستی بازآ ۔ گر کافر و گبر و بت پرستی بازآ[1]

ایں درگہ ما درگہ نومیدی نیست ۔ صد بار اگر توبہ شکستی بازآ[2]

بلکہ اسی ترک توبہ ہی کی وجہ سے ہم کو معاصی پر زیادہ جرأت ہو گئی ہے کیونکہ جو شخص توبہ کرتا رہے گا اس کے دل میں عظمت خداوندی کسی نہ کسی درجہ میں ضرور باقی رہے گی۔ یہ بڑا سبب ہے۔ معاصی سے رُک جانے کا برخلاف اس شخص کے جو کبھی توبہ نہ کرے گا۔ وہ خدا کو بالکل بھول جاوے گا اور جب اس کی عظمت پیش نظر نہ ہو گی تو جو کچھ بھی اس سے ہو جاوے بعید نہیں۔

---

[1] بازآ جاؤ بازآ جاؤ جیسے کچھ بھی تم ہو اس سے بازآ جاؤ توبہ کر لو۔ اگر تم کافر ہو آگ پوجنے والے ہو بت پرست ہو تو بھی باز آ جاؤ۔

[2] یہ ہماری بارگاہ ناامیدی کی بارگاہ نہیں ہے۔ سو بار بھی توبہ توڑ چکے ہو تو بھی بازآ جاؤ توبہ کر لو۔

عشرہ اخیرہ میں جو منکرات کئے جاتے ہیں ان کی اصلاح

اس عشرہ اخیرہ میں اکثر مساجد میں قرآن شریف ختم ہوتا ہے اول اس میں اکثر لوگ پڑھنے والوں کو کچھ دیا کرتے ہیں سو یہ لینا چھوڑ دو۔ دوسرے اکثر مساجد میں ختم کے دن شیرینی تقسیم ہوتی ہے۔ اس میں جو گڑبڑ ہوتی ہے سبھی جانتے ہیں اور ان گڑبڑوں کی وجہ سے جو شرعی قباحتیں اس میں پیدا ہوجاتی ہیں ان کو بھی متعدد مرتبہ بیان کیا گیا ہے[2] اس وقت صرف اتنا کہا جاتا ہے کہ اس کے مفاسد پر نظر کرکے اس کو بھی چھوڑ دو دیکھو اسکی بدولت بیچارے بعض غرباء پر سخت بار ہوجاتا ہے اس انتظام کے متعلق بعض غریب جولاہوں نے شکریہ میں یہ کہا کہ ہم بہت ممنون ہیں کیونکہ ہم کو چندہ دینے کی مصیبت سے بچا لیا۔ معلوم ہؤا کہ لوگوں پر چندہ لینے سے بار ہوجاتا ہے بتلائیے یہ کیونکر جائز ہوگا بعض رئیسوں نے مجھ سے کہا کہ آپ غریبوں کو منع کیجئے لیکن امیروں کو

---

[1] قرآن بیچنا اور یہ لینا دینا دونوں بڑا گناہ ہیں [2] حضرت کی کتاب اصلاح الرسوم میں سب کی تفصیل ہے۔

منع کرنے کی ضرورت نہیں۔ حالانکہ یہ خیال بالکل لغو ہے اس لئے کہ اگر امیروں نے نہ چھوڑا تو شرم وحجاب کی وجہ سے غرباء سے چھٹنا بہت مشکل ہے اور اگر امیروں نے چھوڑ دیا تو غریبوں کو چھوڑنا کچھ مشکل نہیں۔ بعض مساجد ایسی بھی ہیں کہ ان میں چندہ سے شیرینی تقسیم نہیں ہوتی لیکن وہاں دوسری خرابیاں ہوتی ہیں مثلاً ریا و نمود کے لئے تقسیم کرنا۔ عوام الناس اور بچوں کے ہجوم سے مسجد کی بے حرمتی ہونا لڑکوں کا حصہ مانگنے میں بلا وجہ ٹپنا۔ غرض اس قسم کی بہت سی خرابیاں ہیں کہ زیرک آدمی انکو خود سمجھ سکتا ہے۔ ایک مرتبہ بریلی میں قرآن سنانے کا اتفاق ہوا۔ ختم کے روز میرے بھائی نے تقسیم شیرینی کے لئے کہا۔ میں نے منع کیا لیکن انہوں نے کہا کیا مضائقہ ہے۔ ان کا اصرار دیکھ کر میں نے سوچا کہ بہتر یہ ہے کہ ان کو خود ان خرابیوں کا مشاہدہ ہو جائے چنانچہ میں خاموش ہو رہا۔ شب کو شیرینی تقسیم کی گئی اور انہوں نے اپنے اہتمام سے خود تقسیم کی۔ لوگوں کے بے ڈھنگے پن کو دیکھ کر وہ اس قدر پریشان ہوئے کہ بعد تقسیم خود کہا کہ آپ کی رائے بہت صائب تھی۔ واقعی یہ خرافات کبھی نہ کرنی چاہئے اور اس کا احسان ان کی دانشمندی کی دلیل ہے لیکن افسوس یہ ہے کہ بعض لوگ باوجود خرابیاں سمجھ جانے کے بھی اپنے خیال سے باز نہیں آتے اور اس کو نہیں چھوڑتے۔

آخری جمعہ کو خطبہ الوداع کا پڑھنا بدعت ہے، اور گو اس کے اندر مصلحتیں ہوں لیکن جبکہ اس کے اندر مفاسد بھی ہیں اور خود امر ضروری بھی نہیں ہے، اس لئے اس کا ترک لازم ہے

قَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ شَہْرُ رَمَضَانَ . ھُوَ شَہْرٌ اَوَّلُہٗ رَحْمَۃٌ وَّ اَوْسَطُہٗ مَغْفِرَۃٌ وَّ آخِرُہٗ عِتْقٌ مِّنَ النِّیْرَانِ ۔

یہ حدیث شریف ایک بڑی حدیث کا جزو ہے جس کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے شعبان المعظم کے آخری جمعہ کے دن خطبہ میں پڑھا تھا اور اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے شعبان کے آخری جمعہ میں ایک خاص خطبہ پڑھا جو کہ اور جمعوں میں نہ پڑھتے تھے مسلمانوں سے تعجب ہے کہ انہوں نے اس منصوص خطبہ پر تو توجہ نہ کی اور شعبان کے آخری جمعہ کے لئے کوئی خاص خطبہ تجویز نہ کیا جس سے

لہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا رمضان کا مہینہ یہ ایسا مہینہ ہے کہ اس کا شروع رحمت اور درمیان مغفرت اور اخیر دوزخ سے آزادی ہے ۔

وہ عامل بالسنت ہونے اس کے بجائے رمضان کے آخری جمعہ کے لیئے ایک خاص خطبہ الوداع اختراع کیا۔ جس کا کہیں حدیث میں پتہ نہیں اور پھر اس کے ساتھ ایسا شغف ہؤا کہ بغیر اس خاص خطبہ کے پڑھے یہ سمجھا جاتا ہے کہ گویا جمعہ ہی نہیں ہؤا۔ اگرچہ بحمد اللہ اس وقت لوگوں کو اس کے نہ پڑھنے سے وہ وحشت جو کہ اس کے قبل ہوتی تھی نہیں ہوتی لیکن تاہم اب بھی ایسے بہت سے لوگ ہیں جو کہ اس خاص الوداعی خطبہ کو آخری جمعہ رمضان کا لازمی عمل سمجھتے ہیں اور بڑا تعجب تو یہ ہے کہ بعض اہل علم کو بھی دھوکا ہو گیا اور وہ سخت غلطی میں مبتلا ہو گئے کہتے ہیں کہ اگرچہ آخری جمعہ کے لیئے کوئی خاص خطبہ تجویز کرنا بدعت ہے لیکن چونکہ اس کی وجہ سے لوگ اکثر جمع ہو جاتے ہیں۔ اس لیئے اس اجتماع کے لیئے معین اور ادائے صلوٰۃ کا ذریعہ ہونے کی وجہ سے باقی رکھنا چاہیئے حالانکہ یہ سخت غلطی اور من وجہ خدا اور رسول پر اعتراض کرنا ہے۔ غلطی تو اس لیئے کہ شریعت کا مشہور حکم ہے کہ اگر کسی کام کے کرنے میں کچھ مصلحتیں بھی ہوں اور

ف ایجاد جو حضور صحابہ تابعین سے بے اصل ہے ک عشق ک مددگار مگر اسکی وجہ سے بہت لوگ آ نیں گے اور اسکو بدعت حسنہ کہتے ہیں مگر یہ غلط ہے یہ شرعی بدعت ہے اور شرعی بدعت کوئی حسنہ نہیں ہوتی سب گمراہی اور شدید گناہ ہیں۔ عربی میں لغوی بدعت ہر نئی چیز کو کہتے ہیں انمیں جسکی اصل ہو وہ لغوی بدعت حسنہ ہے کہ ایک طرح کہ ان کو خود اس کا یہ درجہ مقرر کرنا تھا۔

کچھ مفاسد بھی ہوں اور وہ کام بالذات یا بالغیر[1] مطلوب شرعی نہ ہو تو ان مفاسد پر نظر کر کے اس کام کو ترک کر دیں گے اور مفاسد سے بچیں گے۔ مصالح کا اعتبار نہ کریں گے اور یہ ایک کلیہ قاعدہ ہے جس کو اہل علم بخوبی سمجھ گئے ہوں گے لیکن عوام کے سمجھانے کے لئے میں اس کی ایک مثال بیان کرتا ہوں۔ مثلاً ایک شخص مجلس رقص[2] منعقد کرے اور کہے کہ اگرچہ رقص فی نفسہ ممنوع اور حرام ہے لیکن میری غرض اس مجلس سے لوگوں کو جمع کرنا ہے تاکہ جمع ہو جانے کے بعد میں اپنی وجاہت سے کام لے کر ان کو نماز پڑھنے پر مجبور کر دوں اور اسی طرح ان کو نماز پڑھنے کی عادت ہو جاوے۔ تو دیکھئے بظاہر اس مجلس کی غایت کس قدر خوبصورت ہے کہ اس کے ذریعہ سے لوگوں کو نماز پڑھنے کی عادت ڈالی جاتی ہے لیکن چونکہ اس مجلس میں ایک مصلحت کے ساتھ بہت سے مفاسد بھی ہمدوش ہیں اور مجلس رقص بالذات یا بالغیر مطلوب نہیں جیسا کہ ظاہر ہے اس لئے شریعت اس مصلحت مذکورہ کی وجہ سے اس کی اجازت نہ دے گی بلکہ اس کے مفاسد پر نظر کر کے اس مجلس کے انعقاد سے باز رکھے گی۔

---

[1] خود یا کسی نیک کام کا ذریعہ بننے کی وجہ سے مطلوب نہ ہو۔ [2] جیسے کہ آجکل بعض لوگ سینما وغیرہ کو اخلاقی تہذیبی یا تبلیغی غرض سے جائز بنانا چاہتے ہیں حالانکہ اس کی بدعملی اور بدعقیدگی اور بہت سے گناہوں کا مجموعہ ہونا ہر شخص دیکھ رہا ہے اور اسکے نتیجے آوارگی بدمعاشی چوری جعلسازی اور قتل وغارت تک سب کے سامنے ہیں۔

جو امر کہ خود ضروری ہو لیکن اس کے اندر مفاسد بھی شامل ہو گئے ہوں تو اس سے منع نہ کیا جاویگا بلکہ خود ان مفاسد کا انتظام کیا جاویگا جیسے نماز عید کیلئے عیدگاہ میں جمع ہونے میں اگر مفاسد پیدا ہو جاویں

ہاں اگر کوئی کام بالذات یا بالغیر[1] مطلوب ہو اور اس میں مصالح کے ساتھ مفاسد بھی ہوں تو اس کام کو ان مفاسد کی وجہ سے ترک نہ کیا جاوے گا بلکہ اس کو باقی رکھ کر مفاسد کی اصلاح کرنے کی کوشش کی جاوے گی مثلاً عیدگاہ کا اجتماع ادائے صلوٰۃ کے لئے شرعاً مطلوب ہے پھر اگر لوگ اپنی بدتمیزی کی وجہ سے اس میں کچھ خرابیاں آمیز کر لیں جیسا کہ مثلاً آج کل عام طور سے بچوں کو عیدگاہ میں لے جانے کا رواج ہو گیا ہے جس کو دیکھو وہ اپنے ساتھ ایک دُم چھلّا ضرور لئے ہے۔ اور حیرت تو یہ ہے کہ باوجود ہر سال تکلیف اٹھانے کے پھر بھی لوگوں کو اسکی ذرا حس اور تمیز نہیں ہوتی۔

---

[1] خود مطلوب ہو یا کسی مطلوب عمل کا ذریعہ ہو۔

شاید کوئی سال ایسا ہوتا ہو کہ بچے عیدگاہ میں جا کر عین نماز کے وقت رونا بسورنا نہ شروع کرتے ہوں بلکہ ایک دو تو ان میں سے ہگ موت بھی دیتا ہے۔ خود میرے سامنے کا واقعہ ہے کہ میرے ایام تعلیم میں ایک میرا عزیز کم عمر میرٹھ کی عیدگاہ میں والد صاحب کے ساتھ گیا اور اس نے نماز کے وقت قضا حاجت کی فرمائش کی۔ اس کی فرمائش سن کر سخت پریشانی ہوئی۔ اول تو عین نماز کا وقت دوسرے میرٹھ کی عیدگاہ جس میں ہزاروں آدمیوں کا مجمع کہیں قریب ایسا جنگل بھی نہیں جس میں اس کو ٹہلا دیا جاتا پھر نماز کھڑے ہونے کا وقت بالکل قریب آخر یہ تجویز ہوئی کہ ایک حلوائی کو چار آنہ دیئے گئے اس نے اپنے تخت کے نیچے ان کو ٹہلالیا۔ چاروں طرف سے کپڑا لٹکا ہوا تھا۔ اوپر رنگ برنگ کی مٹھائی اور اندر یہ تحفہ بھرا ہوا تھا۔ (جملہ معترضہ)

ہمارا ظاہر و باطن یکساں نہیں ہے

یہاں ایک عبرتناک مضمون خیال میں آیا کہ یہی حالت ہم لوگوں کی ہے کہ اس مٹھائی کی طرح ہمارا ظاہر تو نئے نئے انداز سے پُر رونق اور چکنا چپڑا رہتا ہے لیکن ہمارے باطن کی یہ حالت ہے گو در گو مرغی کا گو۔ ہوائے نفسانی سے لبریز بیہودہ خیالات سے پُر خدا سے دُور شیطان سے قریب۔ ایک محقق نے خوب فرمایا ہے ؎

از بروں چوں گورِ کافر پُر حلل[1] — واندروں قہرِ خدائے عزّ وجل
از بروں طعنہ زنی بر بایزید[2] — واز دروں ننگ میدارد یزید

صورت تو ایسی مُقطع کہ معلوم ہو کہ اگر وحی مُنقطع نہ ہو چکی ہوتی تو حضرت جبرئیل انہیں کی خدمت میں آتے اور دل کی یہ حالت کہ شیطان کے بھی شیطان جیسا حدیث میں آیا ہے اَلْسِنَتُهُمْ اَحْلٰی مِنَ السُّکَّرِ وَقُلُوْبُهُمْ اَمَرُّ مِنَ الصَّبْرِ یَلْبَسُوْنَ جُلُوْدَ الضَّاْنِ۔

رجوع بجانب شرحی (جو امر کہ خود تو ضروری ہو الخ)

غرض عید گاہ کی حاضری میں مصلحت بھی ہے اور مفسدہ بھی ہے تو اگر کوئی عاقل پہلے کلیہ کی بنا پر یہ کہے کہ ان مفاسد کی وجہ سے عید گاہ کا اجتماع بھی چھوڑ دینا چاہئے تو اس سے کہا جاوے گا کہ چونکہ عید گاہ کا اجتماع شریعت میں مطلوب ہے۔ اس لئے اس موقعہ پر وہ قاعدہ نہ برتا جاوے گا اور عید کا جانا ترک نہ کیا جاویگا بلکہ بجائے اس کے ان مفاسد کی اصلاح کی کوشش کی جاوے گی یعنی مثلاً لوگوں سے کہا جاوے گا کہ بچوں کو عید گاہ میں لے کر نہ آیا کریں۔

---

[1] کافر کی قبر کی طرح باہر سے خوش نما اور اندر خدا تعالےٰ کا قہر۔ باہر سے تو

[2] حضرت بایزید بسطامی پر طعنہ والے اور اندر سے یزید بھی شرمندہ زبانیں انکی شکر سے زیادہ میٹھی اور دل انکے بھیڑیوں سے زیادہ کڑوے جو بھیڑوں کی کھال کا پوستین پہنتے ہیں۔

نمازِ عید کے لئے عیدگاہ میں جمع ہونا شریعت کو مطلوب ہے، اور اس کا راز اور اس کا بیان کہ جماعت کے ساتھ نماز پڑھنا گو اس سے وساوس آتے ہوں تنہا نماز پڑھنے سے بہتر ہے

اور اگر کسی کو اس اجتماع کی مطلوبیت میں کلام ہو جیسا اس وقت بعض نام کے مشائخ بجائے عیدگاہ کے اپنی مساجد ہی میں بلا ضرورت صرف امتیاز کے لئے عیدین پڑھتے ہیں تو میں اس کا ثبوت حدیث سے دیتا ہوں۔ دیکھئے مسجد نبوی (علی صاحبہ الصلوٰۃ والسلام) میں نماز پڑھنے سے پچاس ہزار نمازوں کا ثواب ملتا ہے لیکن باوجود اس کثرتِ ثواب کے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہمیشہ اس موقع پر عیدگاہ میں تشریف لے گئے اور مسجدِ نبوی میں نماز نہیں پڑھی بس معلوم ہوا کہ عیدگاہ کا اجتماع ایک مہتم بالشان مطلوب ہے اور ممکن ہے کہ عیدگاہ کے ثواب میں بجائے کثرتِ کمی کے

ل تعداد کی کثرت کے بجائے کیفیت کی کثرت کی زیادتی ہو۔

کیفاً کثرت ہو جاتی ہو۔ یعنی وہ ایک ثواب ہی ان پچاس ہزار ثواب سے زیادہ ہوتا ہو اور اسی کثرت کیفی کی وجہ سے نبی کریم مسجد کو چھوڑ کر عید گاہ جاتے ہوں اس کی ایسی مثال ہے کہ ایک بچے کے سامنے ایک گنی اور دس روپے پیش کئے جاویں تو بچہ دس روپوں کو عدد میں زیادہ دیکھ کر انہیں کو اٹھا لے گا لیکن اگر کسی بڑے آدمی کے سامنے ان دونوں کو پیش کیا جاوے تو وہ روپوں کو چھوڑ دیگا اور گنی اٹھا لے گا کیونکہ گنتی میں گو ایک اور دس کا فرق ہے لیکن کیفاً وہ ایک آن دس سے زیادہ ہے پس اسی طرح ممکن ہے کہ عید گاہ کے اجتماع میں کیفاً اس قدر ثواب ہو کہ مسجد نبوی کے اجتماع میں وہ نہ ہو۔ اور ہر چند کہ یہ تضاعف[1] ثواب مسجد نبوی کا مخصوص ہے فرائض کے ساتھ اور اس وجہ سے ممکن ہے کہ کسی کو استدلال مذکور میں خدشہ ہو کہ صلوٰۃ عیدین میں یہ تضاعف مسجد نبوی میں نہ ہوگا پس استدلال تام نہیں ہو جواب یہ ہے کہ واجب بھی ملحق ہوتا ہے فرض کے ساتھ پس دونوں کا یکساں حکم ہوگا اور عید گاہ کے اجتماع میں بالخصوص یہ بھی بھید ہے کہ مسلمان مختلف اطراف سے سمٹتے ہوئے ہر ایک میدان میں جمع ہوتے ہوئے نظر آتے ہیں تو ان کا اجتماع ان کے

---

[1] بہت گونا ہونا ثواب کا۔

بدخواہوں کے قلب پر مؤثر ہوتا ہے اور اسلامی شوکت ظاہر ہوتی ہے اور یہ اعظم مقاصد ملت سے ہے اور اس خاص اجتماع میں مطلق اجتماع جو متحقق ہے وہ خود بھی اسرار مہمہ پر مشتمل ہے چنانچہ ایک ادنیٰ راز یہ ہے کہ سب کی عبادات مجتمع ہو کر جو سرکار میں پیش ہوں گی اگر بعض بھی قابل قبول ہوئیں تو اسکی برکت سے بقیہ بھی مقبول ہوں گی اور انھیں حکمتوں سے شرع میں جماعت کا بہت اہتمام ہے حتیٰ کہ جماعت کی نماز اگر وسوسوں کے ساتھ بھی ہو تب بھی تنہا نماز سے بدرجہا بڑھ کر ہے اس لئے کہ وہ شرعاً مطلوب ہے، اور قطع وساوس اس درجہ مطلوب نہیں ؎

چوں طمع خواہد زمن سلطان دیں ﴿﴾ خاک بر فرق قناعت بعد ازیں

افسوس ہے کہ بعض اکابر کو یہ دھوکا ہو گیا کہ اگر جماعت کی نماز میں وسوسے آدیں اور تنہائی میں اجتماع قلب ہو تو تنہا نماز پڑھنا بہتر ہے، جماعت کو چھوڑ دینا چاہیئے۔ حالانکہ یہ بالکل غلط ہے اور اس کو ہم اپنی رائے سے غلط نہیں کہتے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اس کی تغلیط فرمائی ہے۔ ہم ان بزرگوں پر اعتراض نہیں کرتے ہم صرف ان کی غلطی کا اظہار کرتے ہیں۔

---

[۱] اہم راز دل پر [۲] جب بادشاہِ دین ہی ہم سے لالچ کرنے کو چاہیں تو پھر اس کے بعد قناعت کے سر پر خاک ہو۔

حاصل سابق نماز عید کے لئے عیدگاہ میں اجتماع کا مطلوب ہونا اور بچوں کے وہاں لے جانے کی ممانعت

غرض چونکہ شریعت میں اجتماعی مصالح کی زیادہ رعایت ہے اور ظاہر ہے کہ جو اجتماع عیدگاہ میں ہوگا مسجد میں نہ ہوگا لہٰذا گو کمّاً[1] عیدگاہ کا ثواب زیادہ نہ ہو لیکن کیفاً زیادہ ہے اس لئے باوجود کسی مفسدہ کے اس میں جمع ہونا ترک نہ کریں گے بلکہ اس میں جو مفسدہ بچوں کے اجتماع کا ہے اس کی اصلاح کریں گے اور ہم خود کیا اصلاح کریں گے ہمارے نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم خود اس کی اصلاح فرما گئے ہیں ارشاد ہے جَنِّبُوْا مَسَاجِدَکُمْ صِبْیَانَکُمْ[2] کہ اپنی مسجدوں سے اپنے بچوں کو علیحدہ رکھو لیکن یہ ممکن ہے کہ کوئی صاحب عیدگاہ کو مسجد میں داخل نہ کریں اس لئے استدلال مذکور کو کافی نہ سمجھیں تو ہم اس کا جواب یہ دیں گے کہ مَسَاجِدَکُمْ[3] میں دو احتمال ہیں یا تو اس کو عام لیا جاوے کہ مطلق مقام صلوٰۃ مراد ہو تب تو عیدگاہ کا اس حکم میں داخل

---

[1] گو تعداد کے اعتبار سے نہ ہو کیفیت میں تو ہوگا۔ [2] اپنی مسجدوں سے [3] ہر ایک سجدہ گاہ یعنی نماز کی جگہ

ہونا ظاہر ہی ہے اور اگر اس کو عام نہ لیا جاوے تو گو ان الفاظ میں عید گاہ داخل نہ ہوگی لیکن یہ دیکھنا چاہیئے کہ آخر علت اس حکم کی کیا ہے۔ سو ظاہر ہے کہ علت اس حکم کی یہی ہے کہ چونکہ بچے پاک صاف نہیں ہوتے ان کی آمد و رفت سے ایسی جگہ کے ملوث ہونے کا اندیشہ ہے جہاں نماز ہوگی۔ اور اس سے نماز میں خلل پڑے گا اور یہ علت جیسے کہ مسجد میں پائی جاتی ہے عید گاہ میں بھی پائی جاتی ہے۔ لہذا وہاں بھی یہ حکم جاری ہوگا۔ چنانچہ خود عید گاہ کے باب میں حضور کا ارشاد ہے وَلْیَعْتَزِلْنَ الْحُیَّضُ الْمُصَلّٰی۔

رجوع بجانب سرخی (آخری جمعہ کو خطبۃ الوداع پڑھنا بدعت ہے، الخ)

پس اس مثال سے سمجھ میں آگیا ہوگا کہ وہ کلیہ اُس وقت ہے جبکہ وہ امر مطلوب نہ ہو ورنہ مفسدہ کی اصلاح کریں گے اور اس کام کو ترک نہ کریں گے۔ یہ تو دعویٰ غلطی کی دلیل میں تھا۔ رہا دوسرا دعویٰ کہ

لہ اور الگ رہیں حیض والیاں عید گاہ سے ۔ لہ جس کام میں فائدے بھی ہوں اور خرابیاں بھی تو خرابیوں کی وجہ سے اس کام کو روک دیا جائیگا یہ قاعدہ کلی تھے سات سرخی پہلے جو بتایا تھا کہ یہ سخت غلطی ہے اب یہ اس غلطی کی دلیل کا بیان تھا۔

خطبہ الوداع میں مصلحتیں بیان کرنا من وجہ خدا اور رسول پر اعتراض ہے سواس کا بیان یہ ہے کہ جب بعض بدعتیں بھی بوجہ مصالح مطلوب ہوئیں تو گویا اس شخص کے نزدیک کتاب وسنت کی تعلیم ناتمام ہوئی کہ بعض مصالح ضروریہ کی تعلیم میں فروگذاشت ہوگئی۔ کیا کوئی اس کا قایل ہو سکتا ہے اور اسی لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر بدعت کو ضلالت[1] فرمایا ہے اور بعض بدعت کے حسنہ[2] ہونے سے اگر شبہ ہو تو در حقیقت وہ بدعت ہی نہیں اور اس قسم کا احتمال خطبہ الوداع میں نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ اگر یہ معنی[3] سنت ہوتا تو سلف میں اس کی نظیر ضرور ہوتی پھر بعد عرق ریزی کے اگر کوئی دور کی نظیر نکال بھی لی جاوے تو دوسرے مانع کا کیا جواب ہوگا کہ عوام کے التزام سے بدعت ہو گیا اور بدعت بھی بدعت ضلالت جس پر حضور نار کی وعید فرما رہے ہیں اور حضور کا ارشاد عین ارشاد حق ہے تو ایسے امر کا التزام اور اس میں مصلحتیں نکالنا خدا اور رسول پر اعتراض بھی ہے اور خدا ورسول سے مزاح بھی ہے۔

---

[1] گمراہی اور ہر گمراہی کو دوزخ میں فرمایا [2] بدعت حسنہ تو وہ ہے جو لغت کے اعتبار سے نئی ہونے کی وجہ سے عربی زبان میں بدعت (نئی بات) کہلائے مگر اسلاف میں وہ یا اسکی نظیر ملتی ہو جو ایسی نہ ہو وہ غیر دین کو دین یا مباح ومستحب کو فرض واجب [3] قرائنے سے بدعت ضلالت ہی ہے جس کا انجام دوزخ ہے اور خدا ورسول کی گستاخی ہے۔

تربیت اور ارشاد ہر شخص کا کام نہیں ہے اور جو لوگ اس کے اہل ہیں، ان کی پہچان

اہل علم کو ایسی ہی لغزشوں کی وجہ سے جیسا کہ اوپر مذکور ہوا کہ بعضے لوگ بدعات میں مصالح بیان کرتے ہیں اور اس کی حقیقت کو نہیں سمجھتے یہ کہا جاتا ہے کہ تربیت اور ارشاد خصوص حکمت فہمی اور اجتہاد ہر شخص کا کام نہیں ہے کہ جس کا جی چاہے چند اصطلاحات یاد کر کے مسند ارشاد پر متمکن ہو جاوے بلکہ یہ اس شخص کا کام ہے کہ ظاہری ضروری علم کے ساتھ مدد خداوندی بھی اس کے ساتھ ہو اور اس کی علامت یہ ہے کہ علماء امت نے اس کے اقوال کو قبول کر لیا ہو اور علماء کا گروہ اس کی طرف متوجہ ہو۔ چنانچہ اس قسم کی ایک لغزش یہ ہے کہ بعضے لوگ جمعہ کی نسبت کہتے ہیں کہ دیہات میں گو نہ ہو لیکن اگر پڑھ ہی لیا جاوے تو نہ پڑھنے سے تو بہر صورت پڑھنا اچھا ہے۔ میں نے ایک شخص سے پوچھا کہ اسی طرح ایک شخص کہتا ہے کہ بمبئی میں گو حج نہیں ہوتا لیکن اگر پھر بھی کر لیا جاوے تو کیا حرج ہے۔ نہ کرنے سے تو اچھا ہی ہے اس کا کیا جواب ہے آخر یہی کہو گے کہ بمبئی حج کا محل نہیں میں کہونگا دیہات[1] جمعہ کا محل نہیں

---

[1] قرآن مجید کے اشارات اور حدیث کی صراحت سے جمعہ کیلئے شہر یا شہر جیسا ہونا شرط ہے گاؤں اس کا محل نہیں وہاں پڑھنے سے نفل نماز ہوگی نفل کی جماعت کا اور فرض ظہر ترک کرنے کا گناہ ہوگا۔

مقتدا وہ ہوسکتا ہے جو کامل العقل ہو اور بھولا ہونا کوئی کمال نہیں

غرض فہم دین کے لئے عقل کامل کی ضرورت ہے اس میں ظاہر بینی اور بھولا بھالا ہونے سے کام نہیں چلتا۔ اور یہی وجہ ہے کہ تمام انبیاءِ کامل العقل ہوئے ہیں کوئی نبی کبھی بھولا نہیں ہؤا۔ اکثر لوگ بزرگوں کی تعریف میں کہا کرتے ہیں کہ فلاں بزرگ بہت بھولے ہیں لیکن یاد رکھو کہ بھولے ہونے سے اگرچہ بعض اوقات انسان بہت سی بُرائیوں سے بچ جاتا ہے اور اس لئے بھولا ہونا بھی گو نہ فضیلت ہے لیکن فی نفسہ بھولا ہونا کوئی کمال نہیں ہے کیونکہ اس سے آدمی بہت سے فضائل سے محروم رہتا ہے اسی لئے کوئی نبی بھولا نہیں ہُوا۔ تمام انبیاء کرام کامل العقل ہوئے ہیں اور واقع میں عقل ہے بھی بڑی نعمت۔

سالک[ل] کا مجذوب سے افضل ہونا اور عقل کی فضیلت

حکایت :۔ ایک صُوفی سے میرے سامنے ایک شخص نے سوال کیا۔

ل شریعت پر عمل کے سہل طریقہ کو طریقت کہتے ہیں اگر ہوش وحواس باقی رہتے ہوئے اس راہ کو طے کیا تو سالک ورنہ مجذوب ہے جبکہ حال کے غالب ہونے سے ہوش باقی نہ رہیں۔

کہ سالک کا مرتبہ بڑا ہے یا مجذوب کا انھوں نے اس کا عجیب جواب دیا مجھے وہ جواب بہت ہی پسند آیا فرمانے لگے کہ اتنا تو ہم جانتے ہیں کہ عقل اتنی بڑی نعمت ہے کہ شریعت نے شرب خمر کو حرام کر دیا جس سے وہ زایل ہوتی تھی اور ظاہر ہے کہ سالک کی عقل ٹھکانے رہتی ہے اور مجذوب عقل سے باہر ہوتا ہے۔ اب تم خود سمجھ لو کہ سالک کا رتبہ بڑا ہے یا مجذوب کا شرح الصدور علامہ سیوطیؒ کی ایک کتاب ہے وہ اس میں ایک حدیث نقل کرتے ہیں۔ کہ ایک مرتبہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمرؓ رضی اللہ عنہ سے دریافت فرمایا کہ اے عمرؓ اس وقت تمھاری کیا حالت ہو گی کہ جب تم قبر میں تن تنہا رکھے جاؤ گے اور دو نہایت عجیب الخلقت فرشتے تم سے توحید و نبوت کے بارے میں سوال کریں گے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا اور کس قدر پیارا جواب عرض کیا۔ اور اگر وہ بھی یہ جواب نہ دیتے تو کون دیتا۔ عرض کیا۔ یا رسول اللہ یہ فرمائیے کہ اس وقت ہماری عقل رہے گی یا نہیں حضور نے فرمایا کہ ہاں عقل باقی رہے گی بلکہ عقل میں اور ترقی ہو جاوے گی (کیونکہ ہیولائی[1] حجاب اس وقت باقی نہ رہیں گے) حضرت عمرؓ نے کہا کہ یا رسول اللہ اگر عقل باقی رہے گی تو کوئی خوف کی بات نہیں۔ انشاء اللہ سب معاملہ درست

---

[1] خاکی جسم اور اس صورت مادی سے جو روح پر پردے پڑے ہوئے ہیں وہ نہ رہیں گے۔

رہے گا۔ دیکھئے یہ حضرات صحابہ عقل کی کس قدر عزت کرتے تھے اور اس کو کتنی بڑی نعمت سمجھتے تھے۔ ایک ہم لوگ ہیں کہ ذہاب عقل کو امارات بزرگی سے سمجھتے ہیں[1] ایک قصہ اس مقام پر یاد آیا گو میں نے کسی کتاب میں نہیں دیکھا اور اس لئے ممکن ہے کہ غلط ہو لیکن اس کے غلط ہونے سے ہمارا ضرر نہیں۔ کیونکہ ہم تو اپنے مضمون کو حدیث سے مؤید[2] کر چکے ہیں۔ وہ قصہ یہ ہے کہ حضرت رابعہ کو جس وقت دفن کیا تو حسب قاعدہ فرشتوں نے آ کر سوال کیا تو حضرت رابعہ نہایت اطمینان سے جواب دیتی ہیں کہ کیا اس خدا کو جس کو عمر بھر یاد رکھا گز بھر زمین کے نیچے آ کر بھول جاؤں گی۔ تم اپنی خبر لو کہ بڑی مسافت طے کر کے آئے ہو تم کو بھی یاد ہے کہ نہیں سبحان اللہ ان حضرات کا یہی اطمینان ہے۔ اسی کو ایک بزرگ فرماتے ہیں ؎

گر نکیر آید و پرسد کہ بگو رب تو کیست
گویم آں کس کہ ربود ایں دل دیوانۂ ما[3]

کیسے اطمینان سے فرماتے ہیں کہ میں تو یہ جواب دوں گا کہ

---

[1] عقل جاتے رہنے کو بجائے خامی کے بزرگی کی علامت سمجھتے ہیں [2] تائید کیا ہوا قوت دیا ہوا۔ [3] اگر قبر میں سوال کرنے والا فرشتہ نکیر آئے اور پوچھے تمہارا رب کون ہے تو میں کہہ دوں گا وہی جو ہمارا دل دیوانہ لے گیا ہے۔

"آنکس کہ ربود ایں دل دیوانہ ما" تو یہ سارا اطمینان بقاء عقل ہی کے ساتھ ہو سکتا ہے۔ اس لیئے اس صوفی نے یہ کہا کہ بھائی سالک کا رتبہ بڑا ہے کیونکہ اس کی عقل باقی رہتی ہے۔ جس کی بدولت اس کو سینکڑوں مصیبتوں سے نجات ہو جاتی ہے۔

سالک سے خلق کو ہدایت ہوتی ہے اور مجذوب محض اپنے کام کا ہوتا ہے

لیکن اب یہ سمجھنا چاہیئے کہ انبیاء تو سب کے سب کامل العقل ہوئے اور صوفیہ میں جو کہ انبیاء ہی کے نائب ہیں کچھ سالک یعنی کامل العقل اور کچھ مجذوب یعنی جن کی عقل غلبہ حالات سے مغلوب ہو گئی ان میں یہ دو قسمیں کیوں ہوئیں۔ سو اس کی وجہ یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام تو سب کے سب ارشاد و تربیت کی غرض سے بھیجے گئے تھے۔ اس لئے ان کا کامل العقل ہونا ضروری تھا۔ کیونکہ اس کے بغیر تربیت نہیں کر سکتے تھے۔ اور اولیاء بعضے تو ارشاد خلق کی غرض سے پیدا ہوتے ہیں ان کو تو سلوک کا مرتبہ عطا ہوتا ہے تا کہ بقاء عقل کے ساتھ تربیت کا کام انجام دے سکیں اور یہی لوگ ہیں جن کو ورثۃ الانبیاء کہا جاتا ہے اور بعضے محض اپنے ہی کام کے لئے پیدا ہوتے ہیں ان کے متعلق تربیت نہیں ہوتی۔ مجذوبین ان ہی میں ہوتے

ہیں گو بعض غیر مجذوبین بھی ایسے ہوتے ہیں۔ ان کی یہ شان ہوتی ہے

احمد[1] تو عاشقی بمشیخت ترا چہ کار
دیوانہ باش سلسلہ شد شد نشد نشد

بخلاف سالکین کے کہ اُن کی حالت ان کی حالت کے بالکل خلاف ہے ان کی یہ حالت ہے کہ ع

خاص[2] کند بندہ مصلحت عام را

مجذوبین کے فیض کا غیر اختیاری ہونا

ہاں مجذوبین سے بھی ایک قسم کا فیض ہوتا ہے جو بلا ان کے اختیار کے محض وجود[3] باجود کی بدولت ہے۔ سو اس کے لئے بھی عقل کی ضرورت نہیں۔ عقل کی ضرورت اس فیض کے لئے ہے جو با اختیار ہو۔ غیر اختیاری فیض کی مثال آفتاب کا نور ہے کہ گو آفتاب قصد نہ کرے لیکن اس کا نور عالم کو پُر نور ضرور کرے گا۔ اسی طرح اللہ کے نیک بندے جہاں کہیں ہوتے ہیں ان کی برکات عالم کو منور ضرور کرتی ہیں۔ اسی برکت کی نسبت ارشاد خداوندی ہے۔

---

[1] احمد تم تو عاشق ہو تم کو پیر بننے سے کیا مطلب بس ان کے دیوانے رہو سلسلہ ہو ہو نہ ہو نہ ہو [2] عام لوگوں کی مصلحت کو بندہ خاص طور سے لے لیتا ہے

[3] حق تعالے کے سخاوت والے وجود سے

مَا کَانَ اللّٰہُ لِیُعَذِّبَھُمْ وَاَنْتَ فِیْھِمْ جیسا کبھی اس کا عکس کبھی ہوتا ہے کہ بدکاروں کی بدولت اچھے لوگ تباہ و ہلاک ہو جاتے ہیں ۞

اس کا بیان کہ دیندار کو خدا تعالیٰ کی مخالفت پر غیظ و غضب کا ہونا لازم ہے اور یہ حمیت دین ہے نہ کہ تعصب جیسا آج کل سمجھا جاتا ہے

لیکن یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ اس سے پہلا قاعدہ ٹوٹ گیا۔ کیونکہ وہ اچھے لوگ جو کہ ان بدکاروں کی وجہ سے تباہ و برباد ہوئے یا تو وہ صورۃً اچھے ہوتے ہیں۔ واقع میں اچھے نہیں ہوتے چنانچہ ایک حدیث میں ہے کہ حضرت جبرائیل علیہ السلام سے خدا تعالیٰ نے فرمایا کہ فلاں شہر کو اُلٹ دو۔ حضرت جبرئیل علیہ السلام نے عرض کیا اے اللہ اس شہر میں فلاں شخص رہتا ہے جس نے کبھی آپکی نافرمانی

لے نہیں ہیں اللہ تعالےٰ کہ ان لوگوں کو عذاب دیں اس حالت میں کہ آپ ان میں موجود ہوں۔ تو آپ کی برکت سے کافروں سے عذاب ہٹ گیا ۞

نہیں کی۔ کیا اس کو بھی سب کے ساتھ اُلٹ دوں۔ ارشاد ہوا کہ گو ظاہراً اس نے نافرمانی نہیں کی۔ مگر دوسروں کی نافرمانی دیکھ کر اس میں کبھی تغیر پیدا نہیں ہوا۔ لہٰذا اس کو بھی اُلٹ دو۔ دیکھئے یہ شخص ظاہری حالت میں ایسا بزرگ تھا کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام کو بھی دھوکا ہو گیا۔ لیکن واقع میں ایک بہت بڑے گناہ میں مبتلا تھا کہ اس کو خدا تعالےٰ اور اس کے احکام کے ساتھ محبت کا جوش ذرا نہیں تھا ورنہ یہ ممکن نہیں کہ خدا اور رسول کی محبت ہو اور ان کی مخالفت ونافرمانی دیکھ کر یا شریعت کا استخفاف[1] سن کر اس کے دل میں مخالفین سے غیظ نہ پیدا ہوا یا اس کو ان کی حرکات ناگوار نہ ہوں اگر کسی دیندار کو ایسے امور ناگوار ہوتے ہیں تو اس کو متعصب اور بدمزاج کہا جاتا ہے اور یہ رائے دی جاتی ہے کہ صاحب نرمی سے جواب دینا چاہئے تھا مگر میں یہ کہتا ہوں کہ کسی شخص سے یہ کہا جاوے کہ ہم نے تمہاری ماں کو بازار میں بیٹھے ہوئے اور بازاری عورتوں کی حرکات میں مبتلا پایا ہے تو کیا یہ شخص اپنی ماں کی نسبت ٹھنڈے دل سے یہ الفاظ سن لے گا اور کہنے والے پر حملہ کرنے کو آمادہ نہ ہو جاویگا۔ کیا اس کے اس جوش کو تعصب کہا جاوے گا۔ اس کو بھی ایسی رائے دی جاوے گی مگر مولویوں پر الزام ہے کہ یہ بہت

---

[1] ہلکا کرنا حقیر بنانا۔

جلد خفا ہو جاتے ہیں اور ان کی ناک پر غصہ دھرا رہتا ہے۔ یہ بڑے متعصب ہیں لیکن صاحبو ذرا غور کیجیئے اور انصاف سے کام لیجیئے کوئی مولوی بھی سیدھی بات پر خفا نہیں ہوتا۔ نہ کسی مولوی کی ناک پر غصہ دھرا رہتا ہے۔ اگر پوچھنے کی طرح ان سے پوچھا جاوے اور بات کرنے کی طرح ان سے بات کی جائے تو کوئی وجہ نہیں کہ مولوی غصہ کریں اور خفا ہوں۔ ہاں جب ان کے ساتھ استہزاء اور خدا اور رسول کے احکام پر اعتراض بطور عناد کیا جاتا ہے تو ضرور وہ بیتاب ہو جاتے ہیں اور یہ غصہ یا بیتابی تعصب نہیں ہے۔ یہ دین کی حمیت ہے۔ صاحبو کیا شریعت کے احکام کی وہ عظمت اور محبت بھی دل میں نہ ہونا چاہیئے جو کہ اپنی ماں کی ہے کہ ماں کی نسبت ناگوار کلمات سنکر تو انسان قابو سے باہر ہو جائے اور اپنے آپے میں نہ رہے اور شریعت کی ہتک ہوتے ہوئے دیکھ کر اس کو غصہ بھی نہ آجاوے اور جن کو غصہ نہیں آتا وہ ناحقیقت شناس ہیں۔ اس لیئے ان کو غیرت نہیں آتی۔ کچھ دنوں اس رنگ میں آپ اپنے قلب کو رنگو اور پھر بھی اگر یہ حالت رہے تو جانیں۔ صاحبو محض الفاظ کے سننے سے پوری طرح

له مگر دل میں دین کی عظمت نہ ہونے سے بات کرنے والے تو اپنے نزدیک ان باتوں کو بری بات نہیں سمجھتے۔ اور جاننے والے سمجھتے ہیں ان کے دل پر چوٹ لگتی ہے اور غیرت وحمیت ابھر آتی ہے له ہنسی اڑانا له دشمنی کے طریقہ پر له ایسی بات پر تو ہر مسلمان کو غصہ آنا ضروری ہے جس کو بھی اللہ اور رسول سے محبت ہو مولوی ہو یا معمولی

سمجھ میں نہیں آسکتا کہ یہ کیفیت کیونکر ہو جاتی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ اپنے اوپر یہ حالت گذری نہیں کسی نے خوب کہا ہے ؎

بپرسید یکے کہ عاشقی چیست — گفتم کہ چو ما شوی بدانی

میں جو کچھ کہہ رہا ہوں تقلیداً ہی کہہ رہا ہوں لیکن خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ جن حضرات کی تقلید اختیار کی ہے ان کو سچا سمجھتا ہوں۔

مُحبّانِ حق کی کیا حالت ہوتی ہے اور اس کا بیان کہ جو لوگ جنابِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مُتّبع ہیں وہ جنت میں آپ کے ساتھ رہیں گے

صحابہ حضرات کی غیرت کی یہ حالت تھی کہ خدا اور رسول سے دور کرنے والی چیزوں کو گو وہ چیزیں ان کی کیسی ہی مرغوب و محبوب ہوں طاغوت سمجھتے ہیں حضرت طلحہؓ کا واقعہ ہے کہ وہ اپنے باغ میں نماز پڑھ رہے تھے کہ ایک پرندہ اس میں اڑ کر آگیا۔ اور چونکہ باغ نہایت گنجان تھا باہر نکل جانے کے لیے اس

لہ کسی نے پوچھا کہ عاشقی کیا چیز ہے میں نے کہا ہم جیسے ہو جاؤ جان لوگے ۔ بزرگوں کے اتباع میں ۔ ایک بت یا شیطان سمجھتے ہیں۔

کو کوئی راستہ نہ ملا۔ پریشان ادھر ادھر اڑتا پھرنے لگا۔ اس پرند کی یہ حالت دیکھ کر حضرت طلحہؓ کے دل میں باغ کے گنجان ہونے پر گونہ مسرت پیدا ہوئی اور یہ خیال ہوا کہ ماشاء اللہ میرا باغ کس قدر گنجان اور اس کے درخت ایک دوسرے سے کیسے پیوستہ ہیں کہ کسی پرندہ کو بھی باسانی نکل جانے کی جگہ نہیں ملتی یہ خیال آ تو گیا لیکن چونکہ دل میں عظمت و محبت خداوندی معراج کمال پر تھی۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت پر برکت سے فیضیاب تھے اس لئے فوراً ہی تنبہ ہوا اور دل میں سوچے کہ اے طلحہ تیرے دل میں مال کی یہ محبت کہ حالت نماز میں تو ادھر متوجہ ہو آخر نماز کے بعد بارگاہ نبوی میں حاضر ہوئے اور عرض کی کہ یا رسول اللہ میرے باغ نے آج مجھے عین نماز کی حالت میں خدا سے مشغول کر کے اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ لہٰذا اس کو میں اپنے پاس نہیں رکھنا چاہتا اور اس شغل عن الحق کے کفارہ میں میں اس کو وقف کرتا ہوں۔ آخر اس کو وقف کر دیا۔ جب دل کو اطمینان ہوا ان حضرات کی یہ شان ہے کہ اِذَا مَسَّهُمْ[1] طَائِفٌ مِّنَ الشَّيْطَانِ تَذَكَّرُوا فَإِذَا هُم مُّبْصِرُونَ کہ اگر شیطان کے

---

[1] حق تعالیٰ سے غفلت کے لئے جب ان کو شیطان کا جھکہ لگانے والا چھو جاتا ہے وہ اللہ کا ذکر کرنے لگتے ہیں تو اچانک ان کی آنکھیں کھل جاتی ہیں۔

وسوسہ سے کسی ضعیف سے درجہ میں بھی ان کے قلب کو میلان الی الدنیا ہو جاتا ہے تو فوراً متنبہ[1] ہوتے ہیں اور ایسا قلق ہوتا ہے کہ گویا ہفت اقلیم کی سلطنت ان کے قبضہ سے نکل گئی بلکہ سچ تو یہ ہے کہ ہفت اقلیم کی سلطنت نکل جانے سے بھی اتنا صدمہ نہیں ہوتا جو ان حضرات کے قلب پر اس میلان سے ہوتا ہے کسی نے خوب کہا ہے ؎

ہر[2] چہ از دوست وامانی چہ کفر آں حرف چہ ایماں
ہر چہ از یار دور افتی چہ زشت آں نقش و چہ زیبا

شاید لوگوں کو چہ تعجب ہو کر ذرا سا خیال آجانے سے ان کے دل پر ایسا صدمہ کیسے گذرا تو سمجھ لینا چاہیے کہ ان لوگوں کے نزدیک تمام دنیا شغل بحق کے مقابلہ میں کوئی قیمت نہیں رکھتی۔ ان کی یہ حالت ہوتی ہے کہ ؎

ہر[3] دل سالک ہزاراں غم بود — گر ز باغ دل خلالے کم بود

ایک خلال اتنا قیمتی ہے کہ دنیا تمام اس پر فدا ہے اور دنیا تو ان کو کیا مطلوب ہوتی۔ عالم آخرت کی طرف بھی ان حضرات کی توجہ

---

[1] ہوشیار [2] جس حرف کی وجہ سے دوست سے عاجز رہ جاؤ کیا کفر ہے وہ کیا ایمان۔ جس نقش سے محبوب سے دور ہو جاؤ۔ کیا برا ہے کیا اچھا [3] حق تعالیٰ میں مشغول رہنے کے لیے سالک کے دل پر ہزاروں غم ٹوٹ پڑتے ہیں اگر دل کے باغ میں سے ایک تنکا بھی کم ہو جاتا ہے۔

صرف اس لئے ہے کہ وہ ان کے مطلوب یعنی رضائے حق کا محل ہے ورنہ ان کی یہ شان ہے کہ ؎

با تو دوزخ جنت ست اے جانفزا[۱]
بے تو جنت دوزخ است اے دلربا

اور مولٰنا یہ بھی فرماتے ہیں

گفت معشوقے بعاشق کای فتے[۲] | تو بغربت دیدۂ بس شہرہا
پس کدامی شہر از آنہا خوشتر ست[۳] | گفت آں شہرے کہ دروے دلبر است

جنگل میں اگر محبوب کا ساتھ ہو جاوے تو ہزار آبادی سے بڑھ کر ہے۔ شاید کسی کو یہ شبہ ہو کہ یہ اقوال غلبہ حالات و ولولہ محبت کے ہیں کوئی واقعی تحقیق نہیں ہے تو یاد رکھو اس کے بارہ میں نص موجود ہے۔ حدیث میں ایک صحابی حضرت ثوبان کا واقعہ یاد آیا کہ وہ حضرت سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہوئے اور عرض کی کہ یا رسول اللہ اگر ہم جنت میں گئے بھی تو ہم کو وہ درجہ تو نصیب نہیں ہو سکتا جو درجہ آپ کا ہوگا اور جب ہم اس درجہ میں نہ پہنچ سکیں گے تو آپ کے دیدار سے محروم رہیں گے اور جب آپ

---

[۱] اے دل فزا تیرے ساتھ میں تو دوزخ بھی جنت ہے اور اے دلربا تیرے بغیر جنت بھی دوزخ ہے [۲] ایک معشوق نے عاشق سے کہا کہ اے نوجوان تو نے سفروں میں بہت سے شہر دیکھے ہیں [۳] تو ان میں سے کون سا شہر سب سے اچھا ہے بولا وہی شہر کہ جس میں دلبر ہے۔

کا دیدار نصیب نہ ہوگا تو ہم جنت کو لے کر کیا کریں گے۔ حضور نے یہ سنکر سکوت فرمایا۔ آخر وحی نازل ہوئی کہ[۱] مَنْ یُّطِعِ اللّٰہَ وَ الرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِکَ مَعَ الَّذِیْنَ اَنْعَمَ اللّٰہُ عَلَیْہِمْ الآیہ۔

جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی تسلی فرمائی یعنی یہ ضرورت نہیں کہ اس درجہ میں عارضی[۲] طور پر پہنچنے کے لئے اسی درجہ کے اعمال کی ضرورت ہو۔ صرف اتباع اور محبت نبی کافی ہے۔ جیسے دربار شاہی میں خدمت گار محض معیت و خدمت شاہ کی وجہ سے دیگر وزرا سے پہلے پہنچتا ہے۔ اس لئے[۴] مَعَ الَّذِیْنَ فرمایا آگے[۵] ذٰلِکَ الْفَضْلُ میں تصریح بھی فرمادی ہے کہ اس کو اپنے اعمال کا ثمرہ مت سمجھنا یہ محض فضل ہے اور واقع میں اگر غور کیا جائے تو صاف معلوم ہوگا کہ ہمارا دین اور ایمان ہماری دنیا اور سب سامان ہماری نماز ہمارا روزہ، ہمارا ثواب درجات جو کچھ بھی ہے سب حضور صلی اللہ علیہ

---

۱ جو لوگ اللہ رسول کی فرمانبرداری کرتے ہیں بس یہی لوگ ان حضرات کے ساتھ ہوں گے جن پر اللہ تعالےٰ نے انعام فرمایا ہے حضرات انبیاء صدیقین شہدا صالحین

۲ اور عارضی طور پر اس لئے کہا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے درجہ میں استقرار اور مقام کون پا سکتا ہے البتہ زیارت کے لئے رسائی ہوا کرے گی۔ جس طرح دنیا میں مسکن ہر ایک کا جدا ہوتا ہے لیکن ملاقات کے لئے دوسرا بھی آجاتا ہے ۳ ملازمہ

۴ انعام الٰہی والوں کے ساتھ ۵ یہ محض فضل وکرم ہے۔

وسلم ہی کا طفیل ہے چنانچہ ان آیات کے شان نزول کے انضمام سے صاف معلوم ہوتا ہے جن میں ارشاد ہوتا ہے[1] ذٰلِكَ الْفَضْلُ مِنَ اللّٰهِ وَكَفٰى بِاللّٰهِ عَلِيْمًا۔ اس کا یا تو یہ مطلب ہے کہ اس میں تمہارا کوئی کمال نہیں یہ محض فضلِ خداوندی ہے کہ تم کو ایک بہانہ محبت سے باریابی کی دولت نصیب ہوگئی اور یا یہ مطلب ہے ذٰلِكَ الْفَضْلُ سے بعض مغلوب[2] الیاس لوگوں کی ناامیدی دور کرنا ہے کہ شاید کسی کو یہ خیال ہو جاوے کہ ہمارے ایسے نصیب کہاں کہ ہم اس درجہ تک پہنچ سکیں تو اس کی نسبت ارشاد ہوتا ہے کہ اگرچہ تم اس قابل نہیں لیکن نعمت تمہارے اعمال کی جزا نہیں ہے کہ تم ان پر نظر کر کے اس نعمت سے مایوس ہو جاؤ۔ یہ تو محض خدا تعالےٰ کا فضل وجود ہے۔ جس کے لئے تمہارے اعمال کامل ہونے کی ضرورت نہیں ہے سبحان اللہ قرآن پاک بھی کیا عجب چیز ہے کہ دو متعارض شبہے ایک عجب[3] دوسرا یاس اور ایک جملہ میں دونوں کا جواب خواہ یوں کہہ لو خواہ یوں کہہ لو[4]

بہار عالم حسنش دل وجاں تازہ میدارد ۔۔۔ برنگ اصحاب صورت را ببو ارباب معنی را

---

[1] یہ محض اللہ تعالےٰ کا فضل وکرم ہے اور اللہ تعالےٰ سب کچھ جاننے والے کافی ہیں

[2] جن پر ناامیدی غالب ہو ۔۔۔ [3] خود بینی دوسرا ناامیدی

[4] ان کے حسن کے عالم کی بہار دل اور روح دونوں کو تروتازہ رکھتی ہے صورت پسندوں کو رنگ سے معنے کے طالبوں کو خوشبو سے۔

ہر مذاق ہر طبیعت ہر رنگ کا علاج قرآن میں موجود ہے۔
پس روایت ثوبان رضی اللہ عنہ سے بھی یہ بات بالکل صاف
معلوم ہوگئی کہ ؎

با تو[1] دوزخ جنت است اے جانفزا
بے تو جنت دوزخ است[1] اے دلربا

کیونکہ ان کے اس خیال پر انکار نہیں فرمایا گیا بلکہ تسلیم کر کے
تسلی کی گئی۔ غرض یہ مضمون بالکل سنت کے موافق ہے نرا نکتہ تصوف
یا شاعرانہ نہیں ہو یہ ہے ان حضرات کی شان کہ دونوں عالم بھی
ان کے نزدیک خدا تعالےٰ کی رضاء یا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی
لقاء کی برابر نہیں خوب کہا ہے ؎

قیمت[2] خود ہر دو عالم گفتۂ نرخ بالا کن کہ ارزانی ہنوز

محبت اور غیرت کی تو خاصیت ہی ہے کہ جب یہ بڑھ
جاتی ہے تو سب کچھ چھوٹ جاتا ہے۔ حضرت ابراہیم بن ادہم
نے غیرت ہی میں سلطنت چھوڑ دی تھی اور وجہ اس سب کی یہ
ہوتی ہے کہ ایک حالت میں دو طرف توجہ کرنی پڑتی ہے۔

---

[1] اے جانفزا تیرے ساتھ میں تو دوزخ بھی جنت اور اے دلربا بغیر
تیرے جنت بھی دوزخ ہے [2] تم نے اپنی قیمت دونوں جہان بتائی ہے
تو ابھی سستا پن ہے نرخ اور بلند کرو جو شان کے مطابق ہو۔

اور یہ ممکن نہیں[1] اس واسطے مجبوراً ایک طرف کی توجہ کو ترک کر دینا پڑے گا۔ اب رہی یہ بات کہ کس جانب کو ترک کیا جاوے تو ظاہر ہے کہ توجہ الی اللہ کی دولت تو قابل ترک نہیں لہذا دنیا ہی پر لات مار دیتے ہیں خوب کہا ہے ؎

بفراغ دل زمانے نظرے بماہ روئے
بہ ازآنکہ چتر شاہی ہمہ روز ہائے ہوئے

حضرت ابراہیم بن ادھم نے اسی کے تحصیل کے لئے سلطنت پر لات مار دی۔

انبیا جو مخلوق کی طرف متوجہ ہوتے ہیں سو ان کی یہ توجہ بھی بعینہٖ توجہ الی اللہ ہوتی ہے۔ اور اسکی توضیح ایک مثال سے

لیکن انبیاء علیہم السلام پر یہ شبہ نہ کیا جاوے کہ جب دو

---

[1] پوری طرح ورنہ اگر ہوگی تو دونوں طرف ناقص ہوگی اور محبت کی غیرت اسکو قبول نہیں کر سکتی کہ ناقص ہو ۱۲ دل خالی ہونے کے ساتھ ایک ماہرو کی طرف کچھ دیر نظر کا میسر آنا اس سے لاکھ درجے بہتر ہے کہ سر پر شاہی چھتر ہو اور سارے دن شور و شغب ہو

طرف کامل توجہ نہیں ہوسکتی اور یہ حضرات علیٰ سبیل[1] الیقین جیسا کہ حکمت بعثت شاہد ہے متوجہ[2] الی الخلائق تھے اور جب[3] متوجہ الی الخلق تھے تو توجہ الی اللہ یقیناً کم ہوگی اور جب یہ کم ہوگی تو نقص ہوگا اور نقص اس لئے منافی نبوت ہے کہ مرتبہ نبوت مراتب کمال کے اعلیٰ پایہ کا نام ہے کہ بشر کو اس سے بڑھ کر مرتبہ عطا ہو ہی نہیں سکتا۔ پس جب ان کو نبی مانا جاوے اور اس کی وجہ سے کامل فرض کیا جاوے تو کیا وجہ کہ ان میں انقطاع عن[4] الخلق جو لازمہ کمال ہے نہیں پایا جاتا۔ وجہ اس شبہ[5] کی گنجائش نہ ہونے کی یہ ہے کہ انبیا علیہم السلام کی جو توجہ الی الخلق ہوتی ہے وہ چونکہ بامر خداوندی ہے لہٰذا اس امتثال کی وجہ سے اس توجہ الی[6] الخلق میں خود توجہ الی اللہ موجود ہے کیونکہ انبیاء علیہم السلام امت کی طرف جو متوجہ ہوتے اور ان کو پیغام حق پہنچاتے ہیں سو اسی لئے کہ اس توجہ اور تبلیغ کا ان کو حکم ہے اور

---

[1] یقیناً جیسے کہ مخلوق کی طرف نبی بنا کر بھیجنا اسکی دلیل ہے [2] مخلوق کی طرف [3] جب مخلوق کی طرف متوجہ ہوئے اور دو طرف ایک وقت میں پوری توجہ نہیں ہوسکتی تو خدا تعالیٰ کی طرف توجہ میں کمی ہوگی [4] مخلوق سے بے تعلقی جو حق تعالیٰ کی طرف توجہ کے کامل ہونے کیلئے ضروری و لازم ہے [5] مخلوق کی طرف توجہ محض تعمیل حکم میں ہے تو تعمیل کی وجہ سے اُدھر ہی کی توجہ کا ذریعہ بن کر اُدھر ہی کی توجہ ہے غیر کی طرف نہیں۔

اس کا امتثال ان پر واجب ہے۔ حضرات انبیاء کی اس توجہ الی الخلق کے ساتھ توجہ الی اللہ کی مثال یہ ہے کہ اگر تم کسی آئینہ کی طرف اس لئے متوجہ ہو کہ اس میں تمہارے محبوب کا عکس نظر آرہا ہے جبکہ کسی وجہ سے خود اس کے عین[1] کو نہ دیکھ سکو تو گو ظاہراً تمہاری توجہ آئینہ کی طرف ہے لیکن عین[2] یہ توجہ عین محبوب کی طرف توجہ ہے اسی طرح انبیاء علیہم السلام کے لئے تمام خلائق مرائت[3] ہیں۔ جس کی طرف متوجہ ہونے سے مقصود ان کا توجہ الی الحق ہے۔ پس ان کے لئے توجہ الی الحق سے مانع نہیں[4]

رجوع بجانب سرخی (محبانِ حق کی کیا حالت ہوتی ہے)

غرض محبان حق غیر حق کی طرف متوجہ ہونے سے غیرت کرتے ہیں اور اسی صفت غیرت سے ان میں جوش دین پیدا ہوتا ہے۔ جس کو لوگ تعصب کا غصہ سمجھتے ہیں اور وہ ایسا مطلوب ہے جس کے نہ ہونے سے وہ شخص الٹ دیا گیا۔ پس یہ شخص ظاہر

---

[1] ذات [2] بعینہ [3] آئینے [4] جس کے متعلق جبرائیل علیہ السلام نے اٹھنے کو پوچھا تھا۔

میں نیک تھا اور واقع میں نیک نہ تھا۔ پس وہ قاعدہ نہ ٹوٹا۔ یا اگر وہ واقع میں نیک بھی ہوں تو وہ صورتہً ہلاک ہوتا ہے۔ اور معنیً رحمت۔

رجوع بجانب سرخی (مقتدا وہ ہوسکتا ہے جو کامل العقل ہو الخ)

بہر حال یہ بات ثابت رہی کہ نیکیوں کی بعض برکات اضطراری بھی ہوتی ہیں۔ جس میں قصد اور اختیار کی ضرورت نہیں لیکن جو برکت اختیاری ہوگی اس کے لئے عقل کامل وافر کی احتیاج ہے سو ایسے ہی لوگ جو کامل العقل ہیں اہل ارشاد ہوئے ہیں اور

لہ اس واقعہ سے آگے اگر کہیں اور عذاب عام آئے اور وہاں کچھ لوگ ظاہر و باطن ہر طرح سے بالکل نیک ہوں مگر وہ بھی عذاب میں ہلاک کیے جا رہے ہوں تو وہ عذاب ان پر صورت میں عذاب اور حقیقت میں رحمت ہوتا ہے ؎ اور یہ شبہ کہ دونوں کے اجتماع میں کس کا اثر ظاہر ہوگا اس کا جواب یہ ہے کہ غالب یا کثیر کا اول جیسا ما کان اللہ لیعذبہم وانت فیہم اور ثانی جیسا حدیث ہے قلنا یا رسول اللہ انھلک و فینا الصالحون قال نعم اذا کثر الخبث ۱۲ منہ

؎ بے اختیار کی جنہیں ان کے کرنے نہ کرنے کا دخل نہ ہو جیسے حضور کے وجود سے کفار پر سے عذابات کا ٹل جانا۔

بعض اولیاء اللہ جن سے کوئی تربیت عام کا کام متعلق نہیں ہوتا ایسے لوگ البتہ بھولے بھولے ہوتے ہیں کیونکہ اُن کے سپرد صرف اپنی ذات کا معاملہ ہے۔ اور اس میں وہ اسی قدر کے مکلف ہیں۔ جس قدر ان کو عقل دی گئی ہے کسی دوسرے شخص کی تربیت ان کے متعلق نہیں سو حاصل یہ ہوا کہ جن لوگوں کے متعلق تربیت عام ہے جیسے انبیاء امت جو مسند ارشاد پر متمکن ہیں ایسے لوگ بھولے بھالے نہیں ہوتے۔ یہ لوگ بڑے فطین پورے عاقل ہوتے ہیں۔

اور یہی کامل ہیں اور جن لوگوں کے متعلق کسی دوسرے کی تربیت نہیں ہوتی بلکہ محض اپنے ہی نفس کے لئے پیدا ہوتے ہیں یہ لوگ البتہ بھولے بھولے ہوتے ہیں اس لئے بعض نے یہ تقسیم کی ہے کہ انسان چار قسم کے ہیں۔ ایک وہ جن کو دین کی عقل بھی ہے اور دنیا کی بھی جیسے انبیاء اور ورثۃ الانبیاء یعنی وہ علماء جو مسند ارشاد پر متمکن ہیں دوسرے وہ جن کو دین کی عقل ہے اور دنیا کی نہیں۔ جیسے بھولے بھولے صلحاء اولیاء اُمت۔ تیسرے وہ جن کو دین کی عقل نہیں ہے اور دنیا کی عقل ہے جیسے عاقل کفار۔ چوتھے وہ جن کو نہ دنیا کی عقل نہ دین کی عقل، جیسے بیوقوف کفار +

انبیا اور علماءِ محققین کامل العقل ہوتے ہیں گو تجربہ زیادہ نہ ہو

عرض انبیاء اور علماء محققین کامل العقل ہوتے ہیں گو تجربہ میں اس لئے کمی ہو کہ وہ دنیاوی امور میں منہمک نہیں ہیں بعض لوگوں نے اس میں عجیب خلط کر دیا ہے کہ عقل اور تجربہ کو ایک چیز سمجھتے ہیں ان میں فرق نہیں کرتے اور چونکہ علماء کو تجربہ کا نہیں پاتے اس لئے علماء کو کم عقل اور بے وقوف کہتے ہیں حالانکہ تجربہ دوسری چیز ہے اور عقل دوسری چیز ہے تجربہ تکرار مشاہدہ جزئیات کا نام ہے مثلاً سقمونیا کو دس مرتبہ آزمایا گیا اس نے اسہال کا فائدہ دیا۔ تو اس تکرار مشاہدہ سے کہیں گے کہ سقمونیا مسہل ہے اور عقل ایک قوت ہے جو خدا تعالےٰ نے انسان میں ودیعت کی ہے جس سے کلیات کا ادراک کرتا ہے مولوی محمد حسین عظیم آبادی سے جو کہ میرے ایک دوست تھے ان کے طالب علمی کے زمانہ میں ایک کالج کے طالب علم نے سوال کیا کہ آسمان پر کل کس قدر ستارے ہیں انہوں نے فرمایا مرصودہ تو معلوم ہیں مگر غیر مرصودہ معلوم نہیں اس

---

۱ معین چیزوں کے اثرات کو بار بار دیکھنا ۲ جن کو رصد گاہ سے دیکھا گیا ہے۔

طالب علم نے کہا کہ مولوی صاحب تعجب ہے کہ سائنس کا اتنا ضروری مسئلہ اور آپ کو اس کی اطلاع نہیں۔ مولوی صاحب نے فرمایا کہ اچھا بتلائیے سمندر میں کس قدر مچھلیاں ہیں۔ اس طالب علم نے کہا مجھے تو علم نہیں تو مولوی صاحب فرماتے ہیں کہ افسوس ہے آپ اس قدر سائنس کے دلدادہ ہیں اور آپ کو زمین کی چیزوں کی بھی اطلاع نہیں پھر جب آپ کو ہنوز زمین کی بھی پوری اطلاع نہیں ہے تو مجھ کو آسمان کے ستاروں کی اطلاع نہ ہونا کیا تعجب ہے یہ جواب سن کر ان طالب علم صاحب کی آنکھ کھلی اور ہوش آیا۔ اس طرح لوگ صناع[1] قوموں کو کہتے ہیں کہ یہ بڑے عاقل ہیں حالانکہ وہ صرف ایک صنعت کے تجربہ کار ہیں۔ لہذا ان کو صناع کہنا چاہئے۔ نہ کہ عاقل صناعی دوسری چیز ہے۔ عاقل ہونا دوسری بات ہے اگر ہم ایک بڑے فلاسفی مثلاً افلاطون کو ایک جولاہے کے گھر لے جاویں اور اس کی کارگہ میں بٹھلا دیں۔ اور کہیں کہ ایک مہین تنزیب[2] بنو تو یقیناً وہ اس پر قادر نہ ہوگا اور جلاہا عمدہ سے عمدہ بن دے گا۔

---

[1] صنعت گر کہ چند چیزوں کو ملا کر کوئی شے بنالی یا بنی ہوئی کے اجزا الگ الگ کر لئے اسی کو سائنس کہتے ہیں یعنی ترکیب و تحلیل وہ کوئی علم نہیں بلکہ ادھیڑ بن مرکب کے اجزا اور اجزا سے مرکب کی بناوٹ ہے جیسے لوہار بڑھئی معمار کا کام وہ ہلکا ہے یہ اونچا ہے [2] باریک کپڑا اور تن زیب ایک قسم کا کپڑا ہے باریک +

اس فرق کی وجہ سے یہ کہہ دیں گے کہ یہ جلاہا اس فلسفی سے زیادہ عاقل ہے ہرگز نہیں۔ ہاں یہ کہیں گے کہ یہ فلسفی اس صنعت کو اس قدر نہیں جانتا جس قدر یہ جلاہا جانتا ہے۔ پس علماء محققین خواہ تجربہ کار نہ ہوں مگر کامل العقل ہوتے ہیں اور یہی ورثۃ الانبیاء ہیں۔ ان ہی کے متعلق ارشاد و تربیت کا کام ہوتا ہے۔ پس ان کے ساتھ احکام[1] در حکم و نیبہ[2] میں کسی کو حق مزاحمت نہیں ہے۔ جیسا کہ اس قاعدہ شرعیہ کو کہ مفسدہ[3] کی وجہ سے مصلحت غیر ضروریہ کو چھوڑ دیتے ہیں نہ سمجھنے سے بعض کو غلطی ہو گئی کہ وہ علماء سے مزاحمت کرنے لگے۔

رجوع بجانب سرخی (آخری جمعہ کو خطبۃ الوداع پڑھنا بدعت ہے)

غرض جو چیز مطلوب نہ ہو اور اس کے ارتکاب میں مفسدہ بھی ہو تو اس کو ترک کر دیں گے جب یہ قاعدہ کلیہ معلوم ہو گیا تو اب سمجھنا چاہئے کہ الوداع کا خطبہ کسی دلیل سے شرعاً مطلوب نہیں ہے اور اس کے پڑھنے میں بہت سے مفاسد ہیں۔ لہٰذا اس کو

---

[1] مسائل اور دینی حکموں کی وجہیں [2] خرابی کی وجہ سے اس مصلحت کو [3] جو ضروری نہ ہو خود مطلوب نہ ہو کوئی مطلوب اس پر موقوف نہ ہو۔

ضرور ترک کیا جاوے گا۔ رہی یہ بات کہ لوگ اس بہانہ سے آ جاتے ہیں اگر یہ نہ ہوگا تو لوگ نماز میں آنا چھوڑ دیں گے۔ سو سمجھ لینا چاہئے کہ جو لوگ خدا کے لئے نماز پڑھتے ہیں وہ تو ہر حالت میں آویں گے۔ خطبہ وداع پڑھا جاوے یا کوئی دوسرا خطبہ اور جو لوگ محض پابندی رسم کے لئے آتے ہیں وہ اگر اس کے ترک سے آنا چھوڑ بھی دیں تو ان کے اس خیال سے ہم ایک مقدمہ[1] قبائح کے کیوں مرتکب ہوں۔ خواہ وہ آویں یا نہ آویں۔

دین اس سے مستغنی ہے کہ کسی کو اپنی طرف متوجہ کرنے کے لئے اس کی خواہش کے تابع ہو اور

اس کا بیان کہ اسلام کی رُو سے امیر اور غریب سب برابر ہیں

ایک شخص نے مجھ سے کہا کہ اگر نکاح بیوگان کا ذکر نہ کرو تو میں وعظ میں آؤں میں نے کہا کہ تو آج ضرور یہی بیان کروں گا تمہارا

---

[1] بُرائیوں کا ذریعہ

جی چاہے آؤ نہ جی چاہے نہ آؤ۔ دین کسی کے آنے کا محتاج نہیں ہے

زعشق ناتمام ما جمال یار مستغنی است
بآب و رنگ و خال و خط چہ حاجت روئے زیبا را

جس کا حسن ذاتی حسن ہے اس کو تکلفات کی اور کسی کے دیکھنے نہ دیکھنے کی کیا پرواہ ہے خواہ کوئی دیکھے یا نہ دیکھے وہ بالکل مستغنی ہے اسی طرح ہم کسی کے آنے نہ آنے کی پرواہ نہ کریں گے اور شرع کو محض اس مصلحت سے نہ چھوڑیں گے کہ ہمارے اکابر سلف کا اس استغنا مذکور پر پورا عمل تھا۔

حضرت عمر بن الخطاب کے زمانۂ خلافت میں جبلہ بن ایہم غسانی جو کہ ملوک غسان میں سے تھا مسلمان ہوا۔ موسم حج میں خانہ کعبہ کا طواف کر رہا تھا ایک دوسرا غریب آدمی بھی ساتھ ساتھ طواف کرتا تھا۔ اتفاق سے اس غریب آدمی کے پاؤں کے تلے اس کی ازار کا کنارہ دب گیا جبلہ جب آگے بڑھا تو اس کی لنگی کھل گئی اور برہنہ رہ گیا۔ چونکہ وہ اپنے کو بہت بڑا آدمی سمجھتا تھا اور یہ دوسرا شخص نہایت غریب آدمی تھا لہذا اس کو بہت غصہ آیا اور اس نے ایک طمانچہ اس زور سے مارا کہ اس بے چارہ کا

لہ ہمارے ناتمام و ناقص عشق سے محبوب کا حسن بے نیاز ہے ہو ہو نہ ہو نہ ہو۔

آب تاب و رنگ تل اور خط کی حسین چہرہ کو کیا حاجت ہے۔ جب فطری حسن ہو پھر بناوٹ کی کیا ضرورت

دانت ٹوٹ گیا وہ شخص اس حالت کو لئے ہوئے حضرت عمرؓ کی خدمت میں پہنچا اور عرض کیا کہ امیرالمومنین جبلہ نے میرا دانت توڑ دیا حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ جبلہ کو ہمارے پاس بلا لاؤ۔ صاحبو غور کیجئے یہ امتحان کا مقام ہے کہ ایک بادشاہ کو ایک غریب آدمی کے معاملہ میں پکڑ کر بلایا جاتا ہے۔ چنانچہ جبلہ کو لایا گیا حضرت عمرؓ نے واقعہ دریافت فرما کر اس غریب شخص کو اجازت دی

عہ تتمہ قصہ کا یہ ہے کہ جبلہ نے حضرت عمرؓ سے عرض کیا کہ کیا مجھ کو ایک دن کی مہلت مل سکتی ہے میں کل کو قصاص دینے پر آمادہ ہو جاؤں گا آپ نے فرمایا کہ اگر صاحب حق راضی ہو جاوے تو مہلت ہے چنانچہ وہ غریب مسلمان راضی ہو گیا اور جبلہ قصاص سے بچکر رات ہی کو مدینہ سے بھاگ گیا اور رومیوں میں جا ملا جو کہ نصاریٰ تھے اور مرتد ہو گیا اس کے بعد ایک صحابی سفیر بن کر حضرت عمرؓ کی طرف سے روم کے بادشاہ ہرقل کے پاس کسی ضرورت سے گئے تو اس نے کہا کہ تم جبلہ سے ملنا چاہتے ہو انہوں نے کہا وہ کہاں ہے میں اس سے ملوں گا اس نے کہا کہ وہ بہت عزت کے ساتھ ہمارے پاس ہے چنانچہ وہ اس کے پاس گئے تو وہ بڑی شان کے ساتھ موتیوں سے جڑا ہوا تاج پہنے ہوئے ریشمی لباس اور سونا چاندی کے ساز و سامان کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا اور گرد بہت سے غلام اور باندیاں خدمت کو موجود تھیں کیونکہ نصاریٰ کو جبلہ کے مرتد ہونے کی بہت خوشی تھی اسلئے کہ وہ اسلام سے پہلے نصرانی تھا اور صاحب سلطنت تھا اس لئے اس کو بہت عزت سے رکھا جب وہ صحابی اس

بقیہ ص ۲۴۵

کہ جبلہ سے اپنا بدلہ لے لے جبلہ نے جب یہ سُنا تو طیش میں آ کر کہا

بقیہ صفحہ ۲۴۴

کے پاس پہنچے تو آپ نے اس طرح سلام کیا سلام علیٰ من اتبع الہدیٰ کہ جو ہدایت کی پیروی کرے اس کو سلام پہنچے۔ جبلہ نے کہا کہ تم نے السلام علیکم مجھے کیوں نہیں کیا انہوں نے فرمایا کہ اس طرح سلام کرنا مسلمانوں کے لئے مخصوص ہے اور میں تم کو اسلام کے خلاف دیکھتا ہوں اس نے کہا کہ اگر میں دل میں مسلمان ہی ہوں صحابی نے فرمایا کہ میں اس خوشخبری کے سننے کا مشتاق ہوں خدا کرے تم دل سے مسلمان ہی ہو مگر جبلہ نے بات کو ٹال دیا پھر اس نے چاندی یا سونے کی کرسی اُن صحابی کے بیٹھنے کے لئے پیش کی انہوں نے کہا کہ ہمارے نبی نے ہم کو اس سے منع فرمایا ہے تو جبلہ نے حضور کا نام سنکر آہستہ سے روحی فداہ صلی اللہ علیہ وسلم کہا ان صحابی نے کہا کہ اے جبلہ میں تیرے اندر اسلام کی محبت پاتا ہوں پھر تو مسلمان کیوں نہیں ہو جاتا اس نے کہا کیا اب بھی میرا اسلام دوبارہ قبول ہو سکتا ہے آپ نے فرمایا کہ ہاں اسلام میں تنگی نہیں توبہ کر لو پھر اسلام قبول ہو جائیگا اس نے کہا کہ اس شرط سے مسلمان ہوں کہ مجھ سے وہ قصاص نہ لیا جائے دوسرے حضرت عمر اپنی بیٹی سے میرا نکاح کر دیں اور اپنے بعد میرے واسطے خلافت کی وصیت کر دیں انہوں نے کہا کہ یہ شرطیں میں نہیں کہہ سکتا کہ منظور ہوں یا نہیں، پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مدح اور محبت کی باتیں کرتا رہا پھر اور باتیں ہوئیں آخیر میں وہ رونے لگا اور کہا اے کاش میں اس وقت قصاص دینا منظور کر لیتا اور اس سے انکار نہ کرتا کہ یہ حالت عیش و عشرت کی اگرچہ مجھے اب بہت کچھ نصیب ہو گئی مگر اس سے وہ فقر کی حالت ہی بہتر تھی ان صحابی نے یہ باتیں حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے آکر بیان

باقی بر صفحہ ۲۴۶

کہ امیر المومنین مجھ کو اور ایک معمولی بازاری غریب آدمی کو کس چیز

کیں آپ نے فرمایا کہ تم نے اسکی شرائط منظور کیوں نہ کر لیں قصاص والے کو ہم دیت قبول کرنے پر راضی کر دیتے، اور عمر کی بیٹی کیا بڑی چیز تھی اس سے اس کا نکاح بھی ہو جاتا رہا خلافت کا مسئلہ تو اس وقت ہم اسکو منظور کر لیتے پھر مسلمان جس کو چاہتے خلیفہ بناتے اسکے بعد پھر جبلہ کے انتقال کی خبر پہنچی اور بظاہر اس نے اسی حالتِ کفر پر جان دی باقی دل کا حال خدا کو معلوم ہے ہکذا ذکرہ من تاریخ الطبری - یہاں یہ اشکال ہو گا کہ حضرت عمر نے ایک ذراسی بات پر اس پر اتنی سختی کیوں کی کہ وہ اسلام سے پھر گیا قصاص نہ لیتے تو کیا ہو جاتا مگر یہ شبہ وہی کر سکتا ہے جس کی نظر میں اسلام کی وقعت نہیں اگر آپ ایسا کرتے تو اسلام کی بنیاد سست ہو جاتی کیونکہ یہی تو وہ بات ہے جو یہود و نصاریٰ نے اختیار کر لی تھی کہ جب اُن میں سے کسی معزز آدمی نے زنا کیا تو اس کو صرف رُسوا کر دیتے اور سنگسار نہ کرتے اور غریب آدمی زنا کرتا تو اس پر حد جاری کرتے یعنی پتھروں سے مار ڈالتے حضرت عمر نے اسلامی حکم کی وقعت کے سامنے اسکی ذرا بھی پرواہ نہیں کی اور ایک جبلہ کیا اگر ہزار جبلہ جیسے باوجاہت ہوتے جب بھی آپ اسلامی حکم کو نہ بدلتے اور نہ بدلنے کا آپ کو کوئی حق تھا دوسرے یہ کہ اس وقت تو ایک جبلہ ہی مرتد ہوا مگر ہزاروں عقلا کی نظر میں اسلام کی وقعت قائم ہو گئی کہ اسلام میں مظلوم کی اتنی رعایت ہے کہ اس پر بڑے سے بڑا معزز بھی ظلم کرے تو اس سے بدلہ لیا جاتا ہے جس طرح ایک معمولی آدمی سے اور اگر آپ اسکی رعایت کر جاتے تو ممکن تھا کہ جبلہ اسلام پر قائم رہ جاتا مگر ہزاروں عقلاء

(باقی بر صفحہ ۲۴۷)

نے برابر کر دیا۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ اسلام نے اور اس میں

خلیفہ کے اس فیصلہ کو بُری نظر سے دیکھتے اور اسلام سے بدگمان ہو جاتے رہا کسی کا اسلام میں رہنا یا نکل جانا اس کی اسلام میں ذرا پرواہ نہیں جو اسلام لاتا ہے اپنے فائدے کے واسطے کسی پر کیا احسان ہے فَمَنْ شَاءَ فَلْيُؤْمِنْ وَمَنْ شَاءَ فَلْيَكْفُرْ اِنَّآ اَعْتَدْنَا لِلظّٰلِمِيْنَ نَارًا اَحَاطَ بِهِمْ سُرَادِقُهَا وَاِنْ يَّسْتَغِيْثُوْا يُغَاثُوْا بِمَآءٍ كَالْمُهْلِ يَشْوِی الْوُجُوْهَ بِئْسَ الشَّرَابُ وَسَآءَتْ مُرْتَفَقًا رہا یہ کہ آپ نے اس کی یہ باتیں سن کر فرمایا کہ تم نے شرائط منظور کر لی ہوتیں تو آپ کی شفقت کی دلیل ہے کہ آپ کو اس کے مرتد ہونے سے اس وجہ سے صدمہ ہوا تھا کہ جنت کی طرف آ کر پھر دوزخ کی طرف چلا گیا۔ نیز یہ کہ جو شخص اسلام لانا چاہے اس کی کسی قدر تالیف قلب مناسب ہے البتہ جو اسلام لا چکے اس کی تالیف قلب کی ضرورت نہیں اس لئے پہلی بار آپ نے رعایت نہ فرمائی کیونکہ وہ اسلام کا مدعی تھا اور اس وقت رعایت کرنا چاہی کیونکہ اسلام پھر قبول کرنا چاہتا تھا اور حدیث میں جو ہے اَقِيْلُوْا ذَوِی الْهَيْئَاتِ عَثَرَاتِهِمْ یہ ان حقوق میں ہے جن کی معافی کا خود اختیار رکھتا ہو۔ مثلاً اس صورت میں وہ صاحب معاملہ معاف کر دیتا یا حقوق اللہ میں جو غیر حدود ہوں حاکم ہی معاف کر دے اور وہ بھی استحباب کے لئے ہے اور لفظ عثرات مشیر ہے کہ اس کا صدور خطاءً ہو گیا ہو استکباراً و ظلماً نہ ہو۔ جیسا اس واقعہ میں ہوا تھا۔ فقط

ظفر احمد عثمانی

امیر غریب سب برابر ہیں تم نے اس کا دانت توڑا تمہارا دانت ضرور توڑا جاوے گا ؂

اسلام کی رُو سے اُمراء غُرباء سب برابر ہیں اور اس کا بیان کہ اہل اللہ کا برتاؤ اس زمانہ میں بھی اس کے موافق ہے

دیکھئے یہ ہے اخوت اسلامی ایک آج وقت ہے کہ اُمراء ورُؤسا کا عالم ہی اس عالم سے جدا اور نرالا ہے۔ غربا کو وہ گویا انسانیت سے ہی خارج سمجھتے ہیں لیکن اس گئے گذرے وقت میں بھی اگر اس کا کچھ اثر باقی ہے تو اللہ والوں میں ہے۔ حضرت مولٰنا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ ہے کہ ایک مرتبہ ان کے یہاں ایک بڑے عہدہ دار کوئی شخص مہمان آئے جب کھانے کا وقت ہوا تو حضرت نے اپنے ساتھ ان کو بٹھلایا۔ کیونکہ وہ بڑے آدمی سمجھے جاتے تھے ان کو ساتھ بیٹھا دیکھ کر دوسرے غریب طلبہ مہمان پیچھے کو ہٹے حضرت مولٰنا نے فرمایا کہ صاحبو آپ لوگ کیوں ہٹ گئے کیا اس وجہ سے کہ ایک عہدہ دار میرے ساتھ بیٹھا ہے۔ خوب سمجھ لیجئے کہ آپ لوگ میرے عزیز ہیں۔

میں جس قدر آپ کو معزز سمجھتا ہوں اس کے سامنے ان کی کچھ بھی وقعت نہیں چنانچہ سب غریب طلبہ کو بھی ساتھ بٹھلا کر کھلایا شاید اس سے کسی کو یہ شبہ ہو کہ مولانا نے اپنی شان جتلانے کو ایسا کہہ دیا ہوگا خوب سمجھ لینا چاہئے کہ وہاں شان اور بڑائی کا نام بھی نہ تھا جن صاحبوں نے مولانا کو دیکھا ہے وہ تو خوب جانتے ہیں مگر جن لوگوں نے نہیں دیکھا ہے ان کے لئے ایک قصہ بیان کرتا ہوں اس سے اندازہ ہوگا کہ وہاں شان اور بڑائی کتنی تھی۔ ایک مرتبہ حضرت مولانا حدیث شریف کا درس دے رہے تھے ابر ہو رہا تھا کہ اچانک بوندیں پڑنا شروع ہو گئیں جس قدر طالب علم شریک درس تھے سب نے کتاب کی حفاظت کے لئے کتابیں اٹھائیں بھاگے اور سہ دری میں پناہ لی اور کتابیں رکھ کر جوتے اٹھانے چلے صحن کی طرف جو رخ کیا تو کیا دیکھتے ہیں کہ حضرت مولاناؒ سب کے جوتے سمیٹ کر جمع کر رہے ہیں اس واقعہ سے معلوم ہو گیا ہوگا کہ وہاں کس قدر شان کو جتلایا جاتا تھا شان نہ تھی بلکہ محض محبت دینی تھی کہ غربا کو امرا سے کچھ کم نہیں سمجھا یہی لوگ ہیں جن کی بدولت دنیا کا کارخانہ قائم اور نظام عالم مسلسل ہے جس دن یہ حضرات نہ رہیں گے۔ قیامت قائم ہو جاوے گی ؏

دین کے کام سے دنیا کا فائدہ مقصود نہ ہونا چاہیئے اور اس کا بیان کہ طالب حق کی کیا حالت ہوتی ہے

غرض یہ تو حضرت عمرؓ کا امتحان تھا جس میں وہ پورے اترے آگے جبلہ کا امتحان ہے کہ دیکھیں کیا سمجھ کر ایمان لایا ہے آیا کوئی دنیاوی غرض عز وجاہ کی ہے کہ مسلمان ذی عزت ہوتے چلے جا رہے ہیں ان کے ہمرنگ ہو جاویں گے تو ہم کو بھی عزت نصیب ہوگی یا یہ کہ محض طلب آخرت کے لئے ایمان لایا ہے چنانچہ بعض لوگ بزرگوں سے بھی اس لئے ملتے ہیں کہ لوگ ان کی عزت کرتے ہیں ان کو بڑا سمجھتے ہیں اگر ہم ان کے ساتھ رہیں گے ہماری بھی عزت ہوگی اکثر چھانٹ کر ایسے ہی بزرگوں سے بیعت ہوتے ہیں کسی جلاہے تیلی کے گو وہ کیسا ہی بزرگ اور نیک ہو مرید نہیں ہوتے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہم لوگ محض مدعی ہیں بس ہم کو نہ طلب صادق ہے نہ محبت واقعی جہاں اپنی دنیاوی غرض پوری ہوتے نہ دیکھتے ہیں چار قدم بڑھا دیتے ہیں یہ نہ ہو تو یہ بھی نہیں ایسے ہی لوگ ہیں جو کہ امتحان کے وقت ادھورے

اترتے ہیں[1] عِندَ الاِمتِحَانِ یُکرَمُ الرَّجُلُ اَویُہَانُ خوب کہا ہے ؎

صُوفی[2] نشود صافی تا در نکشد جامے

بسیار سفر باید تا پختہ شود خامے

چنانچہ جبلہ کا امتحان ہوا اور وہ اس میں ناکام ثابت ہوا یعنی اُس نے کہا کہ اچھا مجھے ایک دن کی مہلت ہو سکتی ہے حضرت عمرؓ نے فرمایا ہو سکتی ہے اگر یہ شخص مہلت دے صاحب حق سے پوچھا گیا وہ بیچارہ اس قدر نیک دل تھا کہ اس نے اجازت دے دی جبلہ موقع پا کر رات کو اٹھ بھاگا اور رومیوں سے جا ملا اور بدستور سابق نصرانی ہو گیا دیکھیے اس کو طلب صادق اور محبت واقعی دین سے نہ تھی کہ ذرا سی ذلت کے خوف سے دین چھوڑ دیا جس کا نتیجہ ابدالآباد کی ذلت ہے اُدھر حضرت عمرؓ کو دیکھیے کہ ذرا پرواہ نہیں کی کہ یہ امیر ہے دوسرا غریب اودھر ان کو دیکھیے کہ ذرا سی تکلیف نفس پر گوارا نہ کر سکا ایسے بہت لوگ ہیں کہ وہ اتباع شریعت محض نفع دنیاوی کے لئے کرتے ہیں لیکن جو خدا کے مخلص بندے ہیں ان کی یہ حالت ہے کہ اُن پر کچھ بھی گذر جاوے مگر ان کو حق کے مقابلہ میں سب ہیچ معلوم ہوتا ہے ؎

---

[1] امتحان کے وقت یا تو آدمی کی عزت کی جاتی ہے یا ذلت یعنی کامیابی پر عزت ناکامی پر ذلت

[2] صوفی اس وقت تک صاف دل نہیں ہو سکتا جبتک شراب عشق کا جام نہ پی لے مدت سفر ہونا ضروری ہے تاکہ خام پکا بن جاوے۔

سه کشند از برائے دلے بارہا　　　خورند از برائے گلے خارہا

اور پھر چاہے طلب اور جستجو میں عمر بھی ختم ہو جاوے مگر گھبراتے اکتاتے نہیں کیونکہ ان کی طلب صادق ہوتی ہے اور ان کو معلوم ہوتا ہے کہ محبوب اور مطلوب کون ہے وہ زبان حال سے یوں کہتے ہیں ؎

طلبگار باید صبور و حمول　　　کہ نشنیدہ ام کیمیا گر ملول

یعنی فن کیمیا کا طالب اکثر ساری عمر طلب میں برباد کر دیتا ہے اور ہمیشہ ایک تاؤ کی کسر میں رہتا ہے لیکن آپ نے کسی طالب کیمیا کو نہ دیکھا ہوگا کہ وہ ناکامی سے گھبرا کر اکتا گیا ہو اور کیمیا کی فکر چھوڑ دی ہو تو کیا خدا کا طالب طالب کیمیا کے برابر بھی نہ ہو خوب سمجھ لو کہ جو اکتا گیا وہ طالب نہیں صورت طلب کو طلب نہیں کہتے جیسے صورت آدمی کو آدمی نہیں کہتے۔ خوب کہا ہے ؎

آنکہ می بینی خلاف آدم اند
نیستند آدم غلاف آدم اند

لہ ایک دل کی وجہ سے بہت سے بوجھ کھینچتے ہیں ایک پھول کے لئے بہت سے کانٹے کھاتے ہیں۔ ۲ے طلب والے کو تو بہت صبر اور بہت تحمل کرنے والا ہونا چاہئے کیونکہ میں نے کسی کیمیا والے کو اکتا جانے والا نہیں سنا۔

سه یہ جو تم دیکھتے ہو کہ یہ لوگ حضرت آدم کے خلاف ہیں یہ آدمی نہیں بلکہ آدم کا غلاف ہیں۔

مصالح کی وجہ سے بدعات کی اجازت نہیں دی جاسکتی

پس جو لوگ الوداع کے خطبہ نہ ہونے سے نہ آویں۔ اُن کے نہ آنے کی کچھ بھی پرواہ نہ کی جاوے گی اور ایسے وہمی[1] مصالح سے اس قسم کی بدعات کی اجازت نہ دی جاوے گی۔

فضائل رمضان کا بیان

حضور صلی اللہ علیہ وسلم رمضان کے مہینہ کے برکات و آثار کے باب میں ارشاد فرماتے ہیں هُوَ شَهْرٌ اَوَّلُهٗ رَحْمَةٌ وَّاَوْسَطُهٗ مَغْفِرَةٌ وَّاٰخِرُهٗ عِتْقٌ مِّنَ النِّيْرَانِ ترجمہ یہ ہے کہ ماہ رمضان ایسا مہینہ ہے کہ اس کا اول حصہ رحمت ہے اور درمیانی حصہ مغفرۃ ہے اور آخری حصہ آگ سے آزادی ہے تو سمجھنا چاہئے کہ یہ جو فرمایا گیا کہ اس کا اول حصہ رحمت ہے تو وجہ اسکی یہ ہے کہ رحمت ایک لطف ہے۔ چونکہ ابتداء حصہ میں خداوند تعالیٰ کی طرف سے عمل

---

[1] بلکہ اگر وہمی نہ ہوں واقعی بھی کچھ ہوں تو بھی بدعتوں کی اجازت نہیں دی جاسکتی۔

کرنے کی توفیق عطا ہوتی ہے کہ بدوں اس توفیق کے کوئی عمل بھی نہیں ہو سکتا۔ اس لئے رحمۃ فرمایا گیا۔

آدمی کو اپنے عمل پر کبھی ناز نہ کرنا چاہیئے

اور یہیں سے یہ بات بھی سمجھ لینی چاہیئے کہ بعض لوگوں کو جو اپنے تھوڑے عمل پر ناز ہو جاتا ہے کہ ہم بہت کچھ کرتے ہیں یہ کوتاہی نظر کی دلیل ہے انسان کوئی کام نہیں کر سکتا۔ جب تک کہ اُدھر سے امداد و توفیق نہ ہو خوب کہا ہے ؎

بے عنایات حق و خاصانِ حق ¹ گر ملک باشد سیہ ہستش ورق

دوسری جگہ فرماتے ہیں ؎

این ہمہ گفتیم ولیک اندر بسیچ ²
بے عنایات خدا ہیچیم و ہیچ

کہ گو ہم نے سب کچھ بتلایا لیکن عنایاتِ خداوندی نہ ہو تو ہم کچھ بھی نہیں پس خدا کی عنایت سے توفیق ہوتی ہے اپنا کوئی کمال نہ سمجھے جب تک کہ دل میں کوئی بات نہیں ہوتی۔ آدمی کچھ

---

¹ حق تعالٰے اور ان کے خاص بندوں کی عنایت و توجہ کے بغیر اگر فرشتہ جیسا بھی ہو اس کا بھی عمل نامہ سیاہ ہے ² ہم نے یہ سب کچھ کہا ہے لیکن انجام میں یہ ہے کہ حق تعالٰے کی عنایت کے بغیر ہم ہیچ در ہیچ ہی ہیں۔

کبھی نہیں کر سکتا اور یہ خدا کے اختیار میں ہے ع

منؑ چو کلکم درمیانِ اصبعین

آخر کیا سبب تھا کہ ابوجہل جو کہ نہایت سمجھ دار سمجھا جاتا تھا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا رشتہ میں چچا ہوتا تھا۔ تیرہ برس تک حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو دعوت ایمان فرمائی لیکن اس کو کلمہ پڑھنا نصیب نہ ہو سکا اور حضرت بلالؓ جو حبشہ کے رہنے والے تھے نہ کچھ بڑے زیرک سمجھے جاتے تھے نہ پہلے سے حضور کی صحبت میسر ہوئی تھی۔ کیونکہ مکہ میں آکر ایک کافر کے پھندے میں پھنس گئے کہ آزادی بھی نصیب نہ تھی جس سے تحقیقات کا ہی موقع ملتا پھر تکالیف کا یہ عالم کہ پتھر تپتا ہوا سینہ پر رکھ دیا جاتا تھا لیکن باوجود اس کے آپ کی زبان سے اَحدؑ اَحد ہی نکلتا تھا بس وجہ یہ تھی کہ ابوجہل کو توفیق نہیں دی گئی اور ان کو توفیق دی گئی۔

حسنؑ ز بصرہ بلال از حبش صہیب از روم

زخاک مکہ ابوجہل ایں چہ بوالعجبی است

---

۱ میں مثل قلم کے ہوں دو انگلیوں کے بیچ میں ۲ یکتا یکتا یعنی معبود یکتا ہے اس کا کوئی شریک نہیں ۳ حضرت حسن بصرہ سے حضرت بلال حبش سے حضرت صہیب روم سے ہدایت یاب ہو گئے جو مکہ شریف سے دور کے مقامات ہیں اور مکہ کی خاک سے ابوجہل بے ہدایت یہ کیسا عجیب کرشمہ ہے۔

حقیقت میں جب تک ادھر سے جذب[1] اور مدد نہ ہو کچھ نہیں ہو سکتا تو یہ کہنا کہ اَنَا[2] کَذَا وَاَنَا کَذَا محض جہل ہے۔ ایک بزرگ کی حکایت لکھی ہے کہ وہ چلے جا رہے تھے۔ شاہی محل کے نیچے سے گذر ہوا بادشاہ نے ان کو اپنے پاس ملنے کے لئے بلایا۔ انہوں نے کہا کہ کیونکر آؤں کہ دروازہ بڑی دور اور پھر وہاں پہرہ چوکی۔ بادشاہ نے کمند لٹکا دی یہ اس کے سہارے سے اوپر پہنچ گئے۔ جب وہاں پہنچے تو بادشاہ نے ان سے گفتگو شروع کی۔ اثنائے گفتگو میں بادشاہ نے پوچھا کہ آپ خدا تعالےٰ تک کیونکر پہنچے۔ انہوں نے کہا کہ جس طرح آپ تک پہنچا یعنی جس طرح تم نے وہ کمند ڈالی اور اس کے ذریعہ سے مجھے کھینچ لیا اسی طرح خدا تعالےٰ نے بھی جذب کی کمند ڈال کر مجھے کھینچ لیا۔ خوب کہا ہے ؎

نگرد[3] د قطع ہرگز جادۂ عشق از دویدنہا

کہ میبالد بخود این راہ چوں تاک از بریدنہا

یہ تو اپنے عمل کے بارہ میں ہے اور ایک دوسرے شخص نے جذب کے بارہ میں لکھا ہے۔ لیکن یہ مضمون محبوب مجازی کے باب

---

[1] کشش [2] میں ایسا ہوں میں ویسا ہوں [3] عشق کا راستہ دوڑیں لگانے سے ہرگز قطع نہیں ہو سکتا کیونکہ یہ راستہ خود اس طرح بڑھتا ہے جیسے انگور کا درخت کاٹنے سے بڑھتا ہے۔

میں ہے اس لئے الفاظ اچھے نہیں ؎

خود بخود[1] آں بت عیار بہ بر می آید
نہ بزر دو نہ بزاری نہ بزور می آید

میں نے الفاظ بدل دئے ہیں کہ محبوب حقیقی کے مناسب ہو جائے ع خود بخود[2] آں مہ دلدار بہ بر می آید الخ

جب محبوبان مجازی کا یہ عالم ہے تو اس محبوب حقیقی کو کون مجبور کر سکتا ہے وہ تو اس کے شائبہ سے بھی منزہ ہیں[3]

دُعا کے وقت اس کو مشیت کے ساتھ مُعلّق کرنا بے ادبی ہے

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قربان ہو جائیے فرماتے ہیں لَا تَقُلْ اَللّٰھُمَّ ارْحَمْنِیْ اِنْ شِئْتَ فَاِنَّہٗ لَا مُکْرِہَ لَہٗ کہ یُوں دُعا نہ مانگو کہ اے خدا اگر آپ چاہیں تو ہم پر رحم فرمائیے اس واسطے کہ خدا تعالٰے پر تو کوئی اکراہ و جبر کرنے والا نہیں ہے۔ صاحبو

---

[1] وہ چالاک محبوب خود بخود تو بغل میں آ سکتا ہے مگر نہ زور سے آ سکتا ہے نہ رونے سے نہ مال سے [2] خود بخود تو وہ دل لینے والا چاند بغل میں آ سکتا ہے

[3] پاک۔ [4] کہ چاہنے پر موقوف کرنا کہ آپ چاہیں تو ایسا کر دیں۔

دیکھئے ظاہر نظر میں مشیت پر موقوف کر کے دُعا مانگنا ادب معلوم ہوتا ہے لیکن واقعہ میں سخت بے ادبی ہے لیکن کسی کی نظر اس بے ادبی تک نہیں پہنچ سکتی۔ یہ نظر نورِ نبوت اور وحی کی محتاج ہے اور وجہ اس کے داخل بے ادبی ہونے کی یہ ہے کہ درخواست میں مشیت کی قید لگانے کی ضرورت تو اسی وقت ہوتی جبکہ خدا تعالےٰ میں مجبور ہونے کا احتمال بھی ہوتا اس لئے یہ قید لگاتے کہ اللہ تعالےٰ پر دباؤ نہ پڑے۔ یہاں یہ بات کہاں تم دس ہزار دفعہ مانگو اور دُعا کرو وہ چاہیں گے قبول کرلیں گے یا رد کردیں گے۔ پھر کیوں تم قید لگاتے ہو۔ میں سچ کہتا ہوں کہ اگر دنیا بھر کے عقلاء جمع ہو کر غور کرتے تو اس دقیقہ تک نہ پہنچتے جہاں حضور پہنچے ہیں۔

رجوع بجانب سرخی (آدمی کو اپنے عمل پر کبھی ناز نہ کرنا چاہیئے)

اور جب خدا تعالےٰ مجبوری سے بالکل پاک ہیں تو اگر تم کو توفیق روزہ رکھنے اور تراویح وقرآن پڑھنے کی نہ دیتے۔ تو تم کیا کرسکتے تھے اسی لئے فرمایا کہ آقۃ اللہ رحمۃ کیونکہ صوم وغیرہ

۱؎ اس کی مرضی پر چھوڑ دیا ۲؎ باریکی

کی توفیق دینا عبادت کی توفیق دینا بہت بڑی رحمت ہے۔

رجوع بجانب سرخی (فضائل رمضان کا بیان)

اور چونکہ ارشاد خداوندی ہے کہ اِنَّ الْحَسَنَاتِ یُذْهِبْنَ السَّیِّئَاتِ کہ نیکیوں سے برائیاں معاف ہو جاتی ہیں تو جب اول رمضان میں توفیق ہو جانے کی وجہ سے اعمال نیک شروع ہو گئے تو ان سے گناہ معاف ہو جانے شروع ہوئے جب ان کی بدولت گناہ معاف ہو گئے تو وسط رمضان مغفرۃ ہوا اسی کو فرماتے ہیں[۱] وَاَوْسَطُہٗ مَغْفِرَۃٌ اور ظاہر ہے کہ گناہوں کا معاف ہو جانا یہی دوزخ سے بچنا ہے تو اس پر متفرع ہو کر یہ ارشاد بھی صحیح ہوا کہ[۲] وَاٰخِرُہٗ عِتْقٌ مِّنَ النِّیْرَانِ

خداتعالیٰ کی بارگاہ میں نہ تو کسی کو آنے کی ممانعت اور نہ وہاں کسی کے آنے نہ آنے کی پروا ہے

وہ بارگاہ عجیب بارگاہ ہے یہ حالت ہے کہ ؎

---

[۱] اور اس کا درمیان بخشش ہے۔

[۲] اور اس کا آخر آگ سے آزادی ہے۔

باز آ باز آ ہر آنچہ ہستی باز آ[1] — گر کافر و گبر و بت پرستی باز آ

ایں درگہ ما درگہ نومیدی نیست[2] — صد بار اگر توبہ شکستی باز آ

اور جس طرح وہاں ہر وقت باب رحمت کشادہ ہے کہ کسی کو آنے کی ممانعت اور روک ٹوک نہیں اسی طرح وہاں کسی کے آنے نہ آنے کی پرواہ بھی نہیں ؎

ہر کہ خواہد گو بیا و ہر کہ خواہد گو برو[3]

دار و گیر و حاجب و درباں دریں درگاہ نیست

کہ جس کا جی چاہے جب چاہے چلا آوے اور جس حالت میں چاہے چلا آوے اور ہر کہ خواہد کے عموم سے یہ بات بھی سمجھ میں آگئی ہوگی کہ بعضے لوگ جو کسی ہندو یا عیسائی کو مسلمان کرنے کے قبل اول غسل دیا کرتے ہیں اس کی کوئی ضرورت نہیں ہر کہ کے عموم میں بے غسل والا بھی داخل ہے صاحبو اسلام میں آنے کے لیے نہ غسل کی ضرورت ہے نہ وضو کی بلکہ اگر استنجا بھی نہ کیا ہو تو اس کے انتظار کی بھی ضرورت نہیں پہلے مسلمان کرلو اس کے بعد

---

[1] باز آجاؤ باز آجاؤ جو کچھ تم ہو اس سے توبہ کرو باز آجاؤ اگر کافر آتش پرست بت پرست ہو تو بھی توبہ کرو باز آجاؤ [2] یہ ہماری بارگاہ ناامیدی کی بارگاہ نہیں ہے سو بار بھی اگر توبہ توڑ چکے ہو تو بھی باز آجاؤ [3] جو آنا چاہتا ہے تو کہہ دو آجاؤ جو جانا چاہے کہہ دو جاؤ پکڑ دھکڑ چوکیدار دربان اس بارگاہ میں نہیں ہیں۔ [4] جو چاہتا ہے کے مسلم وکافر کو عام ہونے سے

غسل وغیرہ دو اور ایک یہ بھی تو بات ہے کہ کسی کو کیا خبر ہے کہ چار منٹ[1] کے بعد زندہ رہے گا یا ختم ہو چکے گا۔ بعض لوگ تو یہاں تک غضب کرتے ہیں کہ مسلمان کرنے کے بعد مسہل دینے کی تجویز کرتے ہیں میں کہتا ہوں کہ اگر طہارت حاصل کرنے کے لئے یہی شرط ہے کہ حالتِ کفر کی کوئی چیز باقی نہ رہے تو فصد بھی لینا چاہیئے بلکہ گوشت پوست بھی نیا ہونا چاہیئے الحاصل یہ سب لغو قیود ہیں اس دربار میں جس کا جی چاہے جب چاہے اور جس حالت میں بھی ہو چلا آوے صاحبو! کیا آج کوئی بادشاہ ہے کہ وہ ناپاکوں[2] کو بھی اپنے دربار میں حاضری کی اجازت دے۔ اسی کو عارف شیرازی کہتے ہیں

ہر[3] کہ خواہد گو بیا و ہر کہ خواہد گو برو
دار و گیر و حاجب و درباں دریں درگاہ نیست

غرض جس طرح یہاں کسی کو آنے کی ممانعت اور روک ٹوک نہیں اسی طرح اگر نکل جاوے۔ تو رکھنے کی بھی کوئی تمنا نہیں کرتا کسی کو اس طرح سر نہیں چڑھایا گیا کہ وہ ذرا بھی ناز کر سکے۔

---

[1] اگر مر گیا اور کفر کی وجہ سے عذاب میں گیا تو تمہارے دیر لگانے سے عذاب میں گیا تم سبب بنے۔ [2] گمرہوں کو [3] جو آنا چاہتا ہے تو کہدو آجاؤ جو جانا چاہے کہدو جاؤ۔ پکڑ دھکڑ چوکیدار اور دربان اس بارگاہ میں نہیں ہیں۔

خدا تعالیٰ کی بخشش سے کسی حال میں مایوس نہ ہونا چاہئے گو کتنے ہی گناہ ہوں توبہ کرنے سے سب معاف ہو جاتے ہیں

تم اگر گناہوں کی پوٹ لے کر بھی حاضر ہو گئے تو ادھر کے ایک چھینٹے میں سب دھل جائیں گے اس کی ایسی مثال ہے سہ

گر جہاں پر برف گردد سر بسر ۔ تاب خود بگداز دش از یک نظر

یعنی اگر سارا عالم بھی برف سے پٹ جاوے تو عالمتاب آفتاب کے نکلتے ہی سب پانی ہو کر بہہ جاوے گی۔ اسی طرح اگر سارا عالم بھی گناہ سے بھر جاوے تو ادھر کی ایک نگاہ کافی ہے سبحان اللہ۔ کس پاکیزہ مثال سے کتنے بڑے مسئلہ کو بآسانی حل کر دیا واقعی بات یہ ہے کہ اہل اللہ پر چونکہ حقائق کا انکشاف ہوتا ہے اس لئے ان سے زیادہ بہتر کوئی بھی مثال پیش نہیں کر سکتا سچ یہ ہے کہ یہی لوگ سچے فلسفی ہیں چنانچہ افلاطون کو کسی نے خواب میں دیکھا اور اس سے ایک ایک حکیم کا نام لے کر پوچھا کہ یہ کیسے تھے۔ سب کی نسبت یہی کہتا رہا کہ کچھ نہیں پھر اس سے حضرت بایزید حضرت شیخ شہاب الدین سہروردی کی نسبت پوچھا تو اس

نے کہا۔[1] اُولٰٓئِکَ ھُمُ الفَلَاسِفَۃُ حَقًّا۔

جب خدا تعالیٰ کی عنایت ہوتی ہے تو ایک لمحہ میں کام بن جاتا ہے مگر چونکہ وہ لمحہ متعین نہیں ہے اس لئے ہمیشہ اس کا متلاشی رہنا چاہیئے

حق تعالیٰ کے جیسے الطاف و کرم ہیں ان پر نظر کر کے تو ایک دم کی غفلت بھی جائز نہیں۔ ایک بزرگ فرماتے ہیں ؎

یک چشم زدن غافل ازاں شاہ نباشی[2] شاید کہ نگاہے کند آگاہ نباشی

یعنی جس کا کام بنا ہے ایک ہی لمحہ میں بن گیا ہے۔ ایک ہی لمحہ کی عنایت کافی ہوگئی ہے۔ مگر بہت دن تک اس لئے لگے رہتے ہیں کہ وہ لمحہ معین نہیں یعنی یہ خبر نہیں کہ وہ ایک لمحہ کس وقت

---

[1] حق یہ ہے کہ فلسفہ والے یہی لوگ ہیں [2] ایک بار آنکھ جھپکنے کی مقدار بھی اس بادشاہ سے غافل نہ ہو شاید وہ توجہ کرے اور تم کو غفلت میں خبر تک نہ ہو۔

ہوگا جس میں نگاہ اکسیر اثر پڑ جاوے گی۔ اسی کو مولینا بھی ایک تفسیر یہ فرماتے ہیں ؎

صحبت نیکاں اگر یک ساعت است
بہتر از صد سالہ زہد و طاعت است
یکؔ زمانہ صحبتت با اولیاء
بہتر از صد سالہ طاعت بے ریا

بعض نے اسکی یہی توجیہ کی ہے کہ تمام اوقات میں سے ایک وقت ایسا ہوتا ہے چنانچہ شاہ بھیک صاحب اور شاہ ابوالمعالی صاحب کا قصہ ہے کہ شاہ ابوالمعالی صاحب کسی بات پر شاہ بھیک صاحب سے خفا ہو گئے اور علیحدہ کر دیا۔ یہ جنگلوں میں روتے پھرتے تھے۔ برسات آئی حضرت کا مکان گر پڑا۔ بی بی صاحبہ نے فرمایا کہ ایک آدمی گنوار سا ان کاموں کے لائق تھا۔ اسی کو آپ نے نکال دیا۔ حضرت نے فرمایا کہ میں نے ہی تو نکالا ہے تم بلالو میں تم کو تو منع نہیں کرتا۔ بی بی صاحبہ نے بلا بھیجا۔ ان کی عید آ گئی۔ آ موجود ہوئے۔ بی بی صاحبہ نے مکان کی حالت دکھائی۔ وہ فوراً جنگل پہنچے

۱؎ نیکوں کی صحبت، اگر ایک ذرا سے وقت بھی ہو، سینکڑوں سال کے زہد و طاعت سے افضل ہے کہ بعض دفعہ اس سے دل میں ایسی لگن لگ جاتی ہے کہ سب کام درست ہو جاتے ہیں ۲؎ ایک زمانہ تمہارا اولیاء اللہ کی صحبت میں رہنا سو سال کی بے ریا کی عبادت سے بھی افضل ہو جاتا ہے۔

اور لکڑی مٹی جمع کر کے مرمت میں لگ گئے تھے کہ مکان کی تکمیل کر کے چھت پر مٹی کوٹ رہے تھے کہ حضرت گھر میں تشریف لائے اور کھانا کھانے بیٹھ گئے اور چھت پر سے مٹی کوٹنے کی آواز سن کر رحمت کا جوش ہوا اور باہر صحن میں تشریف لا کر ان کو ٹکڑا روٹی کا دکھلایا کہ لو وہ وہیں سے کود پڑے۔ حضرت نے لقمہ ان کے منہ میں دیا اور سینہ سے لگایا۔ بس سارا کام ایک لمحہ میں بن گیا اس لئے کہتا ہوں کہ ایک لمحہ[۱] بھی غفلت مت کرو۔

گناہوں کی معافی کے لئے صرف استغفار کافی نہیں بلکہ اس کے ساتھ ادائے حقوق بھی ضروری ہے

اگر مغفرت چاہتے ہو تو خدا تعالیٰ سے اپنے گناہوں کی معافی چاہو اور معاف کرانے کے یہ معنی نہیں کہ صرف تسبیح ہاتھ میں لے کر استغفر اللہ[۲] استغفر اللہ پڑھتے رہو بلکہ یہ بھی کرو اور اس

---

۱ جب اولیاء اللہ کی طرف سے یہ کام نبھایا ہے تو حق تعالیٰ کی طرف سے کیوں نہ ہوگا ۲ میں اللہ تعالیٰ سے سب گناہوں کی بخشش مانگتا ہوں معنے ذہن میں رکھ کر پڑھا جائے تو زیادہ

کے ساتھ اہلِ حقوق کے حقوق بھی ادا کرتے رہو۔ اگر کسی شخص کے پاس دوسرے کی زمین دبی ہو یا موروثی ہو۔[1] اس کو چھوڑ دو۔ کسی کے ذمہ کسی کا قرض ہو اسکو ادا کر دو۔ اور سبکدوش ہو جاؤ۔ لوگ اپنے جی میں کہتے ہوں گے کہ موروثی زمیں چھوڑنے کی بے ڈھب کہی پھر ہم کھادیں گے کہاں سے لیکن صاحبو غور کرو اگر کسی شخص کے موروثی کھیتوں میں کو ریل نکل جاوے اور اس کے سب کھیت ریل میں آجاویں اور معاوضہ ملے زمیندار کو تو یہ کیا کرے گا اور کہاں سے کھادے[2] گا۔

اس کی شکایت کہ آج کل لوگوں کے دلوں میں اسلام کے احکام کی قدر نہیں اور اس کی وجہ

افسوس ہے کہ ظاہری حکومت کے سامنے تو کان نہ ہلایا جائے اور خداوندی حکم کے سامنے چون وچرا کی گنجائش ہو۔ اصل یہ ہے کہ آپ لوگوں کے دلوں میں اسلام اور اس کے احکام

---

[1] وہ زمین یا مکان جو دوسرے سے کرایہ پر یا بٹائی پر لی ہو وہ چھڑانا چاہیئے۔ مگر نہ چھوڑیں یہ موروثی ہے حرام ہے [2] کھانے کو دینے والے تو اللہ تعالے ہیں وہ کوئی اور سلسلہ دیں گے ان سے ناامید نہ ہو۔

کی چونکہ بلا مشقت مل گئے ہیں باوجود سرتاسر نافع ہونے کے کہ بڑا نفع رضائے حق ہے قدر و قیمت نہیں ہے خوب کہا ہے ؎

آے گرانجاں خوار دیدستی مرا ۔ زانکہ بس ارزاں خریدستی مرا

ارشادِ خداوندی ہے ۲ مَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖ سبب یہ ہے کہ اسلام کے ملنے میں کچھ زر تو خرچ نہیں ہوا کہ اس کی قدر ہوتی ؎

۳ ہر کہ او ارزاں خرد ارزاں دہد ۔ گوہرِ طفلے بقرصِ ناں دہد

حکام کی خوشنودی تو بڑی بڑی کوششوں سے زر و جواہر خرچ کرنے سے حاصل ہوتی ہے بخلاف رضا خداوندی کے لیکن حقیقت میں یہ سخت رذالت ہے کیونکہ جسقدر زیادہ احسان کسی کا ہوتا ہے اُسی قدر زیادہ اس کے سامنے پگھلا کرتے ہیں اور شرماتے ہیں نہ کہ اُلٹی شرارت اور نافرمانی پر کمر بستہ ہو جاویں لہذا اپنی اس معمولی تکلیف اور مشقت کی کچھ پرواہ نہ کرنی چاہیئے۔

لے اے عزت دار تو نے مجھ کو بے عزت دیکھا ہے محض اس وجہ سے کہ تو نے مجھے بہت سستا خرید لیا ہے ۲ے لوگوں نے اللہ تعالے کی عزت ان کی قدر کے موافق نہیں کی۔

۳ے جو شخص سستا خریدتا ہے سستا ہی دے دیتا ہے ایک بچہ موتی کو روٹی کی ٹکیہ کے بدلے دے ڈالتا ہے۔

ادائے حقوق کی ضرورت اور اس کا موجبِ[1] آسائش ہونا ایک شبہ کا جواب

اگر کسی کے پاس موروثی زمین ہے تو اس کو چاہیئے کہ فوراً اس کو چھوڑ دے بلکہ میں کہتا ہوں کہ اگر یہ شخص موروثی زمین کو چھوڑ دے تو وہ زیادہ آرام و آسائش میں رہے گا کیونکہ ایسا کرنے سے وہ ایمان دار اور خوش معاملہ مشہور ہو جاوے گا۔ پھر زمیندار کوشش کرے گا کہ اسکی زمین اس کی کاشت میں رہے اگر اب بھی لوگوں کی سمجھ میں نہ آوے اور نہ مانیں تو وہ جانیں۔ دو شخص ضلع سہارنپور کے میرے پاس آئے ہیں اتفاق سے موضع بھینسانی گیا ہوا تھا۔ وہ میرے پاس وہیں پہنچے کہ ہم کو مرید کر لو میں نے پوچھا کہ تمہارے پاس موروثی زمین تو نہیں معلوم ہوا کہ ہے میں نے کہا اس کو چھوڑ دو کہنے لگے کہ پہلے مرید کر لو پھر چھوڑ دیں گے۔ میں نے کہا کہ پہلے چھوڑ آؤ جب مرید کر دوں گا یہ سنکر چھوڑ کر آنے کا وعدہ کر گئے اور آج تک واپس نہیں آئے۔ ایک گاؤں کے لوگ مدت سے مجھے بلا رہے ہیں لیکن اس لئے جانے کی نوبت نہیں آئی

---

[1] آرام و راحت کا سبب

کہ وہاں سب کے پاس موروثی زمینیں ہیں بس وہ میرے اس سوال کا جواب نہیں دے سکتے کہ مجھ کو روٹی کہاں سے کھلاؤ گے حدیث میں آیا ہے کہ اگر ایک درہم حرام اور نو حلال کے ہوں تو اس ایک کے مل جانے سے اس کی سب عبادت غارت ہے اور غضب یہ ہے کہ لوگ حرام کمائی بیوی بچوں کے لئے کماتے ہیں یہ بھی نہیں کہ اپنے لئے ایسا کریں لیکن اسی سے کوئی یہ تجویز نہ کرتے کہ جب ہمارے پاس حلال کی آمدنی نہیں ہے اور حرام کی آمدنی کھانے سے روزہ قبول نہیں ہوتا تو روزہ رکھنے سے کیا فائدہ۔ کیونکہ اب تو صرف ایک گناہ ہے کہ حرام مال سے پیٹ بھرا اور اگر روزہ نہ رکھو گے تو ایک دوسرے اس سے بھی زیادہ سخت گناہ میں ماخوذ ہوگے۔

احکامِ شرعیہ کے حِکَم[1] اور اسرار کس طرح معلوم ہو سکتے ہیں

اسرار و حکم میں غور و فکر کرنا مناسب نہیں کیونکہ جو کچھ فکر سے حاصل ہوگا تمہارے ذہن کا اختراع[2] ہوگا نہ کہ حکمت کیونکہ

---

[1] مصلحتیں اور راز

[2] ایجاد اور گھڑنا

فکرِ وصول الی الحقائق کا طریق بھی نہیں ہے

فہم و خاطر تیز کردن نیست راہ[۱] — جز شکستہ می نگیرد فضل شاہ

پس ہم کو بالکل شکستگی اختیار کرنی چاہئے اس سے البتہ ہم پر فیضان ہو سکتا ہے خوب کہا ہے

ہر کجا پستی است آب آنجا رود[۲] — ہر کجا مشکل جواب آنجا رود

ہر کجا دردے دوا آنجا رود[۳] — ہر کجا رنجے شفا آنجا رود

تو جب تم بالکل اپنے کو سپرد کر دو گے تو خدا تعالےٰ خود بخود ان علوم کا القاء تمہارے قلب میں کرینگے اور وہ حالت ہو گی۔

بینی اندر خود علوم انبیا[۴] — بے کتاب بے معید اوستنا

---

۱ سوچ تو حقیقتوں تک پہنچنے کا طریقہ بھی نہیں حقیقت بتانے والا خود ہی بتائے تو صحیح حقیقتیں معلوم ہو سکتی ہیں ۲ سمجھ اور دل کو تیز کرنے کا یہ راستہ نہیں ہے بلکہ حق تعالےٰ کا فضل تو شکستہ کو ہی لیتا ہے ۳ جہاں پستی ہوتی ہے وہیں پانی جاتا ہے جہاں مشکل پیش آتی ہے حل کرنے والا جواب بھی وہیں پہنچتا ہے ۴ جس جگہ درد ہوتا ہے دوا اسی جگہ لگتی ہے جہاں مرض ہوتا ہے شفا بھی وہیں جاتی ہے۔

۵ کہ ہر وقت ذکر فکر و عبادت میں لگو گے

۶ اپنے اندر حضرات انبیاء کے سے علوم دیکھو گے بغیر کسی کتاب کے بغیر تکراری کے بغیر اُستاد کے۔

مصالح پر احکام کا مدار نہیں ورنہ طالب عمل کو اس کی اجازت ہے کہ مصالح کی تفتیش کرے

حکمت کا رائے سے سمجھنا اور اس پر بناء حکم کرنا یہ کافی نہیں مدار اصلی تشریع ہی پر ہے[1] اگرچہ اس کی حکمت بالکل نہ معلوم ہو البتہ بعد میں تشریع کے بھروسہ کچھ حکمت بھی سمجھ میں آسکتی ہے باقی حکمت کے سمجھنے پر حکم کا ماننا موقوف نہیں ہماری تو وہ حالت ہونی چاہیئے ؎

زبان[2] تازہ کردن باقرار تو ۔۔۔ نینگیختن علت از کار تو

اور ہمارا وہ مذہب ہے جیسا حضرت استاذی علیہ الرحمۃ کا ارشاد ہے کہ ہر درویشے[3] کہ چون وچرا کند و ہر طالب علمے کہ چون و

---

[1] شریعت میں حکم آجانے پر ہی مدار ہے [2] زبان کو آپ کے اقرار سے تازہ کرنا ہے نہ کہ آپ کے کاموں کی وجہیں گھڑنا [3] جو صوفی چون وچرا یعنی یہ کیسے ہے اور کیوں ہے کرے اور جو طالب علم چون وچرا نہ کرے دونوں کو چراگاہ میں بھیج دینا چاہیئے کہ وہ آدمی کے درجہ سے نکل کر حیوانوں میں مل گئے۔

چرا انگند ہر دور اور چرا گاہ باید فرستاد۔ طالب علم کو تو چون وچرا کا حق اس لئے ہے کہ وہ طالب فن ہوتا ہے لیکن طالب عمل کو اس کی اجازت ہرگز نہیں۔

مصالح کی تفتیش کا مفسدۂ عظیمہ

اور حکمت کی تلاش میں ایک مفسدہ یہ بھی ہوتا ہے کہ عوام یوں سمجھ جاتے ہیں کہ یہی مصالح بناء حکم ہیں اور جب کسی حکم میں ان کو مصالح نظر نہیں آتے تو اس حکم کے من اللہ ہونے میں ان کو شبہ ہونے لگتا ہے یا اگر کوئی مصلحت اپنے ذہن سے مخترع کی اور اس کو مدار حکمت سمجھا اور وہ مخدوش ہوگئی تو اس کے انہدام سے حکمت کے انہدام کا شبہ ہوجاتا ہے۔ ہاں اگر مصلحت خود بخود بلا تلاش ذہن میں آجاوے تو اس کے بیان میں مضائقہ نہیں ہے اور وہ بھی ظناً غرض جب اُدھر سے بولنے کا اشارہ پاوے جیسا بلا فکر کوئی وارد قلب میں آجاوے زبان کھولے ورنہ لب بستہ رہے کہ نطق وسکوت میں اُسی کا تابع رہنا چاہئے خوب کہا ہے ؎

ؔ بڑی خرابی ؔ اللہ کی طرف سے ؔ گھڑلی ایجاد کرلی۔

ؔ گرجانے سے حکمت کے گرجانے بلکہ نہ ہونے اور حکم کے نہ رہنے کا شبہ ہوتا ہے ؔ یقینی نہیں محض گمان کے درجہ میں

بگوشِ گل چہ سخن گفتہ[1] کہ خندان است
بعندلیب چہ فرمودہ کہ نالان ست

محفل میلاد کی تحقیق اور اس کا بیان کہ جناب نبوی کے ساتھ دنیا کے بادشاہوں کا سا برتاؤ بے ادبی ہے

آج کل ہمارے چند اخوانِ زماں[2] نے ایک عظیم الشان مفسدہ کی بنیاد ہندوستان میں ڈالی ہے یعنی یوم ولادت جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو یوم عید بنانے کی تجویز کی ہے اور یہ خیال ان کے ذہن میں دوسری اقوام کے طرزِ عمل کو جو اپنے اکابر دین کے ساتھ کرتے ہیں دیکھ کر پیدا ہوا ہے لیکن اس قاعدہ مذکورہ کی بنا پر لوگوں کو سمجھ لینا چاہیئے کہ یوم ولادت کی خوشی دنیاوی خوشی نہیں ہے یہ مذہبی خوشی ہے پس اسکے کے تعین طریق کے لئے وحی کی اجازت

---

[1] پھول کے کان میں آپ نے کیا بات کہہ دی ہے کہ ہنس رہا ہے اور بلبل کو کیا فرما دیا ہے کہ وہ رو رہی ہے۔ [2] اس زمانہ کے بھائیوں نے کیونکہ یہ حضور صحابہ تابعین کے زمانہ میں نہ تھا۔

ضروری ہے اور اگر کوئی یہ کہے کہ ہم بطور سالگرہ کے دنیوی طرز پر کرتے ہیں تو میں یہ کہوں گا کہ ایسا کرنے والے سخت بے ادبی اور گستاخی جناب نبوی میں کر رہے ہیں۔ صاحبو کیا حضور کو اس جلال و عظمت میں دنیا کے بادشاہوں پر جن کو حضور سے کچھ بھی نسبت نہیں ہے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ اس فرحت کے لئے بس ایک دنیوی رذیل سامان اسی طرح کا کرتے ہو جیسا ان سلاطین کے لئے کیا کرتے ہو۔ ع چہ نسبت خاک را با عالم پاک[1]

مجھے اس موقع پر ایک بزرگ کی حکایت یاد آگئی کہ وہ جنگل میں رہتے تھے۔ ایک کتیا پال رکھی تھی۔ اتفاق سے ایک مرتبہ کتیا نے بچے دئیے تو آپ نے تمام شہر کے معززین کو مدعو کیا لیکن ایک بزرگ شہر میں رہتے تھے ان کو نہیں بلایا ان بزرگ نے از راہ بے تکلفی دوستانہ شکایت کی تو ان بزرگ نے جواب میں کہلا کر بھیجا کہ حضرت میرے یہاں کتیا نے بچے دئے تھے اس کی خوشی میں سگان دنیا کی دعوت کر دی سخت گستاخی تھی کہ میں ان دنیا کے کتوں کے ساتھ آپ کو مدعو کرتا جس روز میرے اولاد ہو گی اور مجھ کو خوشی ہو گی اس دن آپ کو مدعو کر دوں گا اور ان کتوں میں سے

---

[1] کیا نسبت خاک کو یعنی شایان دنیا کو عالم پاک یعنی حضور سے غور کیجئے اگر صدر مملکت کی تعظیم اس طرح کی جائے جس طرح پولیس کے سپاہی کی کی جاتی ہے تو یہ صدر کی تعظیم ہو گی یا توہین۔

ایک کو بھی نہ پوچھونگا۔ جب اولیاء کے ساتھ دنیا داروں کا سا برتاؤ بے ادبی ہے تو سید الانبیاء کے ساتھ دنیا داروں کا سا برتاؤ کیسے بے ادبی نہ ہوگی۔ اب اس کی دلیل سنئیے کہ یوم ولادت مذہبی خوشی ہے دنیوی خوشی نہیں ہے تو یہ سب کو معلوم ہے کہ دنیا کا اطلاق اس خطہ زمین پر زیادہ سے زیادہ چند فرسخ[1] اس کے متصل ہوا پر ہوتا ہے پس اگر کوئی دنیوی خوشی ہوگی تو اس کا اثر اسی خطہ زمین تک محدود رہے گا اس سے متجاوز نہ ہوگا اور ولادت حضور پُرنور کے دن نہ صرف زمین کے موجودات بلکہ ملائکہ عرش و کرسی اور باشندگان عالم بالا سب کے سب مسرور اور شادماں تھے۔ وجہ یہ بھی کہ حضور کی ولادت شریف کفر و ضلالت کی ماحی[2] اور توحید حق کی حامی تھی جس کی بدولت عالم کا قیام ہے کیونکہ قیامت اسی وقت قائم ہوگی۔ جب ایک شخص بھی دنیا میں خدا کا نام لینے والا نہ رہے گا اور قیامت قائم ہونے سے فرشتے بھی اکثر فنا ہو جاویں گے۔ پس آپ کا ظہور چونکہ سبب تھا تمام عالم کے بقا کا اس لئے تمام عالم میں یہ خوشی ہوئی۔ جب اس کا اثر دنیا سے متجاوز ہوگیا تو اس خوشی کو دنیوی خوشی نہیں کہہ سکتے۔ جب معلوم ہوا کہ یہ دنیوی خوشی نہیں بلکہ مذہبی خوشی ہے تو اس میں ضرور ہر طرح سے وحی کی احتیاج ہوگی

---

[1] تین میل کو ایک فرسخ کہتے ہیں [2] مٹانے والی

یعنی اس کے وجود[۱] میں بھی اور اس کی کیفیت میں بھی۔ اب مجوزین ہم کو دکھلائیں کہ کس وحی سے یوم ولادت کے یوم العید بنانے کا حکم معلوم ہوتا ہے اور کیا صورت اس کی بتلائی گئی ہے اگر کوئی [۲]قُلْ بِفَضْلِ اللّٰہِ سے استدلال کرے تو میں کہوں گا کہ صحابۂ کرام جو کہ حضور کی صحبت اٹھائے ہوئے تھے اور تمام عالم سے زیادہ کلام مجید کو سمجھتے تھے ان کی سمجھ میں یہ مسئلہ کیوں نہیں آیا بالخصوص جبکہ حضور پر نور صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت بھی ان کے رگ و ریشہ میں سرایت کی ہوئی تھی علیٰ ہذا تابعین جن میں بڑے بڑے مجتہد ہوئے ہیں ان کی نظر یہاں تک کیوں نہیں پہنچی۔ ہاں جن امور کے متعلق حضور سے اجازت ہے اس کو ضرور کرنا چاہیے مثلاً آپ نے اپنی ولادت کے دن روزہ رکھا اور فرمایا[۳]۔ ذٰلِكَ الْيَوْمُ الَّذِي وُلِدْتُ فِيهِ اس لئے ہم کو بھی اس دن روزہ رکھنا مستحب ہو سکتا ہے دوسرے پیر کے دن نامۂ اعمال حق تعالیٰ کے روبرو

---

۱ خود عید قرار دینے میں بھی اور اسکے طور طریقہ میں بھی ۲ آپ کہہ دیجئے کہ اللہ تعالیٰ کے فضل سے اور رحمت سے بس اسی سے خوشی کرو اور حضور کی ولادت فضل و رحمت ہے تو اول تو یہ غور طلب بات ہے کہ کیا یہ فضل و رحمت سال بھر میں صرف ایک دو دن کیلئے ہے یا ہر دن ہر گھڑی ہر آن پھر کیا ہر فضل و رحمت سے خوشی کا یہی شرعی طریقہ ہے۔ اگر صرف یہی ہے تو کیا جبکہ اور کسی وقت ایسا نہیں کیا جاتا تو اور کسی فضل و رحمت پر خوشی اور اس حکم کی تعمیل نہ ہوگی اور اگر کوئی ایسا طریقہ ہے جو سب میں پایا جا سکے دل زبان اعضا سے

باقی اگلے صفحہ پر

پیش ہوتے ہیں پس یہ مجموعہ دجہ ہوگی اس حکم کی اور اگر منفرداً بھی مانا جاوے تب بھی صحیح ہے لیکن صرف اسی قدر کی اجازت ہوگی جتنا کہ ثابت ہے +

بقیہ صفحہ ۲۷۶

ہر مروت کا ہے تو اس فضل و رحمت کی خوشی کرنے سے پابند یاں لگا کر کمی کیوں ہے اگر یہ کہا جائے کہ نہیں اسکی فرحت کا تو یہی طریقہ ہے : دوسروں کا دوسرا تو اول تو تجب دلیل ہے صحیح نہیں دوسرے اسلاف کی قرآن فہمی کے خلاف ہے اس لئے غلط ہے سے یہی وہ دن ہے جس میں میں پیدا کیا گیا ہوں۔ سے ولادت و بعثت کے ایک ایک اصرف ولادت یا صرف بعثت روزہ کی وجہ مانیں اگر یہ ہر ہر پیر کے دن کے لئے ہے سال بھر میں ایک دن کے لئے نہیں کہ سارے سال غفلت میں سوتے رہیں۔ ذرا خیال تو کیجئے کتنی نفسانیت کی بات ہے کہ جن کاموں میں نفس کو مشقت بھی گو وہ ثابت بھی وہ تو کرتے نہیں اور جن میں نفس کو مزہ و تفریح ہے گو وہ ثابت نہیں وہ اس کے بدلے گھڑ لئے کیا دین ایسا ہوتا ہے۔

بزرگوں کے عرس کا طریقہ محض لغو ہے مع دلیل اور اس کا بیان کہ موت بزرگوں کے لئے وصل محبوب ہے

اور جس طرح یوم ولادت کی خوشی کے اختراعات[1] باطل ہیں اسی طرح کسی کی وفات کی تاریخ کے کہ وہ دن بزرگوں کی خوشی کا دن ہے اختراعات بھی اور یہیں سے معلوم ہو گیا ہوگا کہ آج کل جو لوگوں نے بزرگوں کے عرس کا طریقہ اختراع کیا ہے یہ بھی محض لغو[2] اور تجاوز عن الحد[3] ہے۔ اصل حقیقت اس کی یہ تھی کہ عرس کے معنے لغت میں شادی کے ہیں اور حاصل شادی کا یہ ہے کہ محب کا محبوب سے وصل ہو پس چونکہ ان حضرات کی موت ان کے لئے وصل محبوب ہے اس لئے ان کے یوم وصال کو یوم العرس کہا جاتا ہے نیز ایک روایت میں یہ بھی آیا ہے کہ جب کسی مقبول بندہ کی وفات ہوتی ہے اور فرشتے اس کی قبر میں آکر سوال کرتے ہیں تو سوال وجواب کے بعد کہتے ہیں نَمْ کَنَوْمَۃِ الْعَرُوْسِ[4] تو وہ دن ان حضرات کے لئے یوم العرس ہوا

---

۱ گھڑی ہوئی بے اصل باتیں ۲ بیکار ۳ حد سے نکل جانا ۴ سو جاؤ دلہن کی طرح کا سونا

اسی کو ایک بزرگ خوب کہتے ہیں ؎

خوشا روزے و خرم روزگارے
کہ یارے برخورد از وصل یارے

وصل دنیوی اور اخروی کا فرق

اور گو وصل ان حضرات کو دنیا میں بھی ہوتا ہے تاہم اس وصل میں اور اُس وصل میں فرق ہے کہ یہاں بہ حجاب ہے اور وہاں بلا حجاب جیسا مولانا نے فرمایا ؎

گفت مکشوف و برہنہ گو کہ من … می نگنجم با صنم در پیرہن

اگرچہ خدا تعالےٰ جسم اور لوازم اور عوارض جسم سے پاک ہے لیکن یہ مثال کے لئے کہا جاتا ہے اور جیسا حضرت غوث پاک فرماتے ہیں ؎

بے حجابانہ درآ از در کاشانۂ ما
کہ کسے نیست بجز دردِ تو در خانۂ ما

۱؎ کتنا اچھا ہے وہ دن کیسا مبارک ہے وہ وقت کہ ایک دوست دوسرے دوست کی ملاقات کا پھل کھائے ۲؎ بولا وہ کھلا اور بے لباس کہاں ہے کیونکہ میں محبوب کے ساتھ کرتہ میں نہیں سما سکتا ۳؎ بے حجاب ہو کر میرے گھر کے دروازہ سے آجائیے کیونکہ آپ کے درد کے سوا ہمارے گھر میں اور کوئی نہیں ہے۔

یہ کیفیت تو وہاں کے وصال کی ہے اور دنیا میں بوجہ حجاب اور سیری نہ ہونے کے ان کی یہ حالت ہوتی ہے کہ ؎

دل آرام در بر دل آرام جو | لب از تشنگی خشک بر طرف جو
نگویم کہ بر آب قادر نیستند | کہ بر ساحل نیل مستسقی اند

اہل اللہ کو مرنے کی بڑی خوشی ہوتی ہے اور وہ اسکی تمنائیں کرتے ہیں

اور چونکہ مر کر ان کو یہ دولت نصیب ہوتی ہے اس لئے وہ اس کی تمنائیں کرتے ہیں اور شدتِ شوق میں یوں کہتے ہیں ؎

خرم آں روز کزیں منزل ویراں بروم
راحتِ جاں طلبم وز پئے جاناں بروم

اور ان حضرات کو چونکہ مرنے کی خوشی ہوتی ہے اس لئے اس میں نہایت مطمئن ہوتے ہیں۔ چنانچہ ایک نقشبندی بزرگ کی حکایت ہے

لہ دل کو آرام دینے والا تو بغل میں ہے مگر دل آرام ڈھونڈ رہا ہے دریا کے کنارہ پیاس سے ہونٹ خشک ہیں تلہ میں نہیں کہہ سکتا کہ پانی پر قدرت نہیں رکھتے۔ مگر دریائے نیل کے کنارہ استسقا کے سے بیمار ہیں کہ پیتے ہیں اور جی نہیں بھرتا تلہ میں تو اس دن خوش ہوں گا کہ اس اجڑے گھر سے جاؤں گا روح کا سکون چاہوں گا محبوب کیلئے حاضر ہوں گا۔

کہ انہوں نے وصیت کی تھی کہ جب میرا جنازہ لے چلو تو ایک شخص یہ اشعار سامنے ساتھ پڑھتا چلے ؎

مفلسانیم[1] آمدہ در کوئے تو | شیئاً للہ از جمال روئے تو
دست[2] بکشا جانب زنبیل ما | آفریں بر دست و بر بازوئے تو

کیوں صاحب کیا بے اطمینانی میں کسی کو ایسی فرمائشوں کی سوجھ سکتی ہے یہ غایت فرحت کا اثر تھا۔ حضرت سلطان نظام الدین اولیا قدس سرہ کی حکایت مشہور ہے کہ جب آپ کا انتقال ہو گیا اور جنازہ لے چلے ایک مرید نے شدتِ غم میں درد کے ساتھ یہ اشعار پڑھے۔

سرِّ[3] و سیمنا بصحرا میروی | سخت بے مہری کہ بے ما میروی
اے[4] تماشا گاہِ عالم روئے تو | تو کجا بہر تماشا میروی

لکھا ہے کہ ہاتھ کفن کے اندر بلند ہو گیا۔ صاحبو ایک ایسا شخص جس کی یہ حالت ہو کہ ع پا[5] بدست دگرے دست بدست دگرے

---

[1] ہم مفلس ہیں آپ کے کوچہ میں حاضر ہوئے ہیں اپنے روئے مبارک کے جلوے سے اللہ کے لئے کچھ عطا ہو۔ [2] ہماری زنبیل (جھولے) کی طرف کچھ ہاتھ بڑھا دیجئے آپ کے بازو اور ہاتھ پر آفریں اور شاباش ہو۔ [3] اے چاندی جیسے سرو تم تو جنگل میں جا رہے ہو بڑی بے وفائی ہے کہ ہمارے بغیر جا رہے ہو۔ [4] اے وہ ذات کہ سارے عالم کے تماشا (خوشی) کی جگہ تو تمہارا چہرہ ہے تم اب تماشا کے لئے کہاں جا رہے ہو۔ [5] پیر دوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ دوسرے کے ہاتھ میں۔ یعنی بعد فوت

کیا اس کو وجد ہو سکتا ہے معلوم ہوتا ہے کہ واقعی بے حد فرحت کا دن ہوتا ہے ایک دوسرے بزرگ انتقال کے وقت منتظرانہ و مشتاقانہ فرماتے ہیں ؎

وقت[1] آں آمد کہ من عریاں شوم — جسم بگذارم سراسر جاں شوم

اور یہ حالت کیوں نہ ہو جبکہ وہ جانتے ہیں۔ کہ اب پردۂ مادے ہیولانی جو کہ مانع دیدار تھے اُٹھتے ہیں اور کوئی گھڑی ہے کہ محبوب حقیقی کا دیدار نصیب ہوگا۔ صرف یہ نہیں کہ ان کو جنت کی یا حوروں کی ہوس ہوتی ہے حضرت ابن الفارض رح کا واقعہ لکھا ہے کہ جب ان کا انتقال ہونے لگا تو جنت منکشف ہوئی آپ نے اس طرف سے منہ پھیر لیا اور کہا۔

اِنْ[3] کَانَ مَنْزِلَتِیْ فِی الْحُبِّ عِنْدَکُمْ — مَا قَدْ رَأَیْتُ فَقَدْ ضَیَّعْتُ اَیَّامِیْ

کہ جان تو آپ کے لئے دے رہا ہوں جنت کو کیا کروں آخر جنت چھپ گئی اور فوراً تجلی ظاہر ہوئی اور جان بحق ہوئے ان کی بالکل وہی حالت ہو گئی۔ ؎

گر[4] بیاید ملک الموت کہ جانم ببرد — تا نہ بینم رخ تو روح رمیدن ندہم

---

[1] وقت وہ آگیا کہ میں لباس سے خالی ہو جاؤں جسم کو چھوڑ کر بالکل روح ہی روح ہو جاؤں [2] مادہ وجسم کے پردے [3] اگر محبت میں میری عزت آپ کے نزدیک یہی ہے جو میں نے دیکھی ہے تو میں نے تو عمر ہی کھو دی [4] اگر موت کا فرشتہ آوے کہ میری جان نکال لے جائے تو جبتک آپ کا چہرہ نہ دیکھ لوں گا روح کو بھاگنے نہ دوں گا۔

اکثر لوگ ان حالات کو سُنکر تعجب کریں گے لیکن یہ تعجب صرف اس وجہ سے ہے کہ خود اس سے محروم ہیں مگر ایسے لوگوں سے یہ کہا جاتا ہے کہ ع

تو مشو منکر کہ حق بس قادرست[1]

رجوع بجانب سرخی (بزرگوں کے عرس کا طریقہ محض لغو ہے مع دلیل)

غرض بزرگوں کے قول اور حدیث وغیرہ سے بھی یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ ان بزرگوں کی وفات کا دن یوم[2] العرس ہے لیکن لوگوں نے اس کے مفہوم و مصداق دونوں کو بالکل خراب کر دیا ہے۔ مصداق کی خرابیاں تو ظاہر ہیں کہ تمام شرک و بدعت اس عرس کا جزو ہو گئی باقی مفہوم کی خرابی یہ کہ اس لفظ کے لغوی معنے لے کر شادی کے لوازم بھی وہاں جمع کر دیئے چنانچہ اکثر جگہ رسم ہے کہ بزرگوں کی قبر پر مہندی چڑھاتے ہیں نوبت نقارہ رکھتے ہیں اسی طرح مزامیر وغیرہ سب لغو حرکتیں جمع کر رکھی ہیں۔ غریب مردہ پر تو بس چلتا نہیں قبر کی گت بنائی جاتی ہے۔ تو حقیقت میں وہ یوم العرس اس اعتبار سے

---

[1] تم انکار مت کرو کیونکہ اللہ تعالٰے تو بہت قدرت والے ہیں [2] شادی کا دن

ہے کہ جس کو ذکر کیا گیا کہ وہ ان بزرگوں کی خوشی[1] کا دن ہے اور یہ کوئی دنیوی خوشی نہیں ہے تو اس میں کوئی طریقہ مقرر کرنے کے لئے ضرورت وحی کی ہوگی اور وحی ہے نہیں بلکہ اس کے خلاف پر وحی ہے چنانچہ ظاہر ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں لَا تَتَّخِذُوْا قَبْرِیْ عِیْدًا کہ میری قبر کو عید نہ بنانا۔ عید میں تین چیزیں ضروری ہیں ایک اجتماع دوسرے تعیین وقت تیسری فرحت تو ممانعت کا خلاصہ یہ ہوا کہ میری قبر پر کسی یوم معین میں سامان فرحت کے ساتھ اجتماع نہ کرنا ہاں اگر خود بخود کسی وقت میں کسی غرض سے اجتماع ہو جاوے تو اور بات[2] ہے۔ دوسرے حضور کا یہاں سے تشریف لے جانا اگرچہ آپ کے لئے باعث سرور ہے لیکن ہمارے لئے تو باعث حزن[3] ہے اور حضور کی وفات سے جو ہم پر نعمت کامل فرمائی ہے جس کو میں نے نشر الطیب میں لکھا ہے وہ دوسرے اعتبار سے ہے پس جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر پر ایسا اجتماع جائز نہیں تو دوسروں کی قبر پر ایسا اجتماع کیونکر جائز ہوگا اور عجیب برکت ہے کہ آج تک حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر پر اجتماع کا کوئی دن معین نہیں ہوا بحمد اللہ اس مسئلہ کی تحقیق کافی ہو گئی۔

---

[1] اللہ سے ملنے کی خوشی کا۔ [2] جیسے حج کے زمانہ میں روز روز رہتا ہے۔

[3] جدائی کے رنج کا سبب ہے۔

بُری نظر اور بُری نیت کا مرض آج کل عام ہو رہا ہے

یَعۡلَمُ خَآئِنَةَ الۡاَعۡیُنِ وَمَا تُخۡفِی الصُّدُوۡرُ ترجمہ آیت شریفہ کا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ آنکھوں کی خیانت کو جانتے ہیں اور جس شے کو سینے چھپاتے ہیں اس کو بھی جانتے ہیں یہ ایک آیت ہے جس کے الفاظ تھوڑے ہیں اور معانی بہت ہیں اس میں اللہ تعالیٰ نے ایک امر قبیح پر مطلع فرمایا ہے اور علاوہ اطلاع کے اس میں زجر بھی ہے اس کو اس وقت اس لئے اختیار کیا ہے کہ جس مرض کا اس میں بیان ہے۔ آج کل اس میں بہت ابتلا ہے اور امراض میں سے وہی مرض متنبہ کرنے کے لئے لیا جاتا ہے جس میں ابتلا ہو۔

معصیت بھی مرض ہے

اور مرض سے یہاں مراد معصیت ہے گو لوگ اس کو مرض نہ سمجھیں کر تعجب ہوگا کہ اس کو مرض کیوں کہا گیا لیکن بعد بیان حقیقت مرض کے اس کی وجہ سمجھ میں آجا وے گی۔ مرض کی حقیقت ہے اعتدال سے مزاج کا خارج ہو جانا اور معصیت میں بھی قلب کا مزاج اعتدال سے خارج ہو جاتا ہے۔

معصیت[1] کا مرضِ جسمانی سے اشد ہونا اور اس کا بیان کہ موت تمام تکلیفوں سے چھڑا دیتی ہے

بلکہ یہ خروج عن الاعتدال[2] جو قلب کے متعلق ہے زیادہ مضر ہے اس لئے کہ بدنی مرض کا انجام بہت سے بہت یہ ہے کہ مر جاوے گا اور مرنے سے بعض اوقات ہوتا ہے کہ بہت سے جھگڑوں سے چھوٹ جاتا ہے کیونکہ جس قدر آلام[3] ہیں وہ اس بدن اور روح ہی کے تعلق[4] کی وجہ سے ہیں۔ دیکھئے مرضِ خدر یعنی سُن ہو جانے میں بدن کو اگر کاٹ ڈالیں تو کچھ بھی تکلیف محسوس نہیں ہوتی اور مفلوج کے فالج زدہ حصہ میں اگر سوئیاں بھی چبھوئیں تو کچھ بھی اثر نہیں ہوتا کیونکہ رُوح کا تعلق بدن سے ویسا نہیں رہتا باوجودیکہ اس حالت میں روح سے تعلق رہتا ہے گو وہ ضعیف سہی اور اس تعلق ہی کا اثر یہ ہے کہ وہ عضو گلتا سڑتا نہیں جیسے مُردوں کا بدن گل جاتا ہے اور جب کہ بالکل ہی روح کی مفارقت ہو جاوے اور یہ تعلق ضعیف

---

[1] گناہوں کے مرض کا جسم کے مرض سے سخت ہونا [2] دل روح کے مزاج کا درمیانی روش سے خارج ہونا [3] دنیا کی تکلیفیں
[4] ایسے تعلق سے جو زندگی میں ہوتا ہے اور بعد میں نہیں رہتا۔

بھی نہ رہے گا تو ظاہر ہے کہ بطریق اولیٰ تکلیف نہ ہوگی یعنی جو مفہوم تکلیف کا ہمارے نزدیک ہے اور جو معنے متبادر[1] الم کے ہیں وہ نہ ہوگی ؎

رُوح کو مفارقت جسم کے بعد جسم کو صدمہ دینے سے کس قسم کی تکلیف ہوتی ہے

ان دوسرے دلائل سے معلوم ہوا کہ رُوح کو بعد مفارقت جسم کچھ تاذّی ہوتی ہے جیسا کہ بعض نصوص میں ہے کہ مُردہ کی ہڈی توڑنا ویسا ہے جیسا زندہ کی ہڈی توڑنا جس سے ظاہراً معلوم ہوتا ہے کہ ایسے فعل سے رُوح کو الم ہوتا ہے مگر جس قسم کا الم رُوح کے تعلق مع الجسم[2] کی حالت میں ہڈی توڑنے سے رُوح کو ہوتا ہے۔ وہ الم نہیں ہوتا اس کو ایک مثال کے ضمن میں سمجھنا چاہیئے کہ مثلاً زید کے بدن کو اگر مارا جائے تو اس کو تکلیف ہوگی اور زید کی رضائی اُتار کر چولہے میں رکھ دی جاوے تب بھی تکلیف ہوگی مگر دونوں تکلیفیں جدا

---

[1] ذہن میں آنے والے یعنی جیسے عام چوٹ لگنے یا کٹنے سے ہوتی ہے۔ اور قبر کے عذابات تو معنوی ولطیف تعلق سے جو نظر نہیں آسکتا ہوتے ہیں اور سخت تکلیف والے تکلیف ظاہری [2] روح کے جسم سے پورے تعلق کی

جدا ہیں پس روح کے مفارق ہونے کے بعد روح کو ایسی ہی تکلیف ہوتی ہے جیسے رضائی جلانے سے زید کو ہوئی[1] اور اس تکلیف کی وجہ بھی وہی تعلق سابق ہے جو بدن کے ساتھ اس کو تھا وہ تعلق اس کو مستحضر ہوتا ہے اس لئے تکلیف ہوتی ہے۔

موت بڑے آرام کی چیز ہے اور اس پر ایک عجیب حکایت

خلاصہ یہ ہے کہ جب روح مفارق ہو جاتی ہے تو کوئی الم[2] نہیں رہتا اس وقت ایک لطیفہ یاد آیا ایک طبیب کی تعریف کی گئی کہ یہ بڑے اچھے حکیم ہیں ان کے علاج سے مرض ہی نہیں رہتا یعنی مریض ہی نہیں رہتا جو مرض رہے کیونکہ مرض نہ رہنے کی دو صورتیں ہیں یا تو مریض رہے اور تندرست ہو جاوے یا یہ کہ مریض

---

[1] مگر یہ تکلیفیں بھی سابق قسم کی ظاہری ہیں اور جو قبر کے عذاب کی تکلیف ہے وہ قسم ہی اور ہے وہ اول روح کو اور تابع ہو کر جسم کو ہے اور یہ اول جسم کو پھر تابع ہو کر روح کو تھی اب روح تابع نہیں رہی اس لیے دنیوی تکلیفوں کا یہ جانا ہے اسکی تفصیل حضرت کی کتاب المصالح العقلیہ میں ہے۔

[2] دنیا والی کوئی تکلیف نہیں رہتی۔

ہی چلد سے جیسے کسی انیونی کی ناک پر مکھی آ بیٹھتی اُس نے اُڑا
دیا وہ پھر آ بیٹھی جب کئی بار اُڑانے سے نہ گئی تو آپ نے چھری
لے کر ناک کاٹ ڈالی اور کہا وہ اڈا ہی نہیں رہا جس پر اب بیٹھے گی
خلاصہ یہ ہے کہ جب آدمی مرجاتا ہے نہ زکام رہتا ہے نہ کھانسی
نہ بخار نہ فکر نہ رنج سب بلائیں اور آلام دُور ہوجاتے ہیں بالکل
سکون ہوجاتا ہے سکون کے لفظ پر ایک شرعی لطیفہ یاد آیا اور
وہ حکیمانہ لطیفہ ہے اور وہ حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ اور ان کی
بی بی اُم سُلیم رضؓ کا قصّہ ہے۔ ان دونوں میاں بی بی کی حدیث میں
بڑی فضیلت آئی ہے۔ ایک مرتبہ ان کا ایک بچہ بیمار ہوگیا حضرت
ابوطلحہ رضؓ ہمیشہ آکر بی بی سے اس کا حال پوچھتے۔ ایک روز بچہ
انتقال کرگیا۔ حضرت ابوطلحہ رضؓ اُس وقت باہر تھے۔ بی بی نے یہ
خیال کیا کہ اگر میں اب اطلاع کردوں گی تو شب کا وقت ہے نہ
کھانا کھائیں گے نہ ان کو نیند آئے گی خواہ مخواہ بے چین ہوں گے
اس لئے مناسب ہے کہ اس وقت اطلاع ہی نہ کی جائے۔

حقیقت میں دین عجیب چیز ہے تمام عمر کی اصلاح کر دیتا ہے
حضرت ابوطلحہ رضؓ جب باہر سے تشریف لائے تو حسب عادت
دریافت فرمایا کہ بچہ کیسا ہے اب یہ وقت بڑے امتحان کا تھا
اگر سچ بولیں تو وہ مصلحت فوت ہوتی ہے اور جھوٹ میں شرعاً
گناہ حقیقت میں بڑی کشمکش کا وقت تھا لیکن دین فہم کو تیز

کم دیتا ہے چنانچہ من جانب اللہ ایک جواب اُن کو القا ہوا فرمایا کہ اب تو اس کو سکون ہے آرام ہے اس لئے کہ موت سے بڑھ کر کوئی سکون اور آرام نہیں ہے اس لئے کہ آرام و راحت میں دو صورتیں ہیں دفع[1] مضرت یا جلب منفعت دونوں حالتوں میں عرفاً آرام سے ہونا کہا جاتا ہے موت میں دونوں چیزیں موجود ہیں دفع مضرت بھی ہے دہو ظاہر[2] اور جلب منفعت یہ ہے کہ موت سے وصول[3] الی المحبوب الحقیقی ہوتا ہے۔ یہ خاص مسلمانوں کے لئے ہے ایک لطیفہ یاد آیا حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جب میرے باپ یعنی حضرت عباس رضی اللہ عنہ کا انتقال ہو گیا تو جیسا کہ ایک اعرابی نے مجھ کو تسلی دی ایسی کسی نے نہیں دی سچ یہ ہے کہ دیندار خواہ گاؤں کا ہو یا شہر کا اس کا فہم چونکہ دین کی وجہ سے درست ہو جاتا ہے اس لئے وہ حقائق امور کو خوب سمجھتا ہے وہ مضمون تسلی کا یہ ہے:

اِصْبِرْ نَكُنْ بِكَ صَابِرِيْنَ فَاِنَّمَا ۔۔۔ صَبْرُ الرَّعِيَّةِ بَعْدَ صَبْرِ الرَّاسِ
خَيْرٌ مِّنَ الْعَبَّاسِ اَجْرُكَ بَعْدَهٗ ۔۔۔ وَاللّٰهُ خَيْرٌ مِّنْكَ لِلْعَبَّاسِ

مطلب یہ ہے کہ آپ صبر کیجئے ہم بھی آپ کی وجہ سے صبر کریں گے

---

[1] تکلیف کا دور ہونا یا نفع حاصل کر لینا [2] اور یہ ظاہر ہے کہ دنیا کی ہر قسم کی تکلیف ختم ہو جاتی ہے [3] حقیقی محبوب سے جا ملنا

کیونکہ چھوٹوں کا صبر بڑوں کے صبر کے بعد ہوتا ہے اور اس واقعہ میں نہ تمہارا کچھ نقصان ہوا بلکہ نفع ہی ہے اور وہ نفع یہ ہے کہ تم کو ثواب ملا اور وہ ثواب تمہارے لئے حضرت عباسؓ سے بہتر ہے اور حضرت عباسؓ کا بھی کچھ نقصان نہیں ہوا اس لئے کہ وہ خدا تعالٰے سے مل گئے اور اللہ تعالے عباسؓ کے لئے تم سے بہتر ہے یعنی تمہارے پاس رہنے سے اللہ کے پاس رہنا بہتر ہے یہ عجیب مضمون ہے حقیقت میں موت ایسے ہی آرام کی چیز ہے حدیث میں آیا ہے کہ موت مومن کا تحفہ ہے اور انسان کی حالت یہ ہے کہ اس سے بھاگتا ہے وجہ اس کی یہ ہے کہ اُس عالم کو دیکھا نہیں موت ایک ریل ہے گاڑی کی طرح ہے جیسے گاڑی ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچا دیتی ہے اسی طرح موت اس عالم سے دار الآخرت میں پہنچا دیتی ہے جب گاڑی میں آدمی بیٹھا ہوتا ہے تو اس کو کچھ خبر نہیں ہوتی کہ میرے لئے وہاں کیا کیا طیار ہو رہا ہے جب ریل سے اسٹیشن پر اُترے دیکھا تو وہاں طرح طرح کے سامان ہیں۔ ایک مخلوق استقبال کے لئے کھڑی ہے اقسام اقسام کی نعمتیں کھانے پینے کی موجود ہیں تو اُس وقت جانتا ہے کہ اللہ اکبر یہاں تو ہمارے لئے بڑا سامان ہے اور جہاں سے آیا تھا وہ سب اس کی نظر میں ہیچ معلوم ہوتا ہے بلکہ اُس کا خیال تک بھی نہیں آتا اسی طرح اس دنیا کا حال ہے کہ اس وقت یہاں کچھ خبر نہیں لیکن جب یہاں سے

رحلت ہوگی تو انشاء اللہ تعالےٰ وہاں دیکھ لیں گے کہ یہاں ہمارے لئے کیا نعمتیں ہیں اور بزرگوں نے بصرؔ سے یا بصیرت سے دیکھا ہے اس لئے ان کی نظر میں دنیا کی کوئی وقعت نہیں ہے دنیا کو عالم آخرت کے ساتھ وہ نسبت ہے جو ماں کے رحم کو اس دنیا کے ساتھ ہے جیسے بچہ اپنی رضامندی سے دنیا میں نہیں آتا۔ اسی طرح آدمی وہاں جانا نہیں چاہتا اور جیسے بچہ ماں کے رحم ہی کو سمجھتا ہے کہ تمام جہان یہی ہے اور آگے اس کی نظر ہی نہیں جاتی اور جب ماں کے رحم سے نکلتا ہے تو حقیقت معلوم ہوتی ہے اسی طرح ہم لوگ جب یہاں سے جاویں گے تو اس دنیا کی حقیقت معلوم ہوگی۔ بہرحال موت ہر طرح سکونؔ اور آرام کی شے ہے۔ اسی واسطے حضرت ام سلیم رضی اللہ عنہا نے فرمایا۔ اب اس کو سکون ہے۔ اس کے بعد حضرت ابو طلحہ رضی اللہ عنہ نے کھانا کھایا اور پھر ان کو بی بی کے پاس جانے کی رغبت ہوئی اور بی بی کا حال یہ کہ ظاہر میں تو جو کچھ میاں کہتے تھے ان کی رضامندی کے واسطے سب کچھ کر رہی تھیں مگر اندر جو کچھ تھا وہ حق تعالیٰ کو معلوم تھا غرض میاں تو فارغ ہو کر سو رہے اور بی بی کو کیا نیند آئی ہوگی صبح

لہ آنکھ کی بینائی سے یا دل کی بینائی سے ۔ ؎ دنیا کی تکلیفوں اور جھگڑوں سے اور عمل نیک اور توبہ صحیح کے بعد تو بالکل ہی سکون در سکون ہے۔

کے وقت جب حضرت ابو طلحہؓ نماز پڑھ کر تشریف لائے تو بی بی نے پوچھا کہ بھلا ایک بات تو بتلاؤ اگر کوئی شخص کسی کے پاس کوئی امانت رکھ دے تو جب وہ اپنی امانت مانگے تو ہنسی خوشی دینا چاہیئے یا ناک منہ چڑھانا چاہیئے انہوں نے فرمایا کہ نہیں ہنسی خوشی دینا چاہیئے کہا تو اللہ تعالےٰ نے اپنی امانت لے لی۔ اب تم صبر کرو میاں ناراض بھی ہوئے کہ رات تم نے خبر نہ کی فرمایا کہ کیا نفع تھا تم پریشان ہوتے مجھے اس پر یہ قصہ یاد آیا تھا کہ انہوں نے موت کا نام سکون رکھا۔

رجوع بجانب سرخی (معصیت کا مرض جسمانی سے اشد ہونا الخ)

حاصل یہ کہ امراضِ بدنیہ کا انتہائی انجام موت ہے اور موت چونکہ قاطع تمام مصائب کی ہے اس لئے کچھ مضر نہیں مگر پھر بھی امراضِ بدنیہ کا اس قدر اہتمام ہوتا ہے جس کی کوئی حد نہیں بخلاف مرضِ روحانی کے جس کی حقیقت ہے حدودِ شرعیہ سے تجاوز کرنا اور اعتدال سے خارج ہوجانا کہ اس کا انجام وہ ہلاکت ہے جس کی نسبت فرمایا ہے لَا یَمُوْتُ فِیْھَا وَلَا یَحْیٰیؔ جس کا نام جہنم ہے۔

ؔ نہ اس میں مرے گا نہ زندہ رہے گا۔

اگر موت آجاتی تو سب قصے ختم ہو جاتے مگر وہاں موت بھی نہیں
پس جس مرض کا انجام صرف ہلاکت بدن ہے اس کو جب قابل اہتمام
سمجھتے ہیں تو جس مرض کا نتیجہ ہلاکت ابدی یا مدید[1] و شدید ہے کیا وہ
قابل اہتمام نہیں کیا اس کو مرض نہ کہا جاوے گا مگر حالت یہ ہے کہ
زکام ہو جاوے تو حکیم جی کے پیچھے پیچھے پھرتے ہیں اور صدہا روحانی
امراض میں مبتلا ہیں اور کچھ پرواہ نہیں ؛

فکر کون سی معصیت کی زیادہ ہونی چاہیئے

اور یوں تو ہر معصیت قابل اہتمام و فکر ہے لیکن خصوصیت
کے ساتھ وہ معصیت زیادہ قابل فکر ہے جس کو خفیف سمجھا جاوے
کسی نے بقراط سے پوچھا تھا کہ امراض میں کون سا زیادہ شدید
ہے کہا کہ جس مرض کو خفیف سمجھا جاوے وہ بہت اشد ہے اسی
طرح جس گناہ کو ہلکا سمجھا جاوے وہ بہت شدید ہے . اس لئے کہ
وہ لا علاج[2] ہے .

---

[1] دراز اور سخت ۱

[2] اس کے نزدیک لا علاج ہے نہ مرض سمجھا نہ علاج کی ضرورت ؛

بُری نظر اور بُری نیّت بہت سخت گُناہ ہے مگر لوگ اس کو ہلکا سمجھتے ہیں

منجملہ ایسے امراض کے ایک مرض یعنی گناہ وہ ہے جس کا آیت کریمہ میں ذکر ہے اور اسی واسطے اس کو اس وقت اختیار کیا گیا ہے چنانچہ فرماتے ہیں یَعۡلَمُ خَآئِنَةَ الۡاَعۡیُنِ الخ[1] خلاصہ یہ ہے کہ اللہ تعالےٰ نے اس آیت میں دو گناہوں کا ذکر فرمایا ہے آنکھوں کے گناہ کو اور دل کے گناہ کو اور یوں تو آنکھوں کے بہت سے گناہ ہیں لیکن یہاں ایک خاص گناہ کا ذکر ہے وہ کیا ہے بدنگاہی اسی طرح دل کے بہت گناہ ہیں لیکن یہاں بقرینۂ سباق[2] خاص گناہ کا ذکر ہے یعنی نیت بُری ہونا ان دونوں گناہوں کو لوگ گناہ تو سمجھتے ہیں لیکن اس میں شک نہیں ہے کہ جس درجہ اُن کی مضرت ہے اس قدر نہیں سمجھتے چنانچہ گناہ کا ادنےٰ اثر یہ ہونا چاہیئے کہ دل تو میلا ہو جائے مگر اس گناہ کے بعد دل بھی میلا نہیں ہوتا بہت خفیف سمجھتے ہیں کسی عورت کو دیکھ لیا کسی لڑکے کو گھور لیا اس کو ایسا سمجھتے ہیں جیسے کسی اچھے مکان کو دیکھ لیا یا کسی پھول کو دیکھ لیا۔

---

[1] اسے اللہ تعالیٰ جانتے ہیں آنکھ کی خیانت کو اور جس کو سینے چھپاتے ہیں۔ (یعنی دل کی باتوں کو) [2] پچھلے الفاظ کے معنی سے۔

بُری نظر اور بُرے خیال کا مرض عام ہے اور اُس کی وجہ

اور یہ گناہ وہ ہے کہ اس سے بُوڑھے بھی بچے ہوئے نہیں ہیں بدکاری سے تو بہت محفوظ ہیں کیونکہ اس کے لئے بڑے اہتمام کرنے پڑتے ہیں اول تو جس سے ایسا فعل کرے وہ راضی ہو اور روپیہ بھی پاس ہو اور نیز حیا و شرم مانع نہ ہو غرض اس کے لئے شرائط بہت ہیں اسی طرح موانع بھی بہت ہیں چنانچہ کہیں تو یہ امر مانع ہوتا ہے کہ اگر کسی کو اطلاع ہو گئی تو کیا ہو گا کسی کو خیال ہوتا ہے کہ کوئی بیماری نہ لگ جاوے کسی کے پاس روپیہ نہیں ہوتا کسی کو اس کی وضع مانع ہوتی ہے۔ چونکہ موانع زیادہ ہیں اس لئے کوئی شائستہ آدمی خصوصاً جو دیندار سمجھے جاتے ہیں اس میں بہت کم مُبتلا ہوتے ہیں۔ بخلاف آنکھوں کے گناہ کے کہ اس میں سامان کی ضرورت ہی نہیں کیونکہ نہ اس میں ضرورت روپیہ کی اور نہ اس میں بدنامی کیونکہ اس کی خبر تو اللہ ہی کو ہے کہ کیسی نیت ہے کسی کو گھور لیا اور مولوی صاحب مولوی صاحب رہتے ہیں اور قاری صاحب قاری صاحب رہتے ہیں نہ اُس فعل سے ان کی مولویت میں فرق آتا ہے اور نہ قاری صاحب کے قاری ہونے میں دھبہ لگتا ہے اور گناہوں کی خبر تو اوروں کو بھی

ہوتی ہے۔ مگر اس کی اطلاع کسی کو نہیں ہوتی معصیت کرتے ہیں اور نیک نام رہتے ہیں لڑکوں کو گھورتے ہیں اور لوگ سمجھتے ہیں کہ ان کو بچوں سے بڑی محبت ہے جبکہ آنکھوں کے گناہ میں اطلاع نہیں ہوتی تو دل کے گناہ میں تو کیسے ہو سکتی ہے۔

بزرگوں کی پردہ پوشی اور اس کا بیان کہ بدنگاہی سے آنکھ بے نور ہو جاتی ہے

اور جن کو اطلاع ہوتی ہے وہ حضرات ایسے متحمل اور ظرف والے ہیں کہ کسی کو خبر نہیں کرتے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی خدمت میں ایک شخص آیا اور وہ کسی کو بری نگاہ سے دیکھ کر آیا تھا تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے خطاب خاص سے تو اس کو کچھ نہ فرمایا لیکن یہ فرمایا مَا بَالُ اَقْوَامٍ يَتَرَشَّحُ الزِّنَا مِنْ اَعْيُنِهِمْ یعنی لوگوں کا کیا حال ہے کہ ان کی آنکھوں سے زنا ٹپکتا ہے تو یہ عنوان ایسا ہے کہ اس میں رسوائی کچھ نہیں لیکن جو کرنے والا ہے وہ سمجھ جائے گا کہ مجھ سے فرما رہے ہیں اہل کشف نے لکھا ہے کہ بدنگاہی سے آنکھوں میں ایک ایسی ظلمت ہو جاتی ہے کہ جس کو تھوڑی سی بصیرت ہو وہ پہچان لے گا کہ اس شخص کی نگاہ پاک نہیں ہے اگر دو شخص ایسے ملیئے جاویں کہ عمر میں حسن و جمال میں اور سرا امر میں وہ برابر ہوں فرق

اُن میں صرف اس قدر ہو کہ ایک فاجر ہو دوسرا متقی ہو جب چاہیے دیکھ لو متقی کی آنکھ میں رونق اور دل فریبی ہوگی اور فاسق کی آنکھ میں ایک قسم کی ظلمت اور بے رونقی ہوگی لیکن اہل کشف خصوصیت سے کسی کو کہتے نہیں بلکہ عیب پوشی کرتے ہیں۔

حکایت۔ اس پر مجھے مولانا شاہ عبدالقادر صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی حکایت یاد آئی شاہ صاحب مسجد میں بیٹھ کر حدیث کا درس دیا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ حسب معمول حدیث کا درس ہو رہا تھا کہ ایک طالب علم وقت سے دیر کر کے سبق کے لئے آئے حضرت شاہ کو منکشف ہو گیا کہ یہ جنبی ہے غسل نہیں کیا۔ وہ طالب علم معقولی تھے معقولی ایسے ہی لاپرواہ ہوتے ہیں شاہ صاحب نے مسجد سے باہر ہی روک دیا اور فرمایا کہ آج تو طبیعت سُست ہے جمنا پر چل کر نہائیں گے۔ سب لُنگیاں لے کر چلو سب لُنگیاں لے کر چلے سب نے غسل کیا اور وہاں سے آکر فرمایا کہ ناغہ مت کرو کچھ پڑھ لو وہ طالب علم ندامت سے پانی پانی ہو گیا اہل اللہ کی یہ شان ہوتی ہے کیسے لطیف انداز سے اُس کو امر بالمعروف فرمایا۔

شیخ سے اپنا کوئی عیب نہ چھپانا چاہیئے

اور جب بزرگوں کی شان معلوم ہو گئی کہ وہ کسی کو رسوا نہیں

کرتے تو اب مستفیدین کو بھی چاہئے کہ ایسے شیوخ سے اپنے عیب کو نہ چھپایا کریں اس لئے کہ عیب ظاہر نہ کرنا دو وجہ سے ہوتا ہے یا تو خوف ہوتا ہے کہ یہ ہم کو حقیر سمجھیں گے۔ سو ان حضرات میں نہ تو یہ بات ہے کہ کسی کو حقیر سمجھیں اس لئے کہ یہ حضرات سوائے اپنے نفس کے کسی کو حقیر نہیں سمجھتے اور یا یہ خوف ہوتا ہے کہ کسی کو اطلاع کر دیں گے۔ سو نہ ان حضرات میں یہ بات ہے اس لئے ان سے صاف کہہ دینا چاہئے مگر یہ اظہار معالجہ کے لئے ہے نہ کہ بلا ضرورت کیونکہ بلا ضرورت گناہ کو ظاہر کرنا بھی گناہ ہے اور بضرورت ظاہر کرنے کے حق میں حضرت عارف شیرازیؒ فرماتے ہیں۔

چنداں[1] کہ گفتیم غم با طبیباں ۔۔۔ درماں نکردند مسکیں غریباں
ما[2] حال دل را با یار گفتیم ۔۔۔ نتواں نہفتن درد از حبیباں

---

[1] بہت بہت بار ہم نے طبیبوں سے اپنا غم کہا مگر وہ غریب مسکین علاج ہی نہ کر سکے۔

[2] ہم نے دل کا حال آخر دوستوں سے کہہ دیا دوستوں سے درد کو چھپایا بھی نہیں جا سکتا۔

بدنگاہی کے عام ہونے کے وجوہ اور اس کا بیان کہ گناہوں کی بنیاد کب سے پڑتی ہے

غرض چونکہ وہ لوگ کسی کو فضیحت[1] نہیں کرتے اور جو فضیحت کرنے والے ہیں اُن کو اطلاع نہیں ہوتی اس لئے یہ گناہ بدنگاہی کا اکثر چھپا ہی رہتا ہے اس لئے لوگ بے دھڑک اس کو کرتے ہیں پھر زنا و دیگر معاصی مثل سرقہ[2] وغیرہ میں تو ضرورت اس کی بھی ہے کہ قوت و طاقت ہو اس میں اسکی بھی ضرورت نہیں اس لئے بوڑھے بھی اس میں مبتلا ہیں۔ دیکھئے بوڑھا اگر عاشق ہو جاوے اور قابو بھی چل جاوے تو کچھ نہیں کر سکتا اس لئے کہ وہ قوت ہی نہیں ہے مگر آنکھوں کے سینکنے میں تو اس کی بھی ضرورت نہیں خواہ لب گور ہی ہو جاویں۔ مجھ سے ایک بوڑھے آدمی ملے اور بہت متقی تھے انہوں نے اپنی حالت بیان کی کہ میں لڑکوں کو بُری نظر سے دیکھنے میں مبتلا ہوں۔ ایک اور بوڑھے تھے وہ عورتوں کے گھورنے میں مبتلا تھے اور یہ مرض اول جوانی میں پیدا ہو جاتا ہے بلکہ سب گناہوں کی یہی شان ہے کہ اول جوانی میں تقاضے کی وجہ

---

[1] بزرگ رسوا نہیں کرتے [2] چوری

سے کیا جاتا ہے پھر وہ مرض اور روگ لگ جاتا ہے اور لب گور تک کیا جاتا ہے جیسے حقہ کہ اول کسی مرض کی وجہ سے پینا شروع کیا تھا مگر پھر یہ مرض لگ جاتا ہے اور شغل ہو جاتا ہے لیکن جوان اور بوڑھے میں فرق یہ ہے کہ جوان آدمی تو معالجہ کے لئے کسی سے کہہ بھی دیتا ہے اور بوڑھا آدمی شرم کی وجہ سے کسی سے کہتا بھی نہیں پس اس کے مخفی رہنے اور خفیف ہونے کی وجہ سے اس میں کثرت سے ابتلا واقع ہے اسی واسطے فرماتے ہیں۔ يَعْلَمُ[1] خَائِنَةَ الْأَعْيُنِ وَمَا تُخْفِي الصُّدُورُ۔ يَعْلَمُ[2] کا لفظ دال ہے کہ اور لوگ اس سے واقف نہیں ہیں ہم ہی واقف ہیں، مطلب یہ ہے کہ تم جو یہ سمجھتے ہو کہ ہمارے اس گناہ کی کسی کو خبر نہیں یہ صحیح نہیں ایسے کو خبر ہے کہ جس کو خبر ہو جانا غضب ہے اس لئے کہ اس کو تم پر پوری قدرت ہے۔

---

[1] اللہ تعالیٰ جانتے ہیں آنکھوں کی خیانت کو اور ان چیزوں کو جن کو سینے چھپاتے ہیں یعنی دل کی باتوں کو۔

[2] جانتا ہے کا لفظ بتا رہا ہے۔

بعض طبائع کو سزا کا خوف مانع ہوتا ہے جرم سے

اور بعض طبائع کو جرم پر اطلاع کا خوف مانع

ہوتا ہے بدنگاہی پر ایسی وعید کی گئی ہے جو

دونوں مذاق والوں کے لئے زاجر[1] ہے

اور اس گناہ کو ذکر فرما کر اس کی سزا بیان نہیں فرمائی بخلاف دیگر معاصی کے کہ اُن کی سزا ساتھ ساتھ بیان فرما دی ہے اس میں ایک نکتہ ہے وہ یہ کہ طبائع ہم لوگوں کی مختلف ہیں۔ بعض طبائع تو ایسی ہوتی ہیں کہ ان کو سزا ہونا مانع اور زاجر ہوتا ہے وہ تو وہ لوگ ہیں جو بے حیا و بے شرم ہیں کہ جوتوں سے ڈرتے ہیں اور بغیر جوتیوں کے خواہ کسی کو خبر ہو جاوے ان کو کچھ باک نہیں اور بعض طبائع ایسی ہوتی ہیں کہ سزا کی اگر اطلاع ہو جاوے تو رکاوٹ کم ہوتی ہے لیکن اس سے وہ گڑ جاتے ہیں کہ فلاں کو خبر ہو جاوے گی بالخصوص جبکہ یہ معلوم ہو جاوے کہ ہمارا یہ جرم معاف

---

[1] ڈانٹنے والی ہے۔

کبھی ہو جاوے گا تو اور کبھی زیادہ عرق عرق ہو جاتے ہیں۔ کیا خوب کہا ہے ؎

تصدق اپنے خدا کے جاؤں یہ پیار آتا ہے مجھ کو انشا
اِدھر سے ایسے گناہ پیہم اُدھر سے وہ دمبدم عنایت

اسی بنا پر ایک آیت کی تفسیر یاد آگئی وہ یہ کہ غزوہ اُحد کے قصہ میں بعض صحابہ رضی اللہ عنہم سے جو حضور کے حکم میں کچھ خطا واقع ہوئی تھی وہ یہ کہ جس ناکہ پر حضور نے ثابت اور قائم رہنے کا امر فرمایا تھا بوجہ خطائے اجتہادی کے اس پر قائم نہ رہے اس کے بارہ میں ارشاد ہے اِذْ تُصْعِدُوْنَ وَلَا تَلْوٗنَ عَلٰٓی اَحَدٍ وَّالرَّسُوْلُ یَدْعُوْکُمْ فِیْٓ اُخْرٰىکُمْ فَاَثَابَکُمْ غَمًّا بِغَمٍّ لِّکَیْلَا تَحْزَنُوْا عَلٰی مَا فَاتَکُمْ وَلَا مَآ اَصَابَکُمْ وَاللّٰهُ خَبِیْرٌ بِمَا تَعْمَلُوْنَ یعنی اللہ تعالٰی نے تم کو ایک غم دیا بسبب اس کے ہمارے رسول کو تم نے غم دیا اور غرض اس غم دینے کی یہ فرمائی کہ تم لوگ غمگین نہ

---

۱ شرم سے پسینہ پسینہ ۲ جب تم چڑھے جارہے تھے اور کسی پر متوجہ نہ ہوتے تھے اور ہمارے رسول تم کو پچھلی جماعتوں میں سے پکار رہے تھے تو تم کو پہنچا غم ایک غم کے بدلہ میں تاکہ تم غمگین نہ ہو ان غنیمتوں پر جو تم سے فوت ہو گئیں اور ان تکلیفوں پر جو تم کو پہنچیں اور اللہ تعالٰی خبر رکھتے ہیں اس کی جو تم کرتے ہو۔

ہو تو بظاہر یہ فہم میں نہیں آتا۔ اس لئے کہ غم تو اس لئے دیا جاتا ہے
تاکہ حزن ہو نہ اس لئے کہ غم نہ ہو اسی واسطے مفسرین نے لکھا ہے
کہ یہ لا زائد ہے مطلب یہی ہے کہ غم اس لئے دیا کہ تم کو حزن
ہو لیکن الحمد للہ میری سمجھ میں اسکی تفسیر ایسی آئی ہے کہ اس تقدیر
پہ لا زائد ماننے کی ضرورت نہیں ہے اور معنی بے تکلف درست
ہیں وہ یہ کہ حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم حق تعالےٰ سے نہایت
شرماتے تھے جب اُن سے یہ خطا واقع ہوئی تو ان کا جی چاہتا ہے
کہ ہم کو سزا اس کی دنیا میں مل جائے تو ہماری طبیعت صاف ہو
جاوے اور اپنے مالک حقیقی سے سرخرو ہو جائیں اگر سزا نہ ہوتی
تو ساری عمر رنجیدہ رہتے اور یہ غم ان کے نزدیک نہایت جانکاہ و
جاں فرسا تھا۔ اس بنا پہ فرماتے ہیں کہ ہم نے تم کو اس خطا کی یہ
سزا دے دی تاکہ تم کو غم نہ ہو غرض کہ دو قسم کے لوگ ہوتے ہیں
ایک تو وہ جو سزا کا نام سنکر رکتے ہیں اور ایک وہ جو صرف اطلاع
کی خبر دینے سے شرماتے ہیں اور اس کام کے قریب نہیں جاتے جو
بے حیا تھے وہ تو یوں رکے کہ یَعِظُکُمْ میں اشارہ سزا کی طرف بھی
ہے چنانچہ مفسرین ایسے مقام پر فَیُجَازِیْکُمْ بِہٖ فرماتے ہیں اور

لہ یکیلا اور دلا میں جو لا ہے جس کے معنی یوں چاہئیں تاکہ تم غمگین ہو تو اب یہ اشکال ہوا اور لا
کو زائد کہنے میں یہ معنی ہونگے تاکہ تم غمگین ہو اب وہ اشکال نہیں رہتا ۲ہ کیونکہ خبر رکھنا علم ہونا ہے
کیونکہ جب علم ہوگا اسکا نتیجہ سزا ہی ہوگا اس لئے حضرات مفسرین کہتے ہیں کہ مراد یہ ہے کہ تم کو اسکی
سزا بھی دیں گے کیونکہ علم اور نتیجہ دونوں مراد ہیں جب جانتے ہیں تو تم کو اسکی سزا بھی دیں گے ۔

دوسرے مذاق والے اس لئے رُکے کہ شرم سے گڑ گئے کہ اللہ اکبر وہ جانتے ہیں بہرحال یہ دونوں مذاق والوں کے لئے وعید ہے۔

لوگوں کو بدنگاہی سے بچنے کا اہتمام نہ ہونا اور اس کا بیان کہ بدنگاہی کے متعلق کیا کیا دھوکے ہوتے ہیں

اس تمام تر تقریر سے معلوم ہوگیا ہوگا کہ یہ مرض نہایت اہتمام کے قابل ہے اب ہم کو اپنی حالت دیکھنا چاہیئے کہ ہمارے اندر اس معصیت سے بچنے کا کتنا اہتمام ہے میں دیکھتا ہوں کہ شاید ہزار میں ایک اس سے بچا ہوا ہو ورنہ ابتلائے عام ہے اس کو نہایت درجہ خفیف سمجھتے ہیں جو جوان ہیں ان کو تو اس کا احساس ہوتا ہے اور جن کی قوت شہویہ ضعیف ہوگئی ہے ان کو احساس بھی نہیں ہوتا وہ سمجھتے ہیں کہ ہم کو تو شہوت ہی نہیں اس لئے کچھ حرج نہیں ہے سوان کو مرض کا پتہ بھی نہیں لگتا اور بعضوں کو اور دھوکہ ہوتا ہے وہ یہ کہ

لہ وہ ضعیف کو نہ ہونا قرار دے لیتے ہیں یہ دھوکہ ہے جس میں نفس نے مبتلا کر دیا ہے۔

شیطان بہکاتا ہے کہ جیسے کسی پھول اچھے کپڑے اچھے مکان وغیرہ کو دیکھنے کو دل چاہتا ہے ایسے ہی اچھی صورت دیکھنے کو بھی دل چاہتا ہے سو یہ بالکل دھوکہ ہے یاد رکھو کہ رغبت کے مختلف انواع ہیں جیسی رغبت پھول کی طرف ہے ویسی انسان کی طرف نہیں۔ اچھے کپڑے کو دیکھ کر کبھی جی نہیں چاہتا کہ اس کو گلے لگالوں چمٹالوں۔ انسان کی طرف ایسی ہی رغبت[1] ہوتی ہے ایک دھوکہ اور ہوتا ہے وہ یہ کہ بعضے یہ سمجھتے ہیں جیسے اپنے بیٹے کو دیکھ کر جی چاہتا ہے کہ گلے لگالوں اسی طرح دوسرے کے بچہ کو دیکھ کر بھی ہمارا ایسی جی چاہتا ہے۔ صاحبو کھلی ہوئی بات ہے اپنے سیانے بچہ اور دوسرے کے سیانے لڑکے میں بڑا فرق ہے۔ اپنے لڑکے کو گلے لگانا چمٹانا اور طرح کا ہے۔ اس میں شہوت کی آمیزش ہرگز نہیں اور دوسرے کے لڑکے کی طرف اور قسم کا میلان ہے کہ اس میں گلے لگانے سے بھی آگے بڑھنے کو بعض کا جی چاہتا ہے۔ محبوب کی جدائی میں اور طرح کا رنج ہوتا ہے اور اپنے لڑکے کی جدائی میں اور قسم کا۔

---

[1] اس لئے یہ اور قسم کا ہے جس کا نام شہوت ہے۔ شیطان سے دھوکہ نہ کھائیے۔

بدنگاہی کیسی مضر چیز ہے اور اس کا بیان کہ امردوں کی مخالطت عورتوں کی مخالطت سے بھی زیادہ مہلک ہے

اور لڑکوں کی رغبت تو اور بھی سم قاتل ہے نصوص میں تو اس کی حرمت ہے ہمارے بزرگوں نے بھی جو اس کے آثار لکھے ہیں۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ بڑی سخت بلا ہے ایک بزرگ مطلق نظر کے لئے فرماتے ہیں اَلنَّظْرَۃُ سَھْمٌ مِنْ سِھَامِ اِبْلِیْسَ یعنی نگاہ ابلیس کے تیروں میں سے ایک تیر ہے۔ حضرت ابوالقاسم قشیری دونوں امر کی نسبت فرماتے ہیں کہ سالک کے لئے امردوں اور عورتوں کی مخالطت رہزن ہے ایک بزرگ کا خاص امردوں کے حق میں قول ہے کہ اللہ تعالےٰ جس کو اپنی بارگاہ سے مردود کرنا چاہتے ہیں اس کو لڑکوں کی محبت میں مبتلا کر دیتے ہیں غرض یہ نہایت مضرت کی چیز ہے۔

لے بے داڑھی والے لڑکوں سے میل جول۔

بدنگاہی کا اور گناہوں سے اشد[1] ہونا اور اس کے متعلق ایک بڑا دھوکہ

اور دوسرے معاصی اور بدنگاہی کی معصیت میں ایک اور فرق ہے وہ یہ کہ صدور کے بعد سب گناہوں کا اثر ختم ہو جاتا ہے اور دل بھر جاتا ہے مگر بدنگاہی ایسی شے ہے کہ جب صادر ہوتی ہے اور زیادہ تقاضا ہوتا ہے کہ اور دیکھو۔ آدمی کھانا کھاتا ہے سیر ہو جاتا ہے پانی پیتا ہے پیاس بجھ جاتی ہے مگر یہ نظر ایسی بلا ہے کہ اس سے سیری نہیں ہوتی ہے اس حیثیت خاص سے یہ تمام گناہوں سے بڑھ کر ہے بعضے لوگ اس کو سمجھتے ہیں کہ اس سے خدا کا قرب ہوتا ہے اور بعض کہتے ہیں کہ ،، خدا کی قدرت دیکھتے ہیں مگر نرا شیطانی دھوکہ ہوتا ہے۔ شیخ شیرازی نے ایسے ہی لوگوں کے جواب میں ایک حکایت تحریر فرمائی ہے۔ فرماتے ہیں۔ ؎

[2] یکے صورتے دید صاحب جمال ❊ بگردیدش از شورش عشق حال

---

[1] بہت سخت [2] ایک شخص نے ایک جمال والی صورت دیکھ لی تو عشق کی شورش سے اس کا حال دگرگوں ہو گیا۔

۱ بر انداخت بیچارہ چنداں عرق	کہ شبنم بر آرد بہشتی ورق
۲ گذر کرد بقراط بر دے سوار	بپرسید کیں را چہ افتاد کار
۳ کسے گفتش ایں عابد پارساست	کہ ہرگز خطائے ز دستش نخاست
۴ بہر داشت خاطر فریبے دلش	فرو رفتہ پائے نظر در گلش
۵ نہ ایں نقش دل می رباید ز دست	دل آں می رباید کہ ایں نقش بست

بقراط جواب دیتا ہے

۱ نگارندہ را خود ہمیں نقش بود	کہ شوریدہ را دل بیغمار بود
۲ چرا طفل یک روزہ ہوشش نبرد	کہ در صنع دیدن چہ بالغ چہ خورد

---

۱ بیچارہ نے اس قدر عرق ریزی کی اور مصیبت اٹھائی ہے کہ شاید یہ شبنم بہشت کے پتے اگا دے نتیجہ ہنر نکل آئے مگر کہیں شبنم سے پھل پیدا ہوتے ہیں ۲ بقراط سوار ہونے کی حالت میں اس پیر کو گذر گیا تو پوچھا اس پر کیا افتاد پڑ گئی۔ ۳ کسی نے کہا کہ یہ ایسا نیک بخت عابد ہے کہ کبھی اس کے ہاتھ سے کوئی خطا ہی نہیں ظاہر ہوئی۔ ۴ کسی دل چھیننے والے نے اس کا دل اٹھا لیا اسکی نظر کے قدم اسکی دلدل میں پھنس گئے ۵ مگر خود یہ شکل دل کو اس کے ہاتھ سے نہیں لے جاتی ہے بلکہ دل کو وہ لے جاتا ہے جس نے یہ شکل بنائی ہے اسکا جلوہ نظر آتا ہے یہ اسی کا شیدا ہے ۱ کیا بنانے والے کی بس یہی ایک شکل بنائی ہوئی تھی کہ اس سر پھرے کا دل اس معشوق کے ذریعہ لے لیا ۲ کیوں ایک دن کے بچہ نے اسکے ہوش نہ اڑا دیئے کہ صناعی دیکھنے میں تو سب برابر ہیں بڑا ہو یا چھوٹا بلکہ چھوٹے ہی میں قدرت وصناعی زیادہ معلوم ہوتی ہے اگر در اصل یہی وجہ تھی تو ایک دن کے بچے

باقی صفحہ ۳۱۰

محقق[۱] ہماں بیند اندر ابل   کہ ور خوبرویانِ چین وچگل

اگر کوئی دعوے کرے کہ مجھ کو اونٹ اور انسان صاحب جمال دونوں برابر ہیں وہ کاذب ہے آدمی اپنی طبیعت کا خود اندازہ کر سکتا ہے اور یہ میلان جس کو عشق کہتے ہیں عشق نہیں ہے یہ شہوت ہے ایک صاحب فرماتے ہیں ؎

ایں[۲] نہ عشق است آنکہ در مردم بود
ایں فساد از خوردن گندم بود

یہ فساد روٹیوں کا ہے ایسے لوگوں کو چار روز تک روٹی نہ ملے اس کے بعد پوچھا جاوے کہ روٹی لاؤں یا لڑکا یہ کہے گا کہ لڑکا اپنی ایسی تیسی میں جائے روٹی لاؤ۔

بقیہ صفحہ ۳۰۹

ہے عشق ہوتا اس سے نہ ہوتا یہ تو نفس کی بد معاشی ہے اور غلط تاویل

[۱] محقق تو وہی بات اونٹ میں دیکھتا ہے جو چین وچگل کے حسینوں میں دیکھتا ہے کیونکہ قدرت کا جلوہ اُونٹ میں بھی ایسا ہی ہے۔

[۲] یہ عشق ہی نہیں جو آدمیوں میں ہوتا ہے یہ تو گندم کھانے کا نشا ہے۔ چند روز کھانے کو نہ ملے تو حقیقت معلوم ہو جائے۔

بزرگوں نے جو عشق مجازی کا حکم فرمایا ہے اس کا کیا مطلب ہے، اور اس کا بیان کہ عشق مجازی عشق حقیقی سے کس طرح تبدیل ہو جاتا ہے

بعض لوگ کہتے ہیں کہ ملا جامی نے تو عشق مجازی کا امر کیا ہے اور حکایت لکھی ہے کہ کسی بزرگ کے پاس کوئی طالب گیا تھا انہوں نے کہا کہ عاشق ہو کر آؤ اور آگے لکھتے ہیں ؎

متاب[1] از عشق رو گرچہ مجازی است ۔۔۔ کہ آں بہر حقیقت کارسازی است

اگر[2] اول الف با تا نخوانی ۔۔۔ ز قرآں حرف خواندن کے توانی

اس سے بعض نادانوں نے سمجھا کہ جب تک کسی رنڈی کسی لونڈے کو قبلہ[3] توجہ نہ بنایا جاوے اس وقت تک عشق حقیقی میسر نہ ہوگا بڑی غلطی اور سخت کم فہمی ہے میں اس کا مطلب عرض

---

[1] عشق سے منہ نہ پھیرو اگرچہ عشق مجازی ہی ہو کیونکہ وہ عشق حقیقی کا کام بنا دینے والی چیز ہے [2] اگر شروع میں الف با تا نہیں پڑھو گے تو قرآن مجید کے حروف کب پڑھ سکو گے۔ مجازی نہ ہوگا تو حقیقی تک کیسے پہنچو گے [3] توجہ کا مرکز

کرتا ہوں بات یہ ہے کہ اصلی مقصود طالب کا تو یہ ہے کہ جملہ تعلقات قطع کر کے خدا تعالےٰ کی طرف توجہ ہو تو اس کے دو جزء ہیں تعلقات مخلوق سے قطع کرنا اس کو تو اصطلاح میں فصل کہتے ہیں اور دوسری طرف تعلق پیدا ہونا اس کو وصل کہتے ہیں۔ اور یہ تعلقات ہی فاصل وحاجب بن رہے ہیں اگر یہ درمیان سے اُٹھ جاویں تو وصل ہی وصل ہے شیخ فرماتے ہیں[۱]

تعلق[۱] حجاب ست وبے حاصلی چو پیوند ہا بگسلی واصلی

پس معلوم ہوا کہ مقصود انقطاع عما سوی اللہ ہے جب یہ ہو جاوے تو قصہ سہل ہے اور اس انقطاع کی تحصیل کے لئے بزرگوں نے مختلف معالجے اور تدبیریں فرمائی ہیں مقصود ایک ہی ہے صرف طریق مختلف ہیں ان میں سے ایک طریق تو یہ ہے کہ جس جس مخلوق سے تعلق ہو اور جو جو مرض ہو اس کو قلب سے ایک ایک کر کے زائل کر دیا جائے چنانچہ متقدمین کا یہی طریق تھا لیکن اس طریق کے اندر سخت مشقت تھی اس لئے کہ مثلاً کسی شخص کو دس چیزوں سے تعلق ہے مکان سے باغ سے اولاد سے اور دس ہی

---

[۱] مخلوق سے تعلقات [۲] اللہ تعالےٰ تک پہنچنے میں یہ مخلوق کے تعلقات ہی حجاب ہیں اور بے حاصل کام ہے، جب ان تعلقات کو توڑ ڈالو گے واصل ہو جاؤ گے [۳] اللہ تعالےٰ کے ماسوا سے بے تعلق ہو جانا۔

اس کو مرض ہیں کینہ، حسد، تکبر وغیرہ تو سب کا بالتفصیل علیحدہ علیحدہ معالجہ کیا جاوے اس کے لئے عمر نوح چاہیئے اور بیخ کنی ان امراض کی نہ ہوگی اس مشقت کو دیکھ کر بالہام حق پچھلے بزرگوں نے ایک طریقہ ایجاد کیا ہے۔ جیسے طبیب مشفق کی شان ہوتی ہے کہ مریض اگر کڑوی دوا سے ناک منہ چڑھاتا ہے تو وہ اس کو کسی اچھی تدبیر سے کھلا دیتا ہے یا بدل دیتا ہے ایسا ہی انہوں نے دیکھا کہ مثلاً ایک شخص کو ایک ہزار چیزوں سے تعلق ہے تو اگر ایک ایک چیز سے تعلق چھڑا دیا جاوے تو بہت مدت صرف ہوگی کوئی تدبیر ایسی ہونا چاہیئے کہ ایک دم سے سب کا خاتمہ ہو جائے۔ جیسے کسی مکان میں کوڑا بہت ہو تو اس کی صفائی کا ایک طریق تو یہ ہے کہ ایک ایک تنکا لیا اور پھینک دیا۔ اسی طرح سب تنکے اور کوڑا مکان سے باہر پھینک دیا جاوے۔ اس میں تو بڑا وقت صرف ہوگا۔ اور ایک طریق یہ ہے کہ جھاڑو لے کر تمام تنکوں کو ایک جگہ جمع کر کے پھینک دیا تو ایسے ہی یہاں بھی کوئی جھاڑو ہونا چاہیئے کہ سب تعلقات کو سمیٹ کر ایک جگہ کر دیوے پھر اس ایک کا ازالہ کر دیا جاوے۔ چنانچہ ان کی سمجھ میں آیا کہ عشق ایک ایسی شے ہے کہ سب چیزوں کو پھونک کر خود ہی رہ جاتا ہے چنانچہ اگر کوئی کسی وغیرہ پر عاشق ہو جاتا ہے تو ماں بیوی بچے باغ مکان .... حتیٰ کہ اپنی جان تک اس کے واسطے ضائع کر دیتا ہے۔ ایک رئیس کو بیلوں کا عشق تھا

ہزار ہا روپیہ اس میں ضائع کر دیا۔ ہمارے اُستاد حضرت مولانا فتح محمد صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کو کتابوں کا شوق تھا۔ خود نہ دیکھتے تھے مگر سینکڑوں کتابیں اس قسم کی خرید کر رکھ چھوڑیں غرض عشق وہ شے ہے کہ سوائے معشوق کے سب کو فنا کر دیتا ہے

عشق آں شعلہ است کو چوں بر فروخت ؎[1]
ہر چہ جز معشوق باشد جملہ سوخت

اس لئے ان بزرگوں نے تجویز کیا کہ طالب کے اندر عشق پیدا کرنا چاہیئے خواہ کسی شے کا ہو۔ اس واسطے وہ اول دریافت کرتے تھے کہ کسی پر عاشق بھی ہو پس معلوم ہوا اس کے لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ آدمی ہی کا عشق ہو بھینس کا عشق بھی اس کے لئے کافی ہے۔ اس لئے کہ مقصود تو یہ ہے کہ تمام اشیاء سے توجہ منصرف ہو کر ایک طرف ہو جاوے تا کہ پھر اس کا اِمالہ[2] عشق حقیقی کی طرف سہل ہو جاوے۔

حکایت: چنانچہ ایک بزرگ کی حکایت ہے کہ ایک شخص ان کے پاس مرید ہونے آیا انہوں نے دریافت فرمایا کہ کسی شے سے تم کو محبت بھی ہے اس نے کہا کہ مجھ کو اپنی بھینس سے محبت ہے

---

[1] عشق تو وہ شعلہ ہے کہ جب بھڑک اُٹھتا ہے تو معشوق کے سوا جو کچھ ہوتا سب کو پھونک دیتا ہے [2] مائل کر دینا عشق حقیقی سے بدل دینا۔

فرمایا کہ جاؤ چالیس روز تک بھینس کا تصور کرو۔

جو علاج شیخ ایک کے لئے تجویز کرے دوسرے کو بلا اجازت شیخ اس کا استعمال نہ کرنا چاہئے

لیکن خدا کے لئے اور لوگ اس کا وظیفہ نہ کریں اس لئے کہ ہر شخص کی حالت جُدا ہے کسی کے لئے کچھ مناسب ہے کسی کے لئے کچھ کبھی طبیب اور اس کے احمق شاگرد کا سا قصّہ نہ ہو جاوے وہ یہ ہے کہ ایک طبیب تھے وہ کسی مریض کو دیکھنے گئے۔ پہلے روز کی حالت سے اس روز کچھ تغیر پایا تو کہا تم نے نارنگی کھائی ہے۔ اس سے تم کو یہ تکلیف بڑھ گئی۔ اس نے کہا حضور بے شک نارنگی کھائی ہے جب وہاں سے فارغ ہو کر آئے تو راستے میں شاگرد صاحب نے پوچھا۔ حضرت آپ کو کیسے معلوم ہو گیا کہ اس نے نارنگی کھائی۔ حکیم صاحب نے فرمایا کہ بھائی بات یہ ہے کہ اس کے مزاج اور حالت کو دیکھ کر مجھ کو معلوم ہو گیا کہ کوئی بارد شے اس نے کھائی اور نارنگی کی تعیین اس سے ہوئی کہ اس کی چارپائی کے نیچے میں نے نارنگی کے چھلکے دیکھے شاگرد صاحب احمق تو تھے ہی جب پڑھ کر فارغ ہوئے تو کسی رئیس کو دیکھنے کے لئے بلائے گئے۔ ان کی چارپائی کے نیچے نمدہ پڑا تھا۔ فرماتے ہیں کہ بس معلوم ہو گیا آپ کو جو یہ مرض ہوا آپ نے

نمدہ کھایا ہے۔ حاضرین سب ہنس پڑے اور طبیب کا حمق سب پر واضح ہوگیا۔ تو خدا کے واسطے ایسا قیاس نہ کیجیو کہ آج سے نماز روزہ ذکر چھوڑ کر بھینس کا تصور باندھ کر بیٹھ جاؤ کہ یہ اس شخص کی خصوصیت ہے۔

رجوع بجانب مرشد (بزرگوں نے جو عشق مجازی کا حکم فرمایا ہے اس کا کیا مطلب ہے، الخ)

الحاصل اُن بزرگ نے فرمایا کہ جاؤ بھینس کے تصور کا چلّہ کیجیو اور چالیس روز کے بعد ہم کو خبر دو چنانچہ پانچ وقت نماز سے فارغ ہو جاتے اور ایک گوشہ میں بیٹھ کر اُس بھینس کا تصور کیا کرتے جب چالیس روز پورے ہو گئے تو پیر صاحب تشریف لائے اور فرمایا کہ بیٹا باہر آؤ کہتے ہیں کہ حضور باہر کیسے آؤں بھینس کے سینگ اٹکتے ہیں پیر نے شاباشی دی کہ مقصود حاصل ہو گیا۔ سب روگ جاتے رہے اب صرف بھینس رہ گئی اس کا نکل جانا سہل ہے۔ پس اس تقریر سے معلوم ہوا کہ اس کے لئے کسی عورت یا لڑکے کا عشق ضروری نہیں ہے بلکہ اس میں سخت خطرہ ہے کہ اس لونڈے یا عورت ہی میں نہ رہ جائے اور مقصود اصلی سے محروم رہے اس لئے قصداً ہرگز اس کو اختیار کرنا جائز نہیں ہے۔ ہاں اگر اضطراراً[۱]

---

[۱] بے اختیار

بلا قصد اس میں ابتلا کسی کو ہو جاوے تو وہ بھی وصول کے لئے خاص شرائط کے ساتھ بعض اوقات ذریعہ ہو جاتا ہے ؎

[1] عاشقی گرزیں سرو گرزاں سراست ۔ عاقبت مارا بداں شہ رہبر است

اس کی چند شرطیں ہیں اول تو یہ ہے کہ اس کے پاس نہ رہے نہ اس کو دیکھے نہ کلام کرے نہ اس کی آواز سُنے حتی الوسع دل سے بھی اس کو زائل کرنے کی فکر کرے۔ غرض حتی الامکان اس سے بچے اگرچہ اس طرح کرنا نفس کو بے حد شاق ہو گا لیکن ہمت نہ توڑے اور دل کو مضبوط کر کے اس پر عمل کرے چند روز کے بعد ایسا کرنے سے اس کے قلب میں ایک سوزش پیدا ہو گی اور نتیجہ اس کا یہ ہو گا کہ جاہ مال اولاد سب کی محبت جاتی رہے گی۔ اب اس میں مادہ تو محبت کا پیدا ہو چکا ہے شیخ کامل اس کو مائل الی الحق[2] کر دیگا اس صورت سے عشق مجازی وصول الی الحقیقۃ[3] کا ذریعہ بن جاویگا اور اگر اس محبوب سے جُدا نہ ہوا بلکہ اس سے اختلاط رکھا ہمنشیں ہوا تو پھر اسی بلا میں پھنسا رہے گا اور کسی دن بھی اس کو اس سے خلاصی نہ ہو گی۔ چنانچہ خود ملا جامی جن کے کلام سے عشق مجازی

---

[1] عاشق ہونا اگر اس خیال سے یا اُس خیال سے ہے آخر کار ہم کو اس بادشاہ کی طرف راہ دکھا دیتا ہے [2] حق تعالےٰ کی طرف جھکا دے گا۔

[3] حقیقت تک پہنچنے کا ذریعہ۔

کی تحصیل پر استدلال کیا جاتا ہے آگے چل کر فرماتے ہیں ؎

۱ ولے باید کہ در صورت نہ مانی — وزیں پل زود خود را بگذرانی

مولانا اسی عشق کے بارہ میں فرماتے ہیں ؎

۲ عشق با مردہ نباشد پائدار — عشق را با حی و با قیوم دار
۳ عشقہائے کز پئے رنگی بود — عشق نبود عاقبت ننگے بود

آگے فرماتے ہیں ؎

۴ غرق عشقے شو کہ غرق است اندریں — عشقہائے اولین و آخریں

پھر یہاں پر شبہ ہوتا ہے کہ ہم جیسوں کو عشق حقیقی تک رسائی کہاں ممکن ہے اس کا جواب دیتے ہیں ؎

۵ تو مگو ما را بداں شہ بار نیست
با کریماں کارہا دشوار نیست

---

۱ مگر لازم ہے کہ صورت میں ہی نہ رہ جاؤ۔ اور جلدی سے خود کو اس پل سے گذار دو۔ ۲ مرجانے والے کے ساتھ عشق کرنا پائیدار نہیں ہو سکتا عشق اسی ذات کے ساتھ رکھو جو زندہ اور سب کی کارپرداز ہے ۳ یہ جو عشق رنگ اور روپ کی وجہ سے ہوتے ہیں عشق ہی نہیں ہوتے انجام کار ننگ و عار ثابت ہوتے ہیں ۴ ایسے عشق میں غرق ہو جاؤ کہ جس میں سب اول و آخر لوگوں کے عشق غرق ہیں ۵ تم یوں نہ کہو کہ ہم کو اسکی بارگاہ میں رسائی نہیں کریموں پر کوئی کام دشوار نہیں ہوتا۔

یعنی ان کو کچھ مشکل نہیں تم کو مشکل نظر آتا ہے تم ذرا اس طرف متوجہ ہو کر تو دیکھو وہ خود تم کو اپنے قریب کرلیں گے۔ وہ دنیا کے محبوبوں کی طرح نہیں ہیں کہ عشاق مرجاتے ہیں وہ نخرے کرتے ہیں غرض اس مسئلہ کا یہ مطلب نہیں ہے کہ خود نظر بازی کریں مزے اڑائیں اور سمجھیں کہ ہم صوفی ہیں ہم کو سب حلال ہے اور یہ فعل ہمارا قرب کا واسطہ ہے استغفراللہ قرب سے اس کو کیا واسطہ یہ تو بہت بعید کر دینے والا ہے۔

بدنگاہی بہت سخت گناہ ہے

بلکہ غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ گناہ اللہ تعالیٰ کو بہت ناپسند ہے چنانچہ حدیث میں ہے[1] اَنَا غَیُوْرٌ وَّاللّٰہُ اَغْیَرُ مِنِّیْ وَمِنْ غَیْرَتِہٖ حَرَّمَ الْفَوَاحِشَ مَا ظَھَرَ مِنْھَا وَمَا بَطَنَ اور یہ سب فواحش ہیں آنکھ سے دیکھنا ہاتھ سے پکڑنا پاؤں سے چلنا کیونکہ ان سب کو شارع نے زنا ٹھہرایا ہے۔ اَلْعَیْنَانِ تَزْنِیَانِ وَزِنَاھُمَا النَّظَرُ وَالْاُذُنَانِ تَزْنِیَانِ وَزِنَاھُمَا الْاِسْتِمَاعُ وَاللِّسَانُ یَزْنِیْ وَزِنَاہُ النُّطْقُ وَالْیَدَانِ تَزْنِیَانِ

---

[1] میں بہت غیرت والا ہوں اور اللہ تعالےٰ مجھ سے بھی زیادہ غیرت والے ہیں اپنی غیرت ہی کی وجہ سے فحش باتوں کو حرام فرما دیا ہے کھلی ہوں یا چھپی ؛

وَزِنَاهُمَا الْبَطْشُ الحدیث یعنی کہ آنکھیں زنا کرتی ہیں اور ان کا زنا دیکھنا ہے اور کان زنا کرتے ہیں اور ان کا زنا سننا ہے اور زبان بھی زنا کرتی ہے اور اس کا زنا بولنا ہے (یعنی کسی عورت ولڑکے سے شہوت کی راہ سے باتیں کرنا) اور ہاتھ بھی زنا کرتے ہیں اور ان کا زنا (غیر محرم کو) پکڑنا ہے اور جب یہ فواحش ہیں اور فواحش پر غیرت حق اوپر معلوم ہو چکی ہے تو ثابت ہوا کہ اللہ تعالےٰ کو یہ افعال نہایت ناپسند ہیں۔

بدنگاہی کے مرض میں بعض پیر بھی مبتلا ہیں اور عورتوں کو پیر سے پردہ کرنے کی ضرورت

اور افسوس ہے کہ بعضے پیر بھی اس میں مبتلا ہوتے ہیں کہ عورتیں ان سے پردہ نہیں کرتیں اور کہتی ہیں کہ یہ تو بجائے باپ کے بلکہ باپ سے بھی زیادہ ہیں اور بے حیا بے محابا[1] سامنے آتی ہیں اور بڑے بیحیا وہ دیوث[2] مرد ہیں جو ایسے پیروں کے سامنے اپنی بیٹیوں بہوؤں کو آنے دیں بعض جگہ تو ایسا سُنا گیا ہے کہ مریدنیاں تنہا مکان میں جاتی ہیں اور وہاں مرید ہوتی ہیں نعوذ باللہ جناب

---

[1] بے لحاظ [2] بہت بے شرم

رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ کون ہوگا حضور سے عورتیں پردہ کرتی تھیں۔ ساری امت کی عورتیں آپ کی رُوحانی بیٹیاں اور حضور خود معصوم کسی قسم کے وسوسہ کا بھی شائبہ نہیں لیکن باوجود اس کے پھر پردہ کا حکم تھا اور ازواج مطہرات تمام امت کے مردوں عورتوں کی مائیں تھیں چنانچہ ارشاد ہے وَاَزْوَاجُہٗ اُمَّھَاتُھُمْ اور کسی کو ان کی نسبت توبہ توبہ وسوسہ تک بھی شر کا نہ تھا لیکن باوجود اس کے ارشاد ہے وَقَرْنَ فِیْ بُیُوْتِکُنَّ یعنی اپنے گھروں میں جمی رہو باہر نہ نکلو اور فرماتے ہیں وَلَا تَخْضَعْنَ بِالْقَوْلِ فَیَطْمَعَ الَّذِیْ فِیْ قَلْبِہٖ مَرَضٌ یعنی نرم بات مت کرو کہ جس کے قلب میں روگ ہے وہ طمع کرے گا۔

عورتوں کے لئے اغیار کے ساتھ بدخلقی (یعنی خشک مزاجی) صفت حمیدہ ہے

چنانچہ بزرگوں نے فرمایا ہے کہ جیسے مردوں کے لئے خوش اخلاقی صفت حمیدہ ہے عورتوں میں بداخلاقی صفت حمیدہ ہے یعنی غیر مردوں سے نرمی اور میٹھی میٹھی باتیں نہ کریں اور نہ تند مزاجی

لہ اور نبی کی بیویاں سب مسلمانوں کی مائیں ہیں۔

سے بلکہ ایسے انداز سے بات کریں کہ اس کو مضمون مفہوم ہوجائے اور کسی قسم کی طمع اس کے قلب میں نہ آوے نہایت خشکی وصفائی سے بات کریں البتہ اپنے خاوند اور دوسری عورتوں کے ساتھ خوش خلاقی برتیں۔ اللہ اکبر! یہ خاندان نبوت کا انتظام ہے آج کون ہے وہ شخص کہ ان سے زیادہ اپنے کو مقبول کہے بلکہ یہ وقت چونکہ فتنہ کا ہے اس لئے نہایت سخت انتظام کی ضرورت ہے۔

مرد چاہیے کیسا ہی بزرگ اور کتنا ہی بوڑھا ہو جاوے عورتوں کو اس سے پردہ واجب ہے

حکایت: ایک بزرگ تھے وہ اس میں احتیاط نہ کرتے تھے۔ اس لئے کہ بہت بوڑھے تھے۔ غیر اولی الاربہ میں داخل ہو گئے تھے اس لئے ان کو عورتوں سے زیادہ اجتناب نہ تھا ایک دوسرے بزرگ نے ان کو نصیحت کی انہوں نے نہ مانا ان بے احتیاط بزرگ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھا یہ مسئلہ پوچھا۔ فرمایا کہ اگر مرد جنید ہو اور عورت رابعہ بصریہ ہو اور وہ دونوں ایک جگہ تنہا ہوں تو ثالث ان کا شیطان ہو گا اور آدمی خواہ کسی قدر بوڑھا ہو

لے عورتوں کی حاجت نہ رکھنے والے

جاوے لیکن مادہ تو اس کے اندر باقی رہتا ہی ہے وہ فرشتہ تو ہے نہیں ہاں یہ اور بات ہے کہ کچھ نہ کر سکے لیکن نظر سے تو محفوظ نہیں رہ سکتا اور کیسے محفوظ رہ سکتا ہے۔ مرد کے اندر تو عورت کی طرف میلان خلقتہً پیدا کیا ہے کوئی اس فطری جوش کو کیسے روک سکتا ہے۔

حکایت: گنج مراد آباد میں ایک بزرگ تھے مولانا فضل الرحمٰن صاحب تقریباً ایک سو دس برس کی اُن کی عمر ہوئی میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ جاڑے کا موسم تھا صبح اُٹھ کر خادم کو آواز دی ارے فلانے مجھ کو شبہ سا ہو گیا ہے جی چاہتا ہے کہ نہا لوں۔ طبیعت صاف ہو جاوے گی۔ چنانچہ خادم نے پانی رکھ دیا اُسی جاڑے میں غسل فرمایا۔ بتلائیے اگر کچھ نہ رہا تھا تو شبہ کیسا۔ ایک مرتبہ کانپور میں ہمارے گھر بہت عورتیں آئیں اس میں اختلاف تھا کہ حضرت مولانا صاحب موصوف سے پردہ چاہئے یا نہیں میں نے یہ اختلاف سُن کر یہ حکایت اُن کو سُنائی اور کہا کہ اب تم خود فیصلہ کر لو کہ پردہ ضروری ہے یا نہیں۔ سب سنکر چپ ہو رہیں۔ حضرت جب سو برس کی عمر میں یہ قصہ ہو سکتا ہے تو پچاس برس کی عمر میں اب کیا مشکل ہے اور بہت سے پیر جوان بھی ہوتے ہیں۔

آج کل بے قید پیروں کے بھی معتقد ہو جاتے ہیں

اور آج کل تو پیر بننا کچھ مشکل بھی نہیں ہے لمبے لمبے بال ہوں موٹے موٹے دانوں کی تسبیح ہو رنگا کرتا ہو بس پیر ہو گئے پھر وہ خواہ عورتوں کو گھوریں یا لونڈوں کو تکیں حرام حلال میں کچھ امتیاز نہ کریں ان کی پیری ایسی مضبوط ہے کہ وہ کہیں سے نہیں جاتی بلکہ جس قدر کوئی خلاف شرع ہوگا۔ اُسی قدر زیادہ مقبول ہے اور جس قدر حدود شرعیہ کے اندر رہے گا وہ پیری سے دُور ہے وہ تو نرا ملا ہے۔

پردہ کے متعلق عورتوں اور مردوں کی بے احتیاطیاں

اور زینت کے متعلق عورتوں کا بے محل برتاؤ

یہ تو مردوں کی حالت تھی اب عورتوں کی کیفیت سنئے۔ بعض عورتیں ایسی بے حیا ہوتی ہیں کہ وہ خود مردوں کو دیکھتی ہیں یا پردہ وغیرہ اُٹھا دیتی ہیں کہ دوسرا مرد ان کو دیکھ لیتا ہے اور یہ احتیاط نہیں کرتیں حدیث میں ہے لَعَنَ[1] اللّٰهُ النَّاظِرَ وَالْمَنْظُوْرَ اِلَیْهِ اس کے

---

[1] اللہ تعالیٰ نے لعنت کی ناجائز دیکھنے والے اور دیکھے جانے والے پر دیکھا جانے والا یا والی وہی ہے جو خود کو چھپانے کے وقت اور چھپانے کی جگہ نہ چھپائے ستر کھولنے والے اور بے پردہ عورتیں سب اسمیں داخل ہیں سب پر پردہ واجب ہے۔ اور نہ کرنے پر لعنت

متعلق جو یوں عورتوں سے کہا جاتا ہے نصیحت کی جاتی ہے ۔ تو کہتی ہیں اُو نہہ ایک دفعہ دیکھ کر پھر کیا دیکھے گا ساری عمر ترسے گا۔ جو بڑی پردہ نشین کہلاتی ہیں ان کی یہ حالت ہے کہ خاوند کے سامنے نوٹھنگن ہی بنی رہیں گی اور اگر کہیں جاویں گی تو تمام زیب و زینت ختم کر کے بیگم بن کر جاویں گی سخت بے حیائی کی بات ہے کہ خاوند جس کے لئے زیب و زینت کا حکم ہے اس کے سامنے تو زیب و زینت نہ کی جاوے اور دوسروں کے دیکھنے کے لئے کی جاوے چاہئے تو یہ کہ اس کا برعکس ہو بعض عورتیں دولہا دلہن اور بارات کو دیکھتی ہیں۔ ان کے مرد بھی کچھ نہیں کہتے ۔ اسی طرح دوسری بے احتیاطی قابل نظر ہے وہ یہ کہ بعض مرد بڑے بے احتیاط ہوتے ہیں کہ گھر میں پکار کر نہیں جاتے ذرا کھنکارا اور فوراً اندر گھس گئے اور اکثر عورتیں بھی ایسی بے احتیاط ہوتی ہیں کہ ڈولی سے اُترنے سے پہلے تحقیق نہیں کر اتیں کہ کوئی مرد تو اندر نہیں ہے ۔ میں ایک دفعہ بیمار تھا ۔ بہت عورتیں ڈولی سے عیادت کے لئے آئیں اور بلا تحقیق اندر آگئیں میں نے ان کو خوب بُرا بھلا کہا اور جب عورتیں ایک جگہ جمع ہوتی ہیں اس وقت اور زیادہ بے حیائی ہوتی ہے ۔ چنانچہ بسا اوقات بے کہے اُس گھر کے مرد دروازے میں آکر سامنے کھڑے ہو جاتے ہیں اندر کسی نے منہ پھیر لیا کسی نے آنچل سے مُنہ ڈھک لیا کوئی کسی کے پیچھے ہوگئی اور طرفہ یہ کہ ہر ایک یہ جانتی ہے کہ مجھ کو نہیں دیکھا حالانکہ

اس نے سب کو دیکھ لیا۔

بدنگاہی میں عام ابتلاء اور اس کا علاج

خلاصہ یہ کہ آنکھوں کا گناہ سخت ہے اور اس میں بہت ابتلاء ہو رہا ہے اس کا بہت انتظام کرنا چاہیئے اپنا بھی اور گھر والوں کا بھی اور اس کا علاج سہل یہ ہے کہ راہ میں چلنے کے وقت نیچی نگاہ کر کے چلنا چاہیئے ادھر ادھر نہ دیکھے انشاء اللہ محفوظ رہے گا شیطان جب مردود ہوا اس نے کہا تھا۔ لَاَقْعُدَنَّ لَهُمْ صِرَاطَكَ الْمُسْتَقِيْمَ ثُمَّ لَاٰتِيَنَّهُمْ مِّنْۢ بَيْنِ اَيْدِيْهِمْ وَمِنْ خَلْفِهِمْ وَعَنْ اَيْمَانِهِمْ وَعَنْ شَمَآئِلِهِمْ یعنی میں ان کے (گمراہ کرنے کے لئے) تیرے سیدھے راستہ پر بیٹھوں گا پھر ان کے پاس آؤں گا۔ ان کے سامنے سے اور پیچھے سے اور داہنے سے اور بائیں سے۔ چار سمتیں تو اس نے بتلائیں اور دو سمتیں باقی رہیں اوپر اور نیچے بزرگان دین نے اس میں ایک لطیفہ لکھا ہے کہ اوپر نیچے کا ذکر اس لئے نہیں کیا کہ اکثر گناہ چار سمتوں سے ہوتے ہیں بس بچنے کی دو صورتیں رہیں یا تو اوپر دیکھ کر چلو یا نیچے دیکھ کر مگر اوپر دیکھنے میں تو گر جانے اور آنکھ میں کچھ پڑ جانے کا اندیشہ ہے اس لئے نجات کے لئے یہی شق متعین ہوئی کہ نیچے دیکھ کر چلیں [1] قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ

---

[1] اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے اور رحمٰن کے خاص بندے تو زمین پر چلنے میں وقار سے

اَلَّذِیْنَ یَمْشُوْنَ عَلَی الْاَرْضِ هَوْنًا۔

حکایت: ایک بزرگ تھے وہ بات کرتے وقت مردوں کو کبھی نہ دیکھتے تھے ان سے کسی نے وجہ پوچھی فرمایا کہ دو قسم کے لوگ ہیں ایک تو وہ جن کو میں پہچانتا ہوں اور دوسرے وہ جن کو میں نہیں پہچانتا۔ جن کو پہچانتا ہوں ان کو بلا دیکھے بھی آواز سے پہچان لیتا ہوں دیکھنے کی کیا ضرورت ہے اور جن کو نہیں پہچانتا ان کے دیکھنے سے کیا فائدہ ہے۔ سُبْحَانَ اللّٰہِ مِنْ حُسْنِ اِسْلَامِ الْمَرْءِ تَرْکُہٗ مَا لَا یَعْنِیْہِ[1] پر عمل اس کو کہتے ہیں بعض بزرگوں نے اس نظر کے گناہ سے بچنے کے واسطے جنگل میں رہنا اختیار کر لیا ہے۔ شیخ شیرازیؒ فرماتے ہیں ؎

بزرگے[2] دیدم اندر کوہسارے	قناعت کردہ از دنیا بغارے
چرا[3] گفتم بشہر اندر نیائی	کہ بارے بندے از دل برکشائی
بگفت[4] آنجا پری رویانِ نغزند	چو گل بسیار شد پیلاں بلغزند

---

[1] انسان کے عمدہ اسلام میں سے ہے ترک کردینا ہر بے فائدہ کا

[2] میں نے ایک بزرگ کو دیکھا پہاڑوں میں دنیا سے صرف ایک غار پر قناعت کئے ہوئے ہیں [3] میں نے کہا کیوں آپ شہر کے اندر نہیں آتے کہ کسی وقت تو دل کا بند کھول دیجئے سیر کر لیجئے [4] فرمایا وہاں حسین پری چہرہ ہیں اور جب گارا زیادہ ہو جاتا ہے ہاتھی بھی پھسل جاتے ہیں۔

بدنگاہی پر کبھی دنیا میں بھی سزا مل جاتی ہے

حکایت: ایک بزرگ طواف کر رہے تھے اور کہتے جاتے تھے اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُ بِکَ مِنْ غَضَبِکَ [1] کسی نے پوچھا کہ اس قدر کیوں ڈرتے ہو کیا بات ہے کہا میں نے ایک لڑکے کو بُری نظر سے دیکھ لیا تھا۔ غیب سے چپت لگا اور آنکھ پھوٹ گئی اس لئے ڈرتا ہوں کہ پھر عود [2] نہ ہو جاوے۔

حکایت: حضرت جنید چلے جا رہے تھے کہ ایک حسین لڑکا نصرانی سامنے سے آرہا تھا۔ ایک مرید نے پوچھا کیا اللہ تعالیٰ ایسی صورت کو بھی دوزخ میں ڈالیں گے۔ حضرت جنید نے فرمایا کہ تو نے اس کو نظر استحسان سے دیکھا ہے عنقریب اس کا مزہ تم کو معلوم ہوگا چنانچہ نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ قرآن بھول گیا۔ نعوذ باللہ

بعض سچے بزرگوں کی حُسن پسندی سے عوام کو دھوکہ ہونا اور اہل اللہ اور اہل ہوا کی حُسن پسندی میں فرق

بعض سچے بزرگ حُسن پسند ہوتے ہیں۔ بعض کو اس سے دھوکہ

---

[1] اے اللہ میں آپ کے غضب سے آپ کی پناہ مانگتا ہوں [2] دوبارہ نہ ہو جاوے۔

ہو گیا ہے۔ چنانچہ کہتے ہیں کہ مرزا مظہر جانجاناںؒ حسن پرست تھے تو ہم ایسا کریں تو کیا مضائقہ ہے۔ سبحان اللہ کیا استدلال ہے۔ بات یہ ہے ؎

کارِ پاکاں را قیاس از خود مگیر ۔۔۔ گرچہ ماند در نبشتن شیر و شیر[1]

میں ان کی حسن پرستی کی حقیقت تبلاتا ہوں کہ وہ اس معنی کے حسن پرست نہ تھے جیسے کہ لوگ سمجھتے ہیں بلکہ ان کو ہر حسین شے اچھی معلوم ہوتی تھی۔ اور ہر بُری اور بے قاعدہ شے سے اس قدر نفرت تھی کہ ان کو بدصورت اور بے ڈھنگی شے دیکھنے سے تکلیف ہوتی تھی۔

حکایت: چنانچہ حضرت مرزا صاحبؒ کو جب کہیں جانا ہوتا تھا تو پالکی میں بیٹھ کر جاتے تھے اور پالکی کی پٹ بند کرا دیا کرتے تھے۔ کسی نے پوچھا کہ حضرت آپ پٹ کیوں بند کرا دیا کرتے ہیں فرمایا کہ راستے میں بازار وغیرہ ملتے ہیں بعض دکانیں بے قاعدہ بنی ہوئی ہوتی ہیں مجھ کو دیکھ کر سخت تکلیف ہوتی ہے۔

حکایت: تھانہ بھون کے قاضی صاحب معہ اپنے ہمراہی کے مرزا صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اُس ہمراہی کو ناک

---

[1] پاک بزرگوں کے کاموں کو اپنے اوپر قیاس نہ کرو اگرچہ لکھنے میں شیر (درندہ) اور شیر (دودھ) ایک سا ہوتا ہے اسی طرح آدمی آدمی برابر مگر پھر بھی زمین و آسمان کا فرق ہے۔

صاف کرنے کی ضرورت ہوئی تو مرزا صاحب کی نظر پیچھے سے اُس کے پائجامے پر پڑ گئی۔ سب چھینٹیں پائجامے کے پیچھے تھیں۔ مرزا صاحب کے سر میں درد ہو گیا اور فرمایا کہ قاضی صاحب اس شخص کے ساتھ آپ کا کیسے گذر ہوتا ہو گا۔

حکایت: اکبر شاہ ثانی جو کہ بادشاہ وقت تھا ایک مرتبہ مرزا صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا۔ بادشاہ کو پیاس لگی۔ کوئی خادم اس وقت موجود نہ تھا خود اُٹھ کر پانی پیا اور پانی پی کر کٹورا صراحی پر ٹیڑھا رکھ دیا۔ مرزا صاحب کے سر میں درد ہو گیا۔ اور طبیعت پریشان ہو گئی لیکن ضبط فرمایا۔ چلتے وقت بادشاہ نے عرض کیا کہ حضرت آپ کے یہاں کوئی آدمی خدمت کے لئے نہیں ہے اگر ارشاد ہو تو کوئی آدمی بھیجدوں۔ اب تو مرزا صاحب سے نہ رہا گیا۔ جھنجھلا کر فرمایا کہ پہلے تو تم آدمی بنو کٹورا ٹیڑھا رکھ دیا میری طبیعت اب تک پریشان ہے۔

حکایت: ایک شخص نے مرزا صاحبؒ کی خدمت میں انگور بھیجے۔ بہت نفیس اور منتظر داد کے ہوئے۔ مگر مرزا صاحبؒ ساکت تھے۔ آخر اس نے خود پوچھا کہ حضرت انگور کیسے تھے۔ فرمایا کہ مُردوں کی بُو آتی تھی۔ تحقیق سے معلوم ہوا کہ قبرستان میں انگور بوئے گئے تھے۔ وہ انگور وہاں سے آئے تھے۔ مرزا صاحب کے اندر حسن پرستی تھی تو وہ طبعی تھی۔ طبیعت کی ساخت ہی ایسی واقع ہوئی تھی۔

کہ ہر اچھی شے پسند فرماتے تھے۔ اُن کے نفس میں بڑے خیال کا شائبہ بھی نہ تھا اور دلیل اسکی یہ ہے کہ بچپن میں بھی بدصورت کی گود میں نہ جاتے تھے۔ بھلا اس وقت کیا احتمال ہو سکتا ہے۔

حکایت: خواجہ میر درد کی نسبت لوگوں نے آکر مرزا صاحب سے عرض کیا کہ خواجہ صاحب راگ سنتے ہیں۔ فرمایا کہ بھائی وہ کن رس میں مبتلا ہیں۔ میں آنکھ رس میں یعنی ان کو کانوں کا مرض ہے مجھ کو آنکھوں کا۔ آپ نے اس کو بھی مرض سے تعبیر فرمایا۔

حکایت: ایک بزرگ کی کیفیت یہ تھی کہ حسین لڑکے اُن کی خدمت کرتے تھے اور گاہ گاہ ان کو پیار بھی کرتے تھے۔ ایک روز ان کے ایک مرید نے بھی ایک لڑکے کو پیار کر لیا۔ پیر سمجھ گئے کہ اس نے میرا اتباع کیا۔ ایک روز بازار میں گئے۔ لوہار کی دوکان پر دیکھا کہ لوہا سرخ انگارا سا ہو رہا ہے۔ پیر صاحب نے فوراً جاکر اس کو پیار کر لیا اور اس مرید سے فرمایا کہ آئیے تشریف لائیے اس کو بھی پیار کیجئے۔ پھر تو یہ گھبرائے۔ اُس وقت انھوں نے اُن کو ڈانٹا کہ خبردار ہم پر اپنے کو مت قیاس کرو۔

حکایت: ایک اور بزرگ کو دیکھا کہ حسین لڑکے سے پاؤں دبوا رہے ہیں۔ ایک شخص کو وسوسہ ہوا کہ یہ کیسے شیخ ہیں لڑکے سے پاؤں دبواتے ہیں۔ فرمایا کہ آگ کی انگیٹھی اُٹھا لاؤ۔ دہکتی آگ میں پاؤں رکھ دیئے اور فرمایا کہ ہم کو کچھ حس نہیں ہمارے

نزدیک یہ آگ اور یہ لڑکا برابر ہے۔

بیعت کے قابل وہ حضرات ہیں جن کا ظاہر اور باطن دونوں درست ہوں

لیکن یاد رکھو ایسے بزرگوں سے جن کا ظاہر خلافِ شرع نظر آوے بیعت ہونا جائز نہیں ہے محققین کی یہ شان نہیں ہے جو لوگ مسندِ ارشاد پر متمکن ہوتے ہیں اور اَلْعُلَمَاءُ وَرَثَۃُ الْاَنْبِیَاءِ کے خطاب سے مشرف ہیں وہ بالکل متبع سنت نبویہ کے ہوتے ہیں ان کی ہر وضع سنت کے موافق ہوتی ہے اور تہمت اور بدگمانی کے موقع سے بچنا بھی سُنت ہے۔ چنانچہ حضور کی شان اس باب میں یہ تھی کہ ایک مرتبہ حضورؐ مسجد میں معتکف تھے۔ حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا جو کہ ازواج مطہرات میں ہیں وہاں تشریف لائیں۔ واپسی کے وقت حضورؐ ان کے پہنچانے کے لئے ان کے ساتھ دروازے تک کہ وہ مسجد کی طرف تھا۔ تشریف لائے سامنے دیکھا کہ دو شخص آرہے ہیں فرمایا کہ عَلٰی رِسْلِکُمَا یعنی اپنی جگہ ٹھہر جاؤ۔ یہاں پردہ ہے اور اس کے بعد فرمایا اِنَّھَا صَفِیَّۃُ یعنی یہ عورت صفیہ تھی کچھ اجنبیہ نہ تھی۔ فَکَبُرَ عَلَیْہِمَا ذٰلِکَ یعنی یہ بات ان دونوں پر بہت بھاری ہوئی اور عرض کیا یا رسول اللہ کیا آپ پر ایسا گمان ہوسکتا ہے فرمایا

شیطان ابن آدم کے اندر بجائے خون کے دوڑتا ہے۔ مجھے خیال ہوا کہ کبھی وہ تمہارے ایمان کو نہ تباہ کر دے۔ پس جو لوگ ارشاد کی شان لئے ہوئے ہوتے ہیں وہ تو ابہام سے بھی بچتے ہیں۔ ایسے حضرات قابل بیعت ہیں۔ باقی جن کا ظاہر شریعت کے موافق نہ ہو ان میں بعض تو ایسے ہیں کہ مکار ہیں۔ باطن بھی ان کا موافق نہیں ہے وہ مردود ہیں اور بعض ایسے ہیں کہ باطن ان کا بالکل شریعت کے موافق ہوتا ہے لیکن ظاہر ان کا ہماری سمجھ میں نہیں آتا۔ ان پر اعتراض نہ کرے اور نہ ان کا اتباع کرے۔ غرض مرشد ایسے کو بناوے جو ظاہراً اور باطناً پاک صاف ہو +

بدنگاہی ہر پہلو سے حرام اور گناہ کبیرہ ہے اور دل میں تصور کر کے مزے لینا اس سے بھی زیادہ شدید ہے

خلاصہ یہ ہے کہ کسی کے پاس کوئی دلیل اور سہارا بدنگاہی کے متعلق نہیں۔ بدنگاہی ہر پہلو سے حرام اور گناہ کبیرہ ہے۔ آگے فرماتے ہیں ما تخفی الصدور یعنی جس شے کو سینے میں چھپاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اس کو بھی جانتے ہیں۔ یہ پہلے سے اشد ہے یعنی معصیت

صرف نگاہ ہی سے نہیں، بلکہ دل سے بھی ہوتی ہے۔ بہت لوگ دل سے سوچا کرتے ہیں اور عورتوں و مردوں کا تصور کرتے ہیں اور خیال سے مزے لیتے ہیں اور یوں سمجھتے ہیں کہ ہم متقی ہیں۔ خوب سمجھ لو کہ تلبیس ابلیس لعین ہے بلکہ بعض مرتبہ دل کے اندر سوچنے سے اور دل کے اندر باتیں کرنے سے اور زیادہ فتنہ ہوتا ہے، کیونکہ نگاہ کرنے میں تو بعض مرتبہ قبیح اور بدصورت ثابت ہوتا ہے۔ اور دل کے اندر باتیں کرنے میں تو طبیعت کا زیادہ بگاڑ ہو جاتا ہے اور قلب سے کسی طرح وہ نہیں نکلتی بلکہ محض نگاہ نہ کرنے سے اپنے کو صاحب مجاہدہ سمجھ کر زیادہ مقرب سمجھتا ہے اور یہ نہیں دیکھتا کہ دل میں متمتع ہو رہا ہوں تو مجاہدہ کہاں رہا۔ غرض اس کا انسداد بھی بہت ضروری ہے اور چونکہ قلب کے اندر کانوں کے واسطے بھی باتیں اس قسم کی پہنچتی ہیں۔ اس لئے جس طرح آنکھوں کی حفاظت ضروری ہے۔ کانوں کی نگہداشت بھی ضروری ہے کہ ایسے قصے اور حکایات نہ سنے نہ ایسے مقام پر جاوے جہاں گانا بجانا ہو رہا ہو۔ بعض مرتبہ خود قلب ہی سے معصیت صادر ہوتی ہے۔ صدور کے وقت آنکھ کان کا واسطہ نہیں ہوتا۔ مثلاً پہلی دیکھی ہوئی صورتیں یاد آتی ہیں اور ان سے التذاذ ہوتا ہے۔ اور معصیت قلب کا معصیت عین سے اشد ہونا ایک اور وجہ سے بھی ہے وہ یہ کہ قلب سے سوچنے اور آنکھوں سے دیکھنے میں ایک فرق بھی

لے مزہ لینا

ہے۔ یعنی آنکھوں کے گناہ میں تو نفس فعل کو کوئی دیکھ بھی سکتا ہے۔ گو نیت پر مطلع نہ ہوا اور دل کے اندر ہونے کے فعل کو کوئی بھی نہیں دیکھ سکتا۔ اس کی اطلاع سوائے اللہ تعالےٰ کے کسی کو نہیں۔ اس سے وہی بچے گا جس کے قلب میں تقوےٰ ہو۔

معصیت قلب کے معالجہ اور ازالہ کے درجات اور اس کا بیان کہ مطلوب کونسا درجہ ہے

اس کے بعد سمجھنا چاہیئے کہ اس مرض کے ازالہ میں تین درجے ہیں قلب کو باوجود تقاضہ کے روکنا۔ تقاضے کو ضعیف کر دینا۔ اور قلع المقتضےٰ یعنی مادہ ہی کا قلع قمع کر دینا۔ ان میں سے قلب کو روکنا یعنی دل کو خود اس طرف متوجہ نہ ہونے دینا۔ یہ امر تو اختیاری ہے کہ اگر آپ سے آپ جائے تو تم اس کو روکو اور اس کا سہل طریقہ یہ ہے کہ جب قلب کسی حسین عورت کی طرف مائل ہو تو اس کا علاج یہ ہے کہ فوراً کسی کریہہ المنظر[1] بدشکل بدصورت بدہیئت کی طرف دیکھو اگر کوئی موجود نہ ہو کسی ایسے بدصورت کا خیال باندھو کہ ایک شخص ہے کالا رنگ ہے چیچک کے داغ ہیں آنکھوں سے اندھا ہے سر سے گنجا ہے

---

[1] جو دیکھنے میں بہت برا معلوم ہو۔

رال بہ رہی ہے دانت آگے کو نکلے ہوئے ہیں۔ ناک سے نکٹا ہے
ہونٹ بڑے بڑے ہیں اور رینٹ بہ رہا ہے اور مکھیاں اس پر بیٹھی
ہیں گو ایسا شخص دیکھا نہ ہو مگر قوتِ متخیلہ سے تراش لو کیونکہ تمہارے
دماغ میں ایک قوتِ متخیلہ ہے آخر اس سے کسی روز کام تو لوگے متخیلہ
کا کام توڑ جوڑ کا ہے۔ جب ایسا شخص فرض کیا جا سکتا ہے اس کا
مراقبہ کرو۔ انشاء اللہ تعالیٰ وہ نشاء جو حسین کے دیکھنے سے قلب
میں ہوا ہے وہ جاتا رہے گا اور اگر پھر خیال آوے پھر یہی تصور کرو۔ اور
اگر یہ مراقبہ کفایت کے درجہ میں نافع نہو اور بار بار پھر اسی حسین کا تصور
ستاوے تو یوں خیال کرو کہ یہ محبوب ایک روز مرے گا اور قبر میں
جاوے گا۔ وہاں اس کا نازک بدن سڑ گل جاوے گا۔ کیڑے اس
کو کھالیں گے یہ خیال تو فوری علاج ہے اور آئندہ کے لئے تقاضہ
پیدا ہونے کا علاج یہ ہے کہ ذکر اللہ کی کثرت کرو اور دوسرے
یہ کہ عذابِ الٰہی کا تصور کرو۔ تیسرے یہ کہ یہ تصور کرو کہ اللہ تعالیٰ دیکھتا
ہے اور اس کو مجھ پر پوری قدرت ہے۔ طول مراقبات اور کثرت
مجاہدات سے یہ چور دل میں سے نکلے گا۔ جلدی نہ جاویگا۔ جلدی
نہ کرے اس لئے کہ ایسا پرانا مرض ایک دن یا ایک ہفتہ میں نہیں
جاتا۔ یہاں مجھ کو شاہ محمود غزنوی کی حکایت یاد آگئی۔

حکایت: محمود نے جب ہندوستان پر حملہ کیا تو ایک ہمراہی
سپاہی نے ایک مندر میں جا کر دیکھا کہ ایک بوڑھا برہمن پوجا پاٹ

کمر رہا ہے۔ سپاہی نے تلوار دکھائی کہ کلمہ پڑھ اور مسلمان ہو ورنہ اس تلوار سے دو ٹکڑے کر دوں گا۔ برہمن نے کہا حضور ذرا ٹھہرئیے۔ سپاہی نے پھر تقاضا کیا برہمن نے عرض کی حضور نوے برس کا رام تو دل ہی سے نکلتے نکلتے ہی نکلے گا۔ ذرا سی دیر میں کیسے نکل جاوے۔ خوب کہا ہے ؎

صوفی نشود صافی تا درنہ کشد جامے
بسیار سفر باید تا پختہ شود خامے

ہمت مت ہارو مجاہدہ کرتے رہو رفتہ رفتہ یہ تقاضا ضعیف ہو جاوے گا اور قابو میں آجاوے گا کہ اپنے محل پر صرف ہو گا اور غیر محل کے لئے متحرک نہ ہو گا۔ اور یہی مطلوب ہے ✿

افعال قبیحہ کے مادہ کا ازالہ مقصود نہیں اور اس کے متعلق نادان اہل سلوک کی ایک بڑی غلطی

تیسرا درجہ یہ کہ مادہ ہی منقطع ہو جاوے۔ یعنی بالکل میلان ہی کبھی پیدا نہ ہو۔ یہ وہ مرتبہ ہے کہ جس کو نادان سالک مطلوب سمجھتے ہیں۔ اور اس کے حاصل نہ ہونے پر پریشان ہوتے ہیں۔ یعنی جب اپنے اندر کسی وقت میلان پاتے ہیں تو سمجھتے ہیں کہ ہمارا سب ذکر و شغل و مجاہدہ بیکار گیا۔ حتیٰ کہ ایسے کلمات پریشانی میں

ان کے منہ سے نکل جاتے ہیں کہ بے ادبی اور گستاخی ہو جاتی ہے مثلاً ہم اتنے روز سے طلب حق میں ہے مگر ہم پر رحم نہیں آتا کہ ویسے ہی محروم ہیں یاد رکھو کہ یہ شیطانی وسوسہ ہے یہ ہرگز مطلوب نہیں کہ مادہ منقطع ہو جاوے اور اگر مادہ جاتا رہے تو گناہ سے بچنے میں کوئی کمال نہیں۔ اندھا اگر فخر کرے کہ میں دیکھتا نہیں تو کون فخر کی بات ہے۔ دیکھے گا کیا دیکھنے کا آلہ نہیں۔ عنین اگر عفت کا دعویٰ کرے تو کیا کمال ہے۔ لطف اور کمال تو یہ ہے گناہ کر سکو اور اپنے دل کو روکو۔ جس کا میں نے فوری علاج اور تقاضا روکنے کی تدبیر دونوں بیان کر دئے۔ رہا مادہ زائل کر دینا یہ مطلوب ہی نہیں بلکہ اس کا زائل کرنا جائز ہی نہیں۔

خدا تعالیٰ کے ساتھ محبت ہوتے ہوئے غیر پر نظر ناممکن ہے

خلاصہ یہ کہ مجھے اس گناہ پر متنبہ کرنا منظور ہے اس لئے کہ اس گناہ کا ابتلاء عام تھا حتیٰ کہ جو نیک کہلاتے ہیں وہ بھی اس میں مبتلا ہیں۔ خدا کے واسطے اس کا انتظام کرنا چاہئے۔ افسوس منہ سے تو خدا تعالیٰ کی محبت کا دعویٰ اور غیر پر نظر افسوس صد افسوس اس وقت مجھ کو ایک حکایت یاد آگئی۔

حکایت: ایک عورت جارہی تھی۔ کوئی ہوا پرست اس کے ساتھ ساتھ ہولیا اس عورت نے پوچھا کہ تم کون ہو اور میرے پیچھے کیوں آتے ہو کہا میں تجھ پر عاشق ہوگیا اس لئے آتا ہوں عورت نے جواب دیا کہ پیچھے ایک میری بہن آرہی ہے وہ مجھ سے زیادہ حسین ہے اس کے دیکھنے کو پیچھے چلا۔ اس عورت نے اس کے ایک دھول دی اور کہا۔

گفت[ل] اے ابلہ اگر تو عاشقی — در بیان دعوئے خود صادقی
پس[۲] چرا بر غیر افگندی نظر — ایں بود دعوئے عشق ای بےخبر

صاحبو اگر حق تعالیٰ سامنے کھڑا کر کے اتنا دریافت فرمالیں کہ تو نے ہم کو چھوڑ کر غیر پر کیوں نظر کی تو بتلائیے کیا جواب ہے یہ ہلکی بات نہیں اس کا بہت بڑا اہتمام کرنا چاہیے۔

معصیت کے تقاضہ کا نہایت مفید علاج

ایک اور تدبیر ہے جو مقوی ہے ان تدابیر کی وہ یہ کہ جب قلب میں ایسا خیال پیدا ہو ایسا کرو کہ وضو کر کے دو رکعت پڑھو اور توبہ کرو اور اللہ تعالیٰ سے دعا کرو جب نگاہ پڑے یا دل میں تقاضا

ل عورت نے کہا اے بیوقوف اگر تو عاشق اور اپنے دعوے کے بیان میں سچا ہے ۲ تو تو نے غیر پر نظر کیوں ڈالی اے بیہودہ کیا یہی ہوتا ہے عشق کا دعوے۔

پیدا ہو تو فوراً ایسا ہی کرو۔ ایک دن تو بہت سی رکعتیں پڑھنا پڑیں گی۔ دوسرے دن بہت کم ایسا خیال آوے گا۔ اسی طرح بتدریج نکل جاوے گا اس لئے کہ نفس کو نماز بڑی گراں ہے۔ جب دیکھے گا ذرا سا مزہ لینے پر یہ مصیبت ہوتی ہے۔ یہ ہر وقت نماز ہی میں رہنا ہے پھر ایسے وسوسے نہ آویں گے۔

سمع و بصر و قلب و جوارح[1] کی حفاظت کا حکم

وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ اُولٰٓئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْـُٔوْلًا مت اتباع کر اس شے کی جس کی تجھ کو تحقیق نہیں بیشک کان اور آنکھ اور قلب ان میں سے ہر ایک سے سوال کیا جائے گا۔ اس آیت میں چار چیزوں کی حفاظت کا حکم فرمایا ہے۔ قلب آنکھ، کان یہ تین چیزیں تو بالتصریح[2] بیان فرمائیں چوتھی چیز بقیہ جوارح یعنی ہاتھ پاؤں زبان وغیرہ کی حفاظت ہے وہ بالتصریح اس آیت میں مذکور نہیں ہیں بلکہ ان چیزوں کی حفاظت کو وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ میں دلالۃ[3] ذکر فرمایا ہے چنانچہ وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ کی حقیقت میں غور کرنے سے

---

[1] ہاتھ پیر وغیرہ ظاہری اعضاء [2] صاف صاف [3] جو صاف نہیں ہو مگر اس سے نکلتا ہو۔

معلوم ہوتا ہے کہ اس آیت میں تمام جوارح کی حفاظت بھی آگئی ہے اس لئے کہ اس کی حقیقت ہے بلا تحقیق کسی امر کا اتباع نہ کرنا اب اس کے تحقق کی چند صورتیں ہیں۔ مثلاً کوئی شے گم ہوجاوے بلا تحقیق قرائن موہومہ پر کسی کو چور کہہ دیا۔ چور کہنا زبان کا گناہ ہے وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ اس گناہ سے روکتا ہے دیکھئے وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ پر عمل نہ ہونے سے زبان کا گناہ ہوگیا۔

جب تک کسی کے فعل میں تاویل ہوسکے اُس وقت تک اُس پر بدگمانی نہ چاہیئے

حکایت: ایک عجیب حکایت یاد آئی سیدنا عیسےٰ علیہ السلام نے ایک شخص کو چوری کرتے ہوئے دیکھا اس سے فرمایا کہ تو چوری کرتا ہے اس نے کہا۔ کَلَّا وَاللّٰهِ الَّذِيْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ یعنی ہرگز نہیں قسم ہے اس ذات کی کہ کوئی معبود نہیں سوائے اس کے عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا صَدَّقْتُ رَبِّيْ وَكَذَّبْتُ عَيْنِيْ یعنی میں اپنے

لہ وجود کی یعنی بے تحقیق بات کی پیروی کا وجود اور اسکی شکل ئے غیر یقینی صرف وہمی۔ ناداں نکالنا حاضرات کرانا قرینے ہونا سب اس میں داخل ہے۔

رب کی تصدیق اور اپنی آنکھ کی تکذیب کرتا ہوں یعنی میری آنکھ نے غلط دیکھا تو سچا ہے ۔

انبیاء علیہم السلام کو نہ دین میں غلو ہوتا ہے اور نہ وہ مغلوب الحال ہوتے ہیں

شاید کوئی خشک مغز اس کو غلو فی الدین سمجھے یا کوئی یوں کہے کہ یہ تو استغراق یا غلبہ حال ہے ۔ سو یاد رکھو کہ انبیا علیہم السلام میں نہ غلو فی الدین ہوتا ہے اور یہ ظاہر ہے اور وہ مغلوب الحال بھی نہیں ہوتے بلکہ اپنے حال پر غالب ہوتے ہیں ۔ بزرگوں کی دو قسمیں ہیں ابو الحال اور ابن الحال ۔ ابو الحال وہ ہیں جو اپنے حال پر غالب ہوتے

لہ اپنے رب کے نام لینے کی ۔ لہ حضرت عیسےٰ السلام کے جواب کو دین میں غلو اور زیادتی کرنا سمجھے ۔ تہ توجہ الٰہی میں غرق ہونا یا محبت کی حالت کا غالب ہونا ورنہ آنکھوں سے دیکھ لینا تو یقینی تھا اور اس کی قسم کا سچا ہونا ضروری نہ تھا ۔

ہے اس لئے یہ فرمانا قانونِ شریعت ہی کی وجہ سے ہے کیونکہ آنکھ سے تو کسی چیز کا لینا ہی نظر آسکتا اس چیز کا اسکی ملک نہ ہونا یا اس کو لینے کی اجازت نہ ہونا یا اس کا کوئی حق اس پر نہ ہونا تو آنکھ سے نظر نہیں آتا ۔ قسم نے دوسری بات ہونے کو بتا دیا ہے اس لئے وہ صحیح ہے ۔

ہیں۔ مخلوق سے ملے جلے رہتے ہیں۔ اسباب ظاہرہ کو چھوڑتے نہیں ہر امر کو ضابطہ اور قاعدے سے کرتے ہیں۔ مال کو انتظام سے خرچ کرتے ہیں ان امور میں جیسے اور عوام کی حالت ہوتی ہے۔ ایسی ہی ان کی بھی ہوتی ہے اور اہل حال آزاد ہوتے ہیں خلقت سے بھاگتے ہیں کسی امر کی تدبیر نہیں کرتے۔ موجی بندے ہوتے ہیں جو چاہتے ہیں کرتے ہیں۔ ہاں خلافِ شریعت کچھ نہیں کرتے۔ اس لئے کہ جو خلاف شریعت کرے گا وہ مقبول و بزرگ نہیں ہو سکتا۔ البتہ اس کا قول و فعل کبھی بظاہر خلاف شرع ہوتا ہے۔ جس کی تاویل ضروری ہے۔

اہل کمال کی پہچان اور اس کا بیان کہ عارف میں برکت دوامًا اور کرامت احیانًا ہوتی ہے تصرف نہیں ہوتا اور اس کا راز

اکثر عوام الناس ایسے لوگوں کو باکمال سمجھتے ہیں اور اہل کمال کو

لے اگر اس کے عام حالات شریعت کے مطابق ہوں تاکہ اس کا بزرگ ہونا ثابت ہے

لے ہمیشہ لے کبھی کبھی لے مرید کو لوٹ پوٹ کر دینا حالت غیر کر دینا۔

کم پہچانتے ہیں اس لئے میں اہل کمال اور غیر اہل کمال کی شناخت کے لئے ایک قاعدہ کلیہ بھی بتائے دیتا ہوں کہ وہ نہایت مفید ہے۔ وہ یہ ہے کہ ولایت نبوت سے مستفاد ہے۔ جس بزرگ کی حالت انبیاء علیہم السلام کے ساتھ زیادہ مشابہ ہوگی وہ زیادہ باکمال ہوگا ہو انبیاء نے نہ کبھی نعرے مارے نہ کبھی کپڑے پھاڑے نہ خلقت سے بھاگے خصوصاً ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کہ ہر امر کا انتظام حضور کے یہاں تھا۔ سلطنت کا انتظام حضور نے ایسا فرمادیا کہ سلاطین دنیا نے آپ سے سیکھا۔ خانہ داری کا انتظام ایسا تھا کہ آج کوئی اس کی نظیر نہیں دکھلا سکتا۔ اسی طرح ملنے جلنے کھانے پینے حتٰی کہ بول وبراز کے قواعد حضور نے اُمت کو تعلیم فرمائے۔ اہل کمال کی حالت اسی طرز کی ہوتی ہے اور جس طرح آج کل عوام ایسے اہل کمال کو بزرگ وخدارسیدہ نہیں جانتے اُس وقت بھی عام لوگوں نے انبیاء کو کامل نہیں سمجھا چنانچہ کہا کرتے تھے۔ مَالِ هٰذَا الرَّسُوْلِ يَاْكُلُ الطَّعَامَ وَيَمْشِيْ فِي الْاَسْوَاقِ لَوْلَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مَلَكٌ فَيَكُوْنَ مَعَهٗ نَذِيْرًا اَوْ يُلْقٰٓى اِلَيْهِ كَنْزٌ اَوْ تَكُوْنُ لَهٗ جَنَّةٌ يَّاْكُلُ مِنْهَا یعنی اس رسول کو کیا ہوا کہ کھانے کھاتا ہے اور بازاروں میں چلتا پھرتا ہے ان کی طرف کوئی فرشتہ کیوں نہیں آیا کہ ان کے ساتھ رہ کر

لہ حاصل کی ہوئی   لہ پیشاب پاخانہ

لوگوں کو تبلیغ کرتا یا ان کے پاس کوئی خزانہ ہوتا تو یہ ہم سے بھی زیادہ غریب مفلس ہیں۔ ہم دو وقت کھانا کھاتے ہیں۔ ان کو ایک وقت بھی کبھی کبھی کئی دن میں ملتا ہے۔ اچھے اللہ کے پیارے ہیں کوئی اپنے پیارے کو بھوکا بھی مارا کرتا ہے) یا ان کے پاس کوئی باغ ہوتا کہ یہ اس سے کھاتے (غرض کوئی وصف ایسا ہوتا جو ہم میں نہیں یہ کیسے نبی ہیں جو ہم سے ممتاز نہیں ہیں) اسی طرح جو اولیاء اللہ اس شان کے ہوتے ہیں ان پر لوگ اعتراض کرتے ہیں اور جو خلقت سے بھاگتا ہے۔ کھاتا پیتا نہیں ننگا رہتا ہو کسی سے بات نہ کرتا ہو وہ بزرگ ہے اور اگر خلافِ عادت کوئی امر اس سے صادر ہو گیا کسی پر کوئی تصرف کر دیا اس کو تو نبی سے بڑھ کر جانتے ہیں۔ حالانکہ تصرف کوئی چیز نہیں یہ تو ریاضت[1] سے ہندو جوگیوں میں بھی پیدا ہو جاتا ہے بلکہ اہل کمال اس کو اچھا نہیں جانتے حضرت خواجہ عبید اللہ احرار رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں عارف را ہمت نباشد یعنی عارف کو ہمت یعنی تصرف نہیں ہے ہمت کے وہ متعارف معنی نہیں کہ کسی کام کی ہمت نہیں

---

[1] مشقت و محنت سے کیونکہ جو چیز جتنی لطیف ہوتی ہے اتنی ہی طاقت والی ہوتی ہے مٹی سے پتھر پتھر سے لوہا لوہے سے آگ آگ سے پانی پانی سے ہوا اور بجلی طاقت ور ہے تو خیال کی قوت اور زیادہ طاقت ور ہے۔ مشق سے بڑھ کر مسمریزم اور شعبدہ بازی بن جاتی ہے۔ دوسرے میں رد و بدل یعنی تصرف کرنا اسی مشقی خیالی قوت سے ہو سکتا ہے ؛

بلکہ ہمت کے معنی تصرف وغیرہ کے ہیں مطلب یہ ہے کہ عارف کو تصرف نہیں ہوتا اور وجہ اسکی یہ ہے کہ جس قدر عرفان بڑھے گا۔ فنا بھی ساتھ ساتھ بڑھتی چلی جاتی ہے اور اپنے سے نظر اٹھتی جاتی ہے۔ دیکھئے تحصیلدار اپنے اجلاس میں بیٹھ کر بڑے بڑے احکام صادر کرتا ہے لیکن گورنر جنرل کے سامنے جب آتا ہے تو اس کی وہ حالت ہوتی ہے جو ادنےٰ اردلی کی ہے اسی طرح عارف کو جس قدر معرفت بڑھے گی وہ گھٹتا چلا جائے گا۔ فنا سے اس کو فاعلیت[1] مستقلہ من وجہ کے تصور سے غیرت آئے گی اور معرفت سے دوسرے کی طرف توجہ تام[2] کرنے سے غیرت آوے گی اور تصرف میں یہی ہوتا ہے کہ دوسری طرف توجہ تام کرنا پڑتا ہے۔ اور تدبیر مسنون[3] اس اس سے مستثنیٰ ہے کہ اس میں فاعلیت و توجہ میں استغراق نہیں ہوتا۔ عارفین میں دو باتیں ہوتی ہیں۔ برکت اور کرامت

برکت اور کرامت کی حقیقت اور تصرف اور کرامت میں فرق

برکت یہ ہوتی ہے ان کے وجود باجود سے بارش ہوتی ہے بیماری

---

[1] کسی نہ کسی درجہ میں خود مستقل کرنے والا بننے کے تصور سے [2] پوری توجہ [3] اصلاح تربیت تبلیغ وغیرہ۔

دُور ہوتی ہے آفات اور حوادث ٹل جاتے ہیں لیکن ان کو خبر تک نہیں ہوتی جیسے آفتاب جب نکلتا ہے تو سب کو منور کر دیتا ہے لیکن آفتاب کو کچھ خبر تک نہیں کہ میری ذات سے کس کس شے کو نفع پہنچ رہا ہے اور دوسری شے کرامت ہے وہ بھی کبھی عارفین میں ہوتی ہے۔ کرامت یہ ہے کہ کسی خارق[1] عادت کا ان کے ذریعہ سے ظاہر ہونا۔ کرامت میں قصد نہیں ہوتا گو علم ہو اور تصرف میں قصد کرنا اور توجہ اس طرف مبذول کرنا ضروری ہے ہاں اگر اذن[2] الٰہی اس تصرف کا ہو تو اور بات ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مشکلات میں دُعائیں کی ہیں تصرف سے کہیں کام نہیں لیا۔ الا نادراً

یہی وجہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے امورِ نازلہ[3] میں دُعائیں بہت کی ہیں مگر یہ کہیں نہیں آیا کہ آنکھیں بند کر کے اس طرف توجہ و تصرف کیا ہو چنانچہ آیا ہے کہ حضور نے دُعا فرمائی اَللّٰھُمَّ اَعِزَّ الْاِسْلَامَ بِعُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ اَوْ بِعَمْرِو بْنِ ھِشَامٍ

---

[1] معمول و عادت کے خلاف [2] اللہ تعالیٰ کی اجازت [3] سوائے نادر حالات کے

نازل ہونے والی مصیبتیں

یعنی اے اللہ اسلام کو قوت دے عمر بن خطاب سے یا ابوجہل بن ہشام سے یعنی ان کو مسلمان کر دے۔ یہ نہیں کیا کہ ان کی جانب توجہ فرمائی ہو اور تصرف کیا ہو بلکہ دعا فرمائی اگر تصرف ہوتا تو دو کا نام نہ لیتے کیونکہ تصرف میں یکسوئی لازم ہے۔ ایک کو معین کرکے جب تک اس کی طرف کامل توجہ نہ کی جاوے کچھ نہیں ہوتا ...... حق تعالےٰ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بارہ میں دعا قبول فرمائی اور وہ مسلمان ہو گئے۔ غرض یہ تو آیا ہے کہ حضور نے ہدایت کی دعائیں فرمائی ہیں۔ چنانچہ احادیث ان دعاؤں سے مملو و مشحون ہیں اور یہ بہت کم منقول ہے کہ تصرف کیا ہو۔ اسی واسطے میں نے اوپر باذن الٰہی کی شرط و قید ذکر کر دی ہے۔ اس لئے کہ تصرف بھی حضور نے گاہ گاہ فرما دیا ہے۔ چنانچہ آیا ہے کہ آپ نے بعض صحابہ کے سینہ پر ہاتھ مارا۔ ان کا شبہ زائل ہو گیا۔ ایک صحابی گھوڑے پر سوار نہ ہو سکتے تھے۔ آپ نے ان کے سینہ پر ہاتھ مارا وہ سوار ہونے لگے سینہ پر ہاتھ مارنا یہ قرینہ اس کا ہے کہ یہ فعل تصرف ہے اور اگر کسی کی سمجھ میں اس کی کوئی اور توجیہ آجاوے تو پھر استثنا کی حاجت نہیں ہے انبیا کے تصرف نہ فرمانے کا حکم اپنے عموم پر رہیگا۔ بہر حال اگر ثابت بھی ہو جاوے تو شاذ ہے اور شاذ پر حکم نہیں ہوا کرتا سنت

لہ بھری ہوئی اور مجری ہیں۔

وہ ہے جس پر حضور نے مواظبت[1] فرمائی ہو مثلاً آپ نے قبا پہنی تھی اس میں سونے کی گھنڈیاں[2] تھیں تو یہاں کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہ سنت ہے۔ بیان جواز کے لئے آپ نے ایسا کیا۔ اسی طرح یہاں بھی کہا جائیگا کہ سنت تو دعا کرنا ہے اور بیان جواز کے لئے شاذ نادر تصرف بھی فرمایا ہے۔

رجوع بجانب عمر حج (انبیا علیہم السلام کو نہ دین کے اندر غلو ہوتا ہے الخ)

اسی طرح عیسیٰ علیہ السلام کے بارہ میں شبہ مغلوب الحال ہونے کا نہ کیا جاوے۔ جیسا کہ واضح ہو گیا۔ اب رہی یہ بات کہ جب یہ نہ غلو فی الدین ہے اور نہ غلبہ حال ہے تو پھر اس حدیث کی کیا توجیہ ہے کیونکہ ظاہراً تو یہ عقل کے خلاف معلوم ہوتا ہے کہ صریح چوری کرتے دیکھ رہے ہیں اور پھر اپنے مشاہدہ کی تکذیب کر رہے ہیں اور عقل کے خلاف ہونے سے خود حدیث کی صحت مخدوش ہو گئی۔

---

[1] ہمیشگی

[2] جو زری کی بنی ہوئی ہوتی ہیں۔ کیونکہ وہ تو کپڑے کا جز ہیں اور مستقل چیز نہیں وہ سونے چاندی کے مرد کو جائز نہیں۔

عقل و درایت خدا تعالےٰ پر حاکم نہیں

اور منجملہ اس شبہ کا یہ ہے کہ آج کل ایک جماعت پیدا ہو گئی ہے انہوں نے کچھ اصول درایتہ[1] کے تراشے ہیں اور احادیث کو ان اصول پر منطبق کرتے ہیں اور عدم انطباق کے وقت حدیث کے معنی میں تحریف کرتے ہیں یا حدیث کا انکار کر دیتے ہیں انہوں نے عقل و درایت کی حکومت کو اس قدر عام مانا ہے کہ اللہ تعالےٰ پر بھی اس کو حاکم بنا دیا۔ خوب سمجھ لو کہ اول تو درایت یا وجود حاکم ہونے کے خدا تعالےٰ پر حاکم نہیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے آگ میں نہ جلنے کو خلاف درایت بتلاتے ہیں کہ ہماری سمجھ میں نہیں آتا۔ اس لئے خدا تعالےٰ نے اس کو واقع نہیں کیا عجب بات ہے تمہاری سمجھ میں نہ آنے سے یہ کیسے لازم آیا کہ اس کا وقوع بھی نہیں ہو۔ درایت خدا تعالےٰ کے قبضہ میں ہے خدا تو درایت کے قبضہ میں نہیں۔ مولانا روم نے ایسی ہی ایک حکایت لکھی ہے جس میں وجہ درایت کی بھی بتلائی ہے کہ ایک بادشاہ نے بڑی بڑی گھاٹیاں آگ سے بھروا رکھی تھیں جو بت پرستی نہ کرتا تھا۔ اس کو آگ میں پھینک دیتا تھا۔ ایک موحد عورت آئی اس کے پاس ایک بچہ تھا اس عورت کو کہا کہ

---

[1] عقل کے مطابق ہونے کے

تو بت کو سجدہ نہ کرے گی تو اس بچہ کو آگ میں پھینک دیں گے
اس نے صاف انکار کر دیا۔ چنانچہ اس بچہ کو آگ میں پھینک دیا۔
اس بچہ نے آگ میں سے ماں کو ندا دی۔ ؎

اندر آ مادر کہ من اینجا خوشم [1]	گرچہ در صورت میان آتشم
اندر آ اسرار ابراہیم بیں [2]	کو در آتش یافت ورد و یاسمیں
اندر آئید اے مسلماناں ہمہ [3]	غیر عذب دیں عذاب ست آں ہمہ

چنانچہ ماں بھی آگ کے اندر کود پڑی اور مسلمانوں نے گرنا شروع
کیا اور سب صحیح سالم رہے آخر بادشاہ نے جھلا کر آگ کو خطاب
کیا کہ اے آگ تجھ کو کیا ہوا تو آگ نہیں رہی۔ آگ نے جواب دیا ؎

گفت آتش من ہمانم آتشم [4]	اندر آ تا تو بہ بینی تا بشم
طبع من دیگر نگشت و عنصرم	تیغ حقم ہم بدستوری برم

مولانا اس کا راز فرماتے ہیں جس میں درایت کی وجہ بتلائی ہے۔

---

[1] اماں اندر آ جاؤ کیونکہ میں یہاں خوش ہوں گو صورت میں آگ
کے اندر ہوں [2] اندر آ جاؤ اور ابراہیم علیہ السلام کے راز دیکھو کہ جنہوں نے
آگ کے اندر گلاب و چنبیلی پائی تھی [3] اندر آ جاؤ اے سب کے سب مسلمانو
کیونکہ دین شیریں کے سوا اور تو سب کچھ عذاب ہی ہے [4] آگ نے کہا میں تو
وہی آگ ہوں تو اندر آ جا تا کہ میرے جلانے کو دیکھ لے [5] نہ میری طبیعت دوسری ہوئی
نہ میرا خمیر میں تو حق کی تلوار ہوں اجازت سے ہی کاٹا کرتی ہوں۔

خاک و باد و آب و آتش بندہ اند
با من و تو مردہ با حق زندہ اند

پس آگ بے شک فاعل ہے مگر کب تک جبتک کہ اللہ تعالیٰ اس کو معطل نہ فرما دیں اور جب معطل فرما دیں کسی کام کی نہیں جیسے تحصیلدار حاکم ہے جب تک معطل نہ ہو جب معطل ہو گیا تو جیسے اور ہیں ویسا ہی وہ بھی ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو آگ نے نہیں جلایا اس لئے کہ اس کو حکم ہو گیا یا نار کونی بردا وسلاما علی ابراہیم" پس گو یہ ظاہراً خلاف درایت ہے لیکن خود یہ حکم درایۃ کا کہ النار محرقۃ حق تعالےٰ پر تو حجت نہیں۔

ہم لوگوں کی درایۃ ناتمام ہے اسواسطے ہم کو بعض احکام خلاف درایۃ معلوم ہوتے ہیں

دوسرے آپ کی درایت بھی تو ناتمام ہے چنانچہ آپکی درایت

لے مٹی ہوا پانی آگ سب انہی کے بندے ہیں میرے تمہارے سامنے مردہ مگر حق تعالےٰ کے سامنے زندہ ہیں ۔ ےہ اے آگ تو ٹھنڈی اور سلامتی بن جا ابراہیم علیہ السلام پر ۔ سہ آگ جلانے والی ہے ۔

تو صرف اس قدر ہے کہ حضرت عیسےٰ علیہ السلام کے قصہ کو آپ نے خلافِ درایۃ سمجھ لیا حالانکہ واقع میں یہ درایت کے کبھی خلاف نہیں ہے۔ اس لئے کہ سرقہ کی حقیقت یہ ہے اخذ مال الغیر خفیۃً اس کی تحقیق کے لئے چار چیزوں کی ضرورت ہے اول لینا۔ دوسرے مال کا لینا تیسرے غیر کا مال۔ چوتھے خفیہ لینا۔ آنکھ سے صرف اس قدر دیکھا جاتا ہے کہ خفیہ مال لینا مگر مال الغیر ہونا۔ یہ آنکھ سے کیسے معلوم ہوا ممکن ہے کہ وہ شے اسی کی ہو یا اس نے اجازت لے لی ہو تو حضرت عیسےٰ نے اول اس ہیئت کو دیکھ کر فرمایا کہ چوری کی ہے پھر اس کی قسم کے بعد دوسرا عقلی احتمال مستحضر ہو گیا کہ شاید یہ سرقہ نہ ہو اور یہ سمجھا ہو کہ اس ہیئت میں کوئی عارضی مصلحت ہو گی۔ آپ نے دیکھا کہ آپ کی عقل اس قدر ہے اسی طرح جن جن چیزوں کو آپ خلافِ عقل کہتے ہیں میں انشاء اللہ تعالےٰ ایک ایک کو عقل پر منطبق کر سکتا ہوں۔

کھانے کمانے کی عقل کوئی عقل نہیں ہے

ہم اور آپ عاقل نہیں ہیں ہاں آکل ہیں یعنی ہم کو کھانے کی عقل ہے مثل بہائم کے چنانچہ بعض جانور اپنے کھانے پینے کی ایسی تدبیر کرتے ہیں کہ عقلاء بھی نہیں کر سکتے۔ ریگزاروں میں سنا ہے کہ ریت کے اندر تربوز چھپے رہتے ہیں بھیڑیوں کو جب پیاس لگتی ہے تو ریت

کو کریدکر تربوز نکال کر کھا لیتے ہیں اور آدمی کو تلاش سے بھی نہیں ملتے اس کھانے پینے کی تدبیروں کو لوگ ترقی کہتے ہیں۔ ترقی یہ ہوئی کہ بیل کے برابر ہو گئے۔ حضرت یہ ترقی نہیں ہے ترقی یہ ہے کہ خداوند تعالےٰ نے تم کو عقل دی ہے اس کو دین کے کاموں میں صرف کرو کھانے پینے کی عقل تو جانوروں کو بھی ہوتی ہے بلکہ تم سے زیادہ ہوتی ہے اس پر تو چاہیئے کہ وہ زیادہ ترقی یافتہ ہوں اگر یہی ترقی ہے تو ہم میں اور جانوروں میں فرق کیا ہوگا۔

رجوع بجانب سرخی (سمع بصر قلب جوارح کی حفاظت کا حکم)

یہ قصہ ہے عیسےٰ علیہ السلام کا انہوں نے کس قدر احتیاط فرمائی اور لاتقف ما لیس لک بہ علم پر کیسا عمل کیا ہم لوگوں کی حالت یہ ہے کہ ذرا سے شبہ میں چور کہہ دیتے ہیں محض قرائن سے کسی کو چور کہہ دینا نہایت برا ہے۔

کسی عمل سے چور کا نام معلوم کر کے اس پر چوری کا الزام لگانا جائز نہیں

اس پر ایک اور مضمون یاد آگیا کہ بعض لوگ چور کے معلوم کرنے

کے واسطے ایک عمل لوٹا گھمانے کا کیا کرتے ہیں اس پر سورہ یٰسین شریف پڑھتے ہیں جس کے نام پر لوٹا گھوم جائے اس کو یقیناً چور سمجھتے ہیں۔ اور اس عمل میں غلطی کا احتمال ذرا نہیں سمجھتے اور کہتے ہیں کہ یہ قرآن کا عمل ہے یاد رکھو کہ یہ حرام ہے شریعت میں بلا اپنے دیکھے یا دو عادل کی گواہی بغیر کسی کو چور سمجھنا ممنوع ہے اور یہ جو کہتے ہیں کہ قرآن کا عمل غلط نہیں ہو سکتا اس میں مغالطہ ہے۔ یہ عمل اگر قرآن کا مدلول ہوتا تو واقعی یقینی ہوتا اور یہی معنی ہیں اس کے کہ قرآن میں احتمال غلطی کا نہیں اور ظاہر ہے کہ یہ عمل قرآن کا مدلول نہیں خود تمہارا گھڑا ہوا ہے اگر کوئی شخص ایک بڑا سا قرآن لے کر کسی کے سر پر مار دے اور وہ زخمی ہو جاوے تو کیا کوئی شخص یہ کہہ سکتا ہے کہ یہ عمل جائز ہے کیونکہ قرآن کے ذریعہ سے ہوا ہے۔

رجوع بجانب شرح رسمع بصر قلب جوارح کی حفاظت کا حکم)

حاصل یہ ہے کہ وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ میں بطریق مذکور زبان کی حفاظت کا حکم بھی داخل ہو گیا اور ہاتھ کی حفاظت اس طور سے داخل ہوئی کہ بلا تحقیق جرم کسی پر ظلم کرنا حرام ہے اور اس میں مخالفت ہوئی وَلَا تَقْفُ الآیہ کی اسی طرح پاؤں کی حفاظت

بھی داخل ہے کہ بلا تحقیق جواز شرعی کسی ناجائز مجمع میں جانا حرام ہے اسی طرح سب جوارح کی حفاظت اس میں داخل ہو گئی اور سمع و بصر و فواد کی حفاظت تو بالتصریح ہی اس میں مذکور ہے مثلاً کان کو غیر مشروع اصوات و مضامین سے بچانا آنکھ کو غیر محارم کی طرف نظر کرنے سے بچانا قلب کو گمان بد وغیرہ سے بچانا۔

معصیت سے بچا رہنا بڑی کرامت ہے

حکایت: حضرت جنیدؒ کی یہ حالت تھی کہ ایک شخص آپ کا امتحان کرنے آیا اور دس برس تک آپ کے پاس رہا مگر معتقد نہ ہوا۔ ایک روز کہنے لگا کہ میں نے آپ کی بزرگی کی شہرت سنی تھی لیکن میں دس برس سے آپ کے پاس ہوں اس مدت میں میں نے آپ کی کوئی کرامت نہیں دیکھی۔ آپ نے فرمایا کہ تو نے اس مدت میں جنیدؒ کو کسی گناہ صغیرہ یا کبیرہ میں مبتلا دیکھا اس نے جواب دیا کہ گناہ تو کوئی نہیں دیکھا۔ آپ نے فرمایا کہ جنیدؒ کی یہ کچھ چھوٹی کرامت ہے کہ دس برس تک اس سے خدا کی مرضی کے خلاف نہ ہو۔

کوئی شخص کیسے ہی درجہ کو کیوں نہ پہنچ جائے احکام شرعی اُس سے ساقط نہیں ہوتے

حکایت: علی ہذا ایک دوسرا واقعہ ان کا مشہور ہے کہ ان کے زمانہ میں چند مدعیان تصوف کا یہ قول آپ کے پاس پہنچا کہ وہ کہتے ہیں نحن وصلنا فلا حاجۃ لنا الی الصیام والصلوٰۃ آپ نے سن کر فرمایا صدق توافی الوصول ولکن الی السقر اور پھر فرمایا کہ اگر میں ہزار برس زندہ رہوں تو نفل عبادت بھی بدون عذر شرعی ترک نہ کروں۔

بزرگوں کی خدمت میں اصلاح کی نیت سے جانا چاہیئے اُن کے پاس جا کر دنیا کے قصے نہ شروع کر دینے چاہئیں

بعض لوگ بزرگوں کی خدمت میں جاتے ہیں لیکن نیت اُن کی محض وقت پورا کرنا اور دل بہلانا ہوتی ہے اور علت اس کی یہ ہے کہ بزرگوں کے پاس جا کر دنیا بھر کے قصے جھگڑے اخبار

شروع کر دیتے ہیں ایسے لوگ اپنا بھی نقصان کرتے ہیں اور اُن بزرگ کا بھی وقت ضائع کرتے ہیں۔

طالب کو ثمرہ کا انتظار اور کسی حالت میں مایوسی نہ چاہیئے

بعض لوگ ایسے بھی ہیں کہ وہ اصلاح ہی کی نیت سے جاتے ہیں لیکن عجلت پسند ہونے کی وجہ سے چاہتے ہیں کہ وہ ہی دن میں ہماری اصلاح ہو جائے ان لوگوں کی بالکل وہ مثال ہے کہ الحائک اذا صلی یومین انتظر الوحی ایسے لوگوں کے جواب میں ہمارے حضرت حاجی صاحبؒ فرمایا کرتے تھے کہ یہ کیا کم فائدہ ہے کہ تم کو خدا کے نام لینے کی توفیق ہو گئی اور فرمایا کرتے تھے کہ بھائی اگر واقعی کچھ بھی حاصل نہ ہو تب بھی طلب نہ چھوڑنی چاہیئے ے

یابم اورا یا نیابم جستجوئے می کنم
حاصل آید یا نیاید آرزوئے می کنم

طالب خدا کی یہ شان ہے کہ سو دفعہ اس کو یہ آواز آئے کہ تو دوزخی ہے تب بھی اُس کو مایوسی نہ ہو۔

حکایت: ایک بزرگ کے پاس شیطان آیا اور کہا کہ تم کو عبادت کرتے اتنے دن ہو گئے نہ پیام ہے نہ سلام پھر

اس سے کیا نفع وہ معمول چھوڑ کر سو رہا۔ خواب میں حضرت خضر علیہ السلام آئے اور وجہ پوچھی۔ اس نے کہا کہ نہ لبیک ہے نہ بیک ہے پھر کیسے دل بڑھے جواب ارشاد ہوا کہ ؎

گفت آں اللہ تو لبیک ماست

وین نیاز و سوز و دردت پیک ماست

حکایت : ایک بزرگ کی حکایت شیخ سعدی علیہ الرحمۃ نے لکھی ہے کہ وہ ذکر کرتے بیٹھے تو یہ آواز آئی کہ تم کچھ بھی کرو۔ یہاں کچھ قبول نہیں مگر وہ پھر کام میں لگ گئے ان کے ایک مرید نے کہا کہ جب کچھ نفع ہی مرتب نہیں تو محنت سے کیا فائدہ بزرگ نے جواب دیا کہ بھائی اگر کوئی دوسرا ایسا ہوتا کہ میں خدا کو چھوڑ کر اس کی طرف متوجہ ہو جاتا تو اعراض ممکن بھی تھا۔ اب تو یہی ایک در ہے قبول ہو یا نہ ہو ؎

توانی ازاں دل بپرداختن   کہ دانی کہ بے او تواں ساختن

اس جواب پر رحمت خداوندی کو جوش ہوا اور ارشاد ہوا کہ ؎

قبول ست گرچہ ہنر نیستت   کہ جز ما پناہی دگر نیستت

غرض طالب کو ہر حال میں طلب میں مشغول رہنا چاہئے اور یہ حالت ہونی چاہیئے ؎

اندریں رہ می تراش و می خراش   تا دم آخر دمے فارغ مباش

تا دم آخر دمے آخر بود   کہ عنایت با تو صاحب سر بود

کامل کی پہچان

البتہ اس موقع پر اس کی ضرورت ہے کہ کامل کی کوئی پہچان بتلائی جائے کیونکہ آج کل بہت سے شیطان بھی لباس انسان میں ہیں مولانا فرماتے ہیں ؎

اے بسا ابلیس آدم روئے ہست
پس بہر دستے نباید داد دست

تو پہچان اس کی یہ ہے وہ شریعت کا ضروری علم رکھتا ہو. کسی کامل شیخ کی تربیت میں رہا ہو اور اس سے اجازت تربیت حاصل ہو. خود شریعت پر عامل ہو. شریعت کے خلاف پر اصرار نہ کرتا ہو. سنت کا پورا پابند ہو. اپنے متعلقین پر شفقت کرتا ہو. احتساب میں کمی نہ کرتا ہو. جس میں یہ سب باتیں جمع ہوں وہ کامل ہے اور ایسے ہی لوگوں کی نسبت کہا ہے ؎

یک زمانہ صحبتے با اولیا
بہتر از صد سالہ طاعت بے ریا

مساجد میں دنیا کا ذکر کرنا اسکو شر البقاع بناتا ہے

ایک مرتبہ لوگوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے

دریافت کیا کہ شرالبقاع کیا چیز ہے اور خیرالبقاع کون سی جگہ ہے۔ فرمایا مجھے معلوم نہیں۔ جبرائیل علیہ السلام سے پوچھا انہوں نے بھی یہی جواب دیا اور یہ کہا کہ دربارِ خداوندی سے دریافت کرکے جواب دوں گا چنانچہ وہ پوچھنے گئے اس وقت ببرکت اس مسئلہ کے پوچھنے کے حضور اقدس کے لئے ان کو اس قدر قرب ہوا کہ وہ فرماتے ہیں کہ مجھ کو کبھی اتنا قرب نہیں ہوا یعنی ستر ہزار حجاب درمیان میں رہ گئے غرض دربارِ خداوندی سے جواب ارشاد ہوا کہ شرالبقاع بازار ہے اور خیرالبقاع مسجد ہے سو غور کرنا چاہئے کہ دونوں میں مابہ الامتیاز کیا ہے بجز ذکراللہ و ذکرالدنیا کے پس معلوم ہوا کہ مسجد کا موضوع اصلی ذکراللہ ہے پس اُس میں ذکرالدنیا کرنا اسکو شرالبقاع بناتا ہے جو کہ اسکی ویرانی ہے۔

جو بات معلوم نہ ہو اُس میں ناواقفی کے اقرار سے شرمانا نہ چاہئے

اور اس جگہ پر آپ کے اور جبرائیل علیہ السلام کے لَا اَدرِی فرما دینے سے ان لوگوں کو عبرت حاصل کرنی چاہئے کہ جو باوجود نہ معلوم ہونے کے مسائل کا غلط سلط جواب دینے پر مستعد ہو بیٹھتے ہیں نیز وہ لوگ سمجھیں اور متنبہ ہوں جو باوجود کتاب کا مطلب نہ آنے

کے طالب علموں کو کچھ نہ کچھ جواب دئے چلے جاتے ہیں ۔ اور یہ نہیں کہہ دیتے کہ یہ مقام نہیں آتا جو نہ معلوم ہو کہہ دینا چاہئے کہ یہ نہیں معلوم ۔

حکایت : بزرجمہر سے کسی بڑھیا نے کچھ پوچھا ۔ اس نے جواب دیا کہ مجھے معلوم نہیں ۔ بڑھیا نے کہا کہ ہائیں تم بادشاہ کی اتنی تنخواہ کھاتے ہو اور یہ بات تم کو معلوم نہیں ۔ بزرجمہر نے جواب دیا تنخواہ تو مجھے معلومات کی ملتی ہے ۔ اگر مجہولات کی ملنے لگے تو بادشاہ کا سارا خزانہ بھی کافی نہ ہو ۔

دنیا میں حق تعالیٰ کی رویت کسی کو نہیں ہو سکتی اور نہ ان کی کنہ تک رسائی ہو سکتی ہے

اور حضرت جبرئیل علیہ السلام کا ستر ہزار حجاب کو کمال قرب کہنا قابل غور ہے کہ جو لوگ دنیا میں تھوڑا سا ذکر و شغل کر کے حق تعالیٰ کی رویت کی ہوس میں پڑتے ہیں کتنی بڑی غلطی ہے کیا جبرائیل علیہ السلام سے زیادہ قرب چاہتے ہیں اور اس سے بھی بڑی غلطی ہے اگر رویت سے بڑھ کر ذات کی کنہ کو ادراک کرنا چاہیں کیونکہ خداوند تعالیٰ کی ذات کی کنہ تک رسائی نہیں ہو سکتی ۔ اس لئے اس کو ہرگز نہ سوچنا چاہئے البتہ افعال خداوندی میں غور

اور تدبر کرنا چاہیئے تَفَكَّرُوْا فِی الٓاءِ اللّٰهِ وَلَا تَفَكَّرُوْا فِی ذَاتِهٖ
کسی بزرگ کا قول ہے۔

دور بینان بارگاہ الست — غیر ازیں پے نبردہ اند کہ ہست
آنچہ اندر راہ مے آید بدست — حیرت اندر حیرت اندر حیرت است

اے برتر از خیال و قیاس و گمان و وہم
وز ہر چہ گفتہ اند و شنیدیم و خواندہ ایم
دفتر تمام گشت و بپایاں رسید عمر
ما ہمچناں در اول وصف تو ماندہ ایم

ہاں البتہ قیامت میں حسب وعدہ رویت ذات بلا حجاب ہوگی اور حدیث میں جو آیا ہے کہ اس دن کوئی اور پردہ نہ ہوگا۔ بجز رداء الکبریا کے اس سے بلا حجاب ہونے پہ شبہ نہ ہو کیونکہ اس کے معنی بھی یہی ہیں کہ رویت تو بلا حجاب ہوگی مگر عظمت و جلال و کبریائی کی وجہ سے احاطہ نہ ہو سکے گا۔ ردائے کبریا اس کو فرمایا ہے۔ دنیا میں بلا حجاب رویت نہیں ہو سکتی۔ یہی عقیدہ اور مسئلہ شرعی ہے اور حضرت پیران پیر سیدنا شیخ عبد القادر جیلانی قدس سرہ العزیز کی طرف جو یہ شعر منسوب ہے کہ ع

بے حجابانہ در آ از در کاشانۂ ما

تو یہ مؤول مع حجاب محجوبین، نا قلین ہے یا قیامت کے روز کے لئے اشتیاق تھا کا اظہار فرماتے ہیں کیونکہ در آ صیغہ امر ہے

اور وہ استقبال کے لئے ہے اور اگر یہ شعر کسی اور شاعر کا ہو تو ہم کو ضرورت تاویل کی نہیں۔

پیر سے اگر کوئی بات خلافِ شرع ہو تو اس کو متنبہ کرے مگر ادب سے اور اس کا بیان کہ عاشقوں کی گستاخی عین ادب ہے

حکایت: حضرت سید احمد بریلوی رحمہ اللہ مولانا شہید رحمہ اللہ کے پیر ایک دن صبح کی نماز میں بوجہ نئی شادی ہونے کے ذرا دیر میں پہنچے۔ ان کے مرید مولوی عبدالحی صاحب نماز کے بعد وعظ فرمانے بیٹھ گئے۔ اس میں یہ بھی کہا کہ بعض لوگوں کا یہ حال ہے کہ جورو کی بغل میں پڑے رہتے ہیں اور تکبیر اولیٰ قضا ہو جاتی ہے جناب سید صاحب نے نہایت شکریہ ادا کیا اور فرمایا کہ اب ایسا نہیں ہوگا۔ اس بیان کے بعد فرمایا کہ مولوی عبدالحی صاحب نے باوجودیکہ ظاہراً یہ عنوان خلافِ ادب تھا اس واسطے اس عنوان سے کہنے کی جرأت کی تھی کہ ان کو معلوم تھا کہ سید صاحب کے دل میں اس سے میل نہ آئے گا بلکہ خوش ہوں گے اور ان کے خوش کرنے کو بے ادبی اختیار کی ہے۔

گفتگوئے عاشقاں در کار رب　　　جوشش عشق ست نے ترک ادب
با ادب تر نیست زو کس در نہاں　　　بے ادب تر نیست زو کس در جہاں

ایسا ہی قصہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالےٰ عنہا کا جو حدیث میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مجھے معلوم ہے کہ جب تم مجھ سے خفا ہوتی ہو اس وقت لَا وَ رَبِّ اِبْرَاهِیْمَ کہتی ہو اور جس وقت خوش ہوتی ہو اس وقت لَا وَ رَبِّ مُحَمَّدٍ کہتی ہو حضرت عائشہ نے فرمایا کہ لَا اَهْجُرُ اِلَّا اِسْمَکَ یعنی باتیں ایسی ہوتی ہیں کہ اگر کوئی اور کرے بے ادبی میں داخل ہو جائے بلکہ کفر ہو جائے مگر عاشق صادق جوش محبت اور علاقہ محبت سے کرتا ہے اس لئے وہ عفو ہوتی ہیں۔ حاصل یہ کہ ظاہرا باتیں بے ادبوں کی سی ہوتی ہیں اور باطنا ہوتی ہیں با ادب ؎

کار پاکاں را قیاس از خود مگیر　　　گرچہ ماند در نوشتن شیر و شیر
جملہ عالم زیں سبب گمراہ شد　　　کم کسے ز ابدال حق آگاہ شد
گفت اینک ما بشر ایشاں بشر　　　ما و ایشاں بستۂ خوابیم و خور
ایں ندانستند ایشاں از عمیٰ　　　درمیاں فرقے بود بے منتہا

احمد و بوجہل در بت خانہ رفت
زیں شدن تا آں شدن فرقیست ژرف

مسجد کی حاضری کے وقت کیا حالت ہونی چاہیئے اور اس کا بیان کہ اس حالت کے حصول سے

مایوس نہ ہونا چاہیئے

آداب مسجد کو بلا ارادہ تشبہ ایسا خیال کرنا چاہیئے جیسا کہ حاکم دنیوی کی حضوری میں قلب اور جوارح کی حالت ہوتی ہے کہ اس کا مصداق بن جاتا ہے ؎

یک چشم زدن غافل ازاں شاہ نباشی
شاید کہ نگاہ کند آگاہ نباشی

اتنا تو ہونا چاہیئے اور ایسی حالت اول تو ہر وقت ہو ورنہ حضوری مساجد کے وقت تو ضروری ہے اور ہر وقت حاصل ہونا اس حالت کا یوں نہ سمجھنا چاہیئے کہ بزرگان پیشین پر ختم ہو گیا۔ ہم کو کب ہو سکتا ہے۔

تو مگو مارا بداں شہ بار نیست　　با کریماں کارہا دشوار نیست

دیکھیئے صحابہ کی کیفیت ادب مسجد کی یہ تھی کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان دو شخصوں کو جو مسجد نبوی میں بلند آواز سے باتیں کر رہے تھے تنبیہہ فرمائی اور فرمایا کہ اگر تم باہر کے مسافر نہ ہوتے تو تمہیں

سزا دیتا۔ اَتَرْفَعَانِ اَصْوَاتَکُمَا فِیْ مَسْجِدِ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اور اس میں یہ شبہ نہ ہو کہ یہ حکم عدم رفع صوت مسجد نبوی کے ساتھ مخصوص ہے کیونکہ مساجد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہی ہیں چنانچہ فَلَا یَقْرَبَنَّ مَسَاجِدَنَا میں آپ نے جمیع مساجد کی نسبت اپنی طرف فرمائی۔ ہاں مسجد نبوی کا اور زیادہ ادب ہوگا. علاوہ ازیں یہ تو ہے ہی کہ اِنَّ الْمَسَاجِدَ لِلّٰہِ الخ اور جب اللہ کی ہوئیں تو یہ ادب کو بدرجہ اولیٰ مقتضی ہوگا اور جس طرح مسجد قابل ادب ہے ایسے ہی اہل مسجد کا ادب بھی ضروری ہے وہ یہ کہ ایسی کوئی حرکت نہ کرے جس سے اہل مسجد کو تاذی ہو مثلاً یہ خیال رکھنا چاہیئے کہ ایسی جگہ نہ کھڑا ہو جہاں اور آنے جانے والوں کو تکلیف ہو کیونکہ اس میں تکلیف ہے ذاکرین کو علیٰ ہذا ذکر جہر جس وقت کوئی اور شخص نماز پڑھ رہا ہو نہ کرنا چاہیئے کیونکہ اسکی نماز میں خلل ہوگا اور اس کو تکلیف ہوگی اس کی وجہ یہ لکھی ہے کہ مسجدیں بموجب ارشاد نبوی رِیَاضُ الْجَنَّۃِ ہیں اور جنت میں آزار تکلیف نہ ہونا چاہیئے۔ ؎

بہشت آنجا کہ آزارے نباشد
کسے را با کسے کارے نباشد

دعا کے آداب اور اس کا بیان کہ دعاء میں محض معنی ہی مقصود ہیں بخلاف اور عبادات کے کہ ان کے اندر ایک درجہ میں صورت بھی مقصود ہے اور

بے دینوں کے ایک شبہ کا جواب

وَقَالَ رَبُّكُمُ ادْعُونِي أَسْتَجِبْ لَكُمْ ط إِنَّ الَّذِينَ يَسْتَكْبِرُونَ عَنْ عِبَادَتِي سَيَدْخُلُونَ جَهَنَّمَ دَاخِرِينَ o اس آیت کے مضمون ہی سے سمجھ میں آگیا ہوگا کہ مقصود بیان تنبیہات متعلقہ دعاء ہے اور شاید کسی کو یہ خیال ہو ہم تو دعا کیا کرتے ہیں اور اس کی ضرورت وغیرہ کو بھی جانتے ہیں پھر کیوں تنبیہ کی جاتی ہے کیونکہ تنبیہ تو اس امر میں ضروری ہے جس کو جانتا نہ ہو یا کرتا نہ ہو سو ضرورت تنبیہ کی یوں ہے کہ باوجود جاننے اور کرنے کے بھی جب دعاء کے بارہ میں تغافل برتا جاتا ہے یعنی اس کے ضروری آداب و شرائط سے بے پروائی کی جاتی ہے تو اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نہ جانی ہوئی چیزوں سے بھی بڑھ کر کوئی قوی حجاب ہے کیونکہ جہولات میں تو صرف جہل حجاب ہے کہ اس کا رفع ہونا سہل ہے اور جانی ہوئی

چیز میں جب ایسا معاملہ کیا جائے تو وہ حجاب زیادہ سخت ہوگا.
اور ہرچند کہ یہ تغافل اور قلب کا حاضر نہ ہونا سب عبادات میں قبیح
ہے مگر دعا میں اقبح ہے وجہ یہ کہ عبادات میں گو اصل مقصود معنیٰ ہے
مگر تاہم ایک درجہ میں صورت بھی مقصود ہے بخلاف دعا کے کہ اس
میں صرف معنی ہی مقصود ہے اور وہ نیاز و افتقار و انکسار و
خشوع قلب ہے جب یہ بھی نہ ہوا تو وہ دعا کیا ہوئی۔ بیان اس کا
یہ ہے کہ مثلاً نماز ہے کہ قرآن سے اس میں علاوہ مقصود معنوی یعنی
توجہ الی اللہ کے صورت بھی مراد اور مطلوب ہے کہ اس کے قیود ظاہری
سے مفہوم ہوتا ہے مثلاً وضو، جہتِ قبلہ، وقت، تعین رکعات وغیرہ
اب اگر کوئی شخص بغیر حضور قلب کے رکوع و سجود وغیرہ شرائط سے
نماز پڑھ لے تو گو مقصود معنوی توجہ الی اللہ اس میں نہیں ہوئی مگر فقیہ
عالم یہی حکم دے گا کہ فرض ادا ہوگیا۔ اس سے ثابت ہوا کہ صورت
بھی کسی درجہ میں مطلوب ہے اور اسی کے تحقق سے صحت صلوٰۃ کا
فتوے صحیح ہوا۔ اس تقریر سے ان بدینوں کا یہ شبہ بھی رفع ہوگیا جو
کہا کرتے ہیں کہ صاحب دل تو حاضر نہیں پھر نماز کیا پڑھیں معلوم ہوا
کہ علاوہ حضور قلب کے کہ معنی اور حقیقت ہے نماز کی یہ صورت ظاہری
رکوع سجود بھی مقصود ہے۔ دوسری نظیر لیجئے روزہ سے مقصود معنوی
قوت بہیمیہ کا توڑنا اور مغلوب کرنا مطلوب ہے مگر باں ہمہ اگر کوئی شخص
سحری کو ایسا پیٹ بھر کھائے کہ افطار تک اس کو بھوک ہی نہ لگے تو

اس صورت میں قوت بہیمیہ تو کچھ بھی نہیں ٹوٹی مگر روزہ کی چونکہ ظاہری صورت پوری ہوگئی ہے روزہ صحیح ہوگیا۔ تیسری نظیر اور لیجئے زکوٰۃ کہ مقصود معنوی اس سے اغناء مساکین ہے مگر بایں ہمہ اس کے لئے ایک خاص مقدار ایک خاص وقت معین ہے جس سے مقصودیت صورت ایک درجہ میں یہاں بھی ثابت ہوتی ہے۔ کیونکہ صرف اغناء تو ان امور پر موقوف نہیں لیکن دُعا میں نہ کسی وقت کی شرط نہ زبان عربی کی شرط نہ کسی خاص جہت کی شرط نہ کوئی مقدار معین نہ وضو وغیرہ کی قید اس میں صرف عاجزی نیازمندی اپنی احتیاج کا اظہار اپنے مولیٰ کے آگے بس یہ کافی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہاں صورت پر بالکل نظر نہیں معنی ہی معنی مقصود ہیں بس اب یہ صرف زبانی دُعا کہ آموختہ سا رٹا ہوا پڑھ دیا نہ خشوع نہ خشیت نہ دل میں اپنی عاجزی کا تصور یہ خالی از معنی دُعا کیا ہوئی۔

دُعا میں حضورِ قلب کی ضرورت اور بغیر حضورِ قلب کے دُعا کی مثال

اس بے توجہی کی مثال تو ایسی ہوئی جیسا کوئی شخص کسی حاکم کے ہاں عرضی دینا چاہے اور اس طور پر عرضی پیش کرے کہ حاکم کی طرف پیٹھ کرے اور منہ اپنا کسی دوست یار کی طرف کرکے اس

عرضی کو پڑھنا شروع کرے۔ دو جملے پڑھ لئے پھر یار دوست سے ہنسی مخول کرنے لگے پھر دو جملے پڑھ دیئے اور ادھر مشغول ہو گئے اب سوچ لینا چاہیئے کہ حاکم کی نظر میں ایسی عرضی کی کیا قدر ہوسکتی ہے بلکہ اُلٹا یہ شخص قابل سزا ٹھہرایا جائے گا۔ بس یہی معاملہ ہے دُعا کا دُعا میں جب تک کہ پورے طور پر قلب کو حاضر نہ کرے گا اور عاجزی اور فروتنی کے آثار اس پر نمایاں نہ ہوں گے وہ دُعا دعا نہیں خیال کی جاسکتی۔ کیونکہ اللہ تعالےٰ تو قلب کی حالت کو دیکھتے ہیں ؎

ما بروں را ننگریم و قال را | ما دروں را بنگریم و حال را
ناظر قلبیم گر خاشع بود | گرچہ گفت لفظ ناخاضع بود

حدیث شریف میں ہے اِنَّ اللّٰہَ لَا یَنْظُرُ اِلٰی صُوَرِکُمْ وَلٰکِنْ یَنْظُرُ اِلٰی قُلُوْبِکُمْ غرض یہ بات پورے طور پر ثابت ہو گئی کہ دعا میں حضور اور خشوع ہی مقصود ہے اگر بے اس کے بھی کسی کی دُعا قبول ہو جائے تو اس کو یہ سمجھنا چاہیئے کہ یہ خداوند تعالےٰ کا محض ابتدائی احسان ہے دُعا کا اثر نہیں۔

دُعاء کے امر میں اہتمام اور حکماء کی ایک بے عقلی

یہ ایک تمہید تھی مضمون دُعاء کی اب آیت کا مضمون سنئے

اللہ تعالےٰ جل جلالہٗ نے اس آیت میں بڑے اہتمام سے دُعا کا مضمون بیان فرمایا ہے. چنانچہ شروع میں یہ تصریح فرمائی کہ وَقَالَ رَبُّکُمْ. حالانکہ پہلے سے معلوم تھا کہ یہ کلام اللہ تعالےٰ کا ہے مگر پھر اس کو اس لئے ظاہر فرما دیا کہ اسکی تاثیر نفس میں قوی ہو جائے اور مضمون مابعد کی وقعت دلوں میں زیادہ ہو پھر لفظ رَبُّکُمْ ارشاد فرمایا اس میں بوجہ اظہارِ ربوبیت گویا اشارہ ہے۔ دُعا کے قبول کر لینے کا اس طور پر کہ چونکہ ہم ہمیشہ سے تمہاری پرورش کرتے آئے ہیں. حتےٰ کہ بدون تمہاری درخواست کے بھی کی ہے تو کیا تمہاری عرض کو درخواست کرنے پر بھی قبول نہ کریں گے۔

ما نبودیم و تقاضا ما نبود — لطف تو ناگفتۂ ما مے شنود

آیت اِذْ اَنْشَاَکُمْ مِّنَ الْاَرْضِ وَ اِذْ اَنْتُمْ اَجِنَّۃٌ فِیْ بُطُوْنِ اُمَّھٰتِکُمْ الخ میں اسی تربیت بے درخواست کا ذکر فرمایا ہے اس کے بعد پیدائش کے بعد کی حالت قابلِ غور ہے کہ یہ حالت ایسی تھی کہ کسی قسم کی تمیز اور شعور اس وقت تک نہ ہوا تھا اس حالت میں اگر تمام دنیا کے حکماء سقراط بقراط وغیرہ اکٹھا ہو کر صرف اتنی ہی تدبیر کرنا چاہیں کہ بچہ دودھ پینا سیکھ جائے تو ہرگز وہ قیامت تک اس پر قادر نہیں ہو سکتے۔ یہ اسی قادر ذوالجلال کی حکمت اور اس کی رحمت اور عنایت ہے کہ اس نے بچے کو دُودھ چوسنا سکھایا. حکماء کہیں گے کہ یہ خود طبیعت کا فعل

ہے مگر جبکہ خود وہ طبیعت ہی کو بے شعور مان چکے ہیں تو ایسے پرحکمت کاموں کا اس کی طرف منسوب کرنا بے شعوری نہیں تو اور کیا ہے تیسرا اہتمام وَلٰکِنْ یُّؤَخِّرُھُمْ کی اضافت ہے گویا فرماتے ہیں کہ ہم تمہارے ہی ہیں تم ہم سے مانگو اور اسی کی نظیر دوسری آیت میں اضافت ہے وَلَوْ یُؤَاخِذُ اللّٰہُ النَّاسَ الی قولہ بِعِبَادِہٖ بَصِیْرًا حالانکہ یہاں عباد ماخوذین کا ذکر ہے مگر ان کو بھی اپنی طرف مضاف فرماتے ہیں سبحان اللہ کیا رحمت ہے۔

آیت وَلَوْ یُؤَاخِذُ اللّٰہُ النَّاسَ الخ کے متعلق ایک عجیب تحقیق

اس آیت کے متعلق ایک فائدہ علمیہ تفسیریہ سمجھنے کے قابل ہے کہ آدمیوں کے مواخذے کی تقدیر پر تمام دواب کے ہلاک کو کیسے مرتب فرمایا تو وجہ اسکی یہ ہے کہ سب چیزیں انسان ہی کے لئے پیدا ہوئی ہیں جیسا کہ ارشاد ہے ھُوَ الَّذِیْ خَلَقَ لَکُمْ مَّا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا یعنی تمام چیزیں جو زمین میں ہیں تمہارے لئے پیدا کی ہیں خواہ ان کا نفع بلاواسطہ تم کو پہنچے یا واسطہ در واسطہ پس چونکہ انسان کے لئے ہی سب چیزیں پیدا کی گئی ہیں اس لئے انسان اگر گناہ پر ہلاک کیا جاتا تو دوسری چیزیں بھی اس لئے ہلاک

کی جاتیں کہ جب وہی نہ رہا، جس کے لئے یہ سامان تھا تو پھر اس سامان کی کیا ضرورت جب آدمی نہ ہو تو پھر خیمے ڈیرے و دیگر اسباب سامان کس کام کے البتہ یہ شبہ اور باقی رہ گیا کہ بُروں کو تو ان کے بُرے کام کی سزا ملتی ہے اور نیک آدمیوں کو کیوں ہلاک کیا جاتا، سو اس کا جواب یہ ہے کہ اچھے آدمی قدر قلیل ہوتے ہیں اور انسان کی ضرورتیں تمدن و آسائش کے متعلق اس کثرت سے ہیں کہ تھوڑے آدمی ہرگز اس کو پورا نہیں کر سکتے۔ پھر اگر بُروں کے بعد نیک زندہ رہتے تو ان کو جینا وبال ہو جاتا۔ ان کے لئے یہ مرنا ہی مصلحت و رحمت ہوتا۔

دعاء اگر دنیائی مباح کے لئے ہو وہ بھی عبادت ہے بخلاف اور عبادات کے اور اس کا راز اور فناء الفنا کی توضیح ایک مثال سے

ایک خصوصیت خاص دُعا میں اور عبادات سے زیادہ یہ ہے کہ اور جتنی عبادتیں ہیں اگر دنیا کے لئے ہوں تو عبادات نہیں رہتیں ہیں مگر دعا ایک ایسی چیز ہے کہ یہ اگر دنیا کے لئے ہی ہو تب بھی عبادت ہے اور ثواب ملتا ہے مثلاً مال مانگے دولت مانگے یا اور کوئی

دنیوی حاجت مانگے جب بھی ثواب کا مستحق ہے گا برخلاف
اور عبادات کے کہ اگر ان میں دنیوی حاجت مطلوب ہو تو ثواب
نہیں ملتا چنانچہ حجۃ الاسلام امام غزالی رح نے لکھا ہے کہ اگر طبیب نے
کسی کو رائے دی کہ تم آج دن کا کھانا نہ کھاؤ اگر کھایا تو ضرر دیگا
اس نے کہا لاؤ آج روزہ ہی رکھ لیں بس، روزہ رکھ لیا تو اس کو
خالص روزے کا ثواب نہ ملے گا کیونکہ اس کو دراصل روزہ رکھنا
مقصود نہیں ایسے ہی کوئی شخص مسافرت میں اس نیت سے مسجد
کے اندر اعتکاف کرلے کہ سرائے کے کرایہ وغیرہ سے بچوں گا تو اس
کو خالص ثواب اعتکاف کا نہ ملے گا مگر دعا میں یہ بات نہیں چاہے
کتنی ہی حاجتیں دنیوی مانگو مگر پھر بھی ثواب ملے گا۔ اور دعا میں
یہ خصوصیت اس لئے ہے کہ دعا سراسر نیازمندی ہے اور عجز و انکسار
اور اظہار عبدیت و احتیاج اور یہ دنیا کے مانگنے کے وقت بھی
متحقق ہے اور نیازمندی خود ایک بڑا محبوب عمل ہے کیونکہ جہاں
نیازمندی ہوگی وہاں کبر نہیں رہے گا اور کبر اور خودی بھی بڑا
مبغوض اور بڑا حائل ہے۔ چنانچہ حدیث قدسی میں ارشاد ہے کہ
اَلْکِبْرِیَاءُ رِدَائِیْ وَالْعَظَمَۃُ اِزَارِیْ ردا اور ازار سے مراد یہ کہ
دونوں میرے وصف خاص ہیں کہ کوئی دوسرا ان دو وصفوں کا
مدعی محقق نہیں ہو سکتا اور حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ
سے منقول ہے کہ انھوں نے ایک دفعہ منام میں جناب باری سے

سے عرض کیا کہ دُلَّنِیْ عَلٰی اَقْرَبِ الطُّرُقِ اِلَیْکَ جواب ارشاد ہوا دَعْ نَفْسَکَ وَتَعَالَ حافظ شیرازی رحمۃ اللہ علیہ نے اس مضمون کو کیا خوب فرمایا ہے فرماتے ہیں ؎

میان عاشق و معشوق ہیچ حائل نیست
تو خود حجاب خودی حافظ از میاں برخیز
تو در دگم شو وصال اینست و بس
گم شدن گم کن کمال اینست و بس

حاصل یہ کہ اپنی خودی کو مٹاؤ یہاں تک کہ اس مٹانے پر بھی نظر نہ رہے یعنی اس صفت فنا پر بھی نظر نہ رہے اور اس کا نام اصطلاح میں فَنَاءُ الْفَنَاءِ ہے اور اس کو شاعرانہ مضمون نہ سمجھا جائے کہ مٹانے کو بھی مٹاؤ اس کے نظائر تو روزمرہ واقع ہوتے ہیں چنانچہ اس مسئلہ فناء الفناء کی توضیح اس مثال سے اچھی طرح ہو سکتی ہے کہ اگر کسی کا کوئی دلربا معشوق ہو اور عاشق اس کے خیال میں مستغرق ہو اس حالت میں اس عاشق کو یہ خیال نہیں ہوتا کہ میں خیال کر رہا ہوں کسی کو یاد کیجئے اس یاد کی طرف ذرا بھی ذہن نہیں جاتا۔ آدمی سوتا ہے مگر اس وقت یہ خبر نہیں ہوتی کہ میں سوتا ہوں اور اگر یہ خبر ہو جائے تو وہ سوتا ہوا نہیں ہے۔

احوالِ عالیہ کے حصول سے مایوس نہ ہونا چاہئے اور ان کے حصول کی شرط

اور ان احوالِ عالیہ کو سُنکر یہ نااُمیدی نہ چاہئے کہ بھلا ہم کو یہ دولت کب میسّر ہو سکتی ہے۔ اللہ تعالےٰ کا فضل بڑا واسع ہے اس کو کچھ دشوار نہیں ؎

تو مگو مارا بداں شہ بار نیست — با کریماں کارہا دشوار نیست

البتہ ایسے احوال کے حصول کے لئے صحبتِ شیخ کی ضرورت ہے اور صحبت وہ چیز ہے کہ دیکھو انڈا کیا چیز ہے سفیدی اور زردی کے سوا اس میں کچھ بھی نہ تھا مگر مرغی کے سینے سے اس میں جان آ گئی تو کیا صحبتِ کاملین کی اس سے بھی گئی گذری؟ اور یہ وسوسہ بھی نہ ہو کہ صحبت تو ایسی چیز ضرور ہے مگر خود وہ لوگ کہاں ہیں جن کی صحبت میں یہ برکت ہو سو یقین کے ساتھ سمجھو کہ اب بھی اللہ تعالےٰ کے نیک بندے اس برکت کے موجود ہیں ؎

ہنوز آں ابرِ رحمت درفشان است

خم و خمخانہ با مہر و نشان است

دل سے میدان طلب میں آنا چاہئے۔ نرمی سوکھی روکھی آرزو سے کام نہیں چلتا۔ صدقِ طلب ہونی چاہئے اور کوشش ؎

گرچہ رخنہ نیست عالم را پدید
خیرہ یوسف وار مے باید دوید

یوسف علیٰ نبینا وعلیہ السلام کو کیسا اپنے مولیٰ پر بھروسا تھا کہ باوجود دروازے بند ہونے کے دوڑے اور کوشش کی اللہ تعالےٰ نے دروازے بھی کھول دئے اگر صدق دل سے طلب اور کوشش ہو تو مقصود ملنے کی یقینی امید ہے۔

رجوع بجانب سرخی (دعاء اگر دنیا کے لئے ہو وہ بھی عبادت ہے الخ)

غرض حاصل یہ ہے کہ دُعا کا خلاصہ نیازمندی ہے اور دُعاء خواہ کسی قسم کی ہو دینی ہو یا دنیوی ہو مگر ناجائز امر کے لئے نہ ہو سب عبادت ہے۔ خواہ چھوٹی سی چھوٹی چیز کی ہو یا بڑی چیز کی۔ حدیث میں یہاں تک آیا ہے کہ اگر جوتی کا تسمہ بھی ٹوٹ جائے تو خدا تعالےٰ سے مانگا کرو۔

اہل اللہ کبھی اظہارِ عبدیت کے لئے بے صبری کی صورت اختیار کرتے ہیں اور حضرت ایوب علیہ السلام کی شکایت مرض کی ایک لطیف توجیہ

حکایت: ایک بزرگ رو رہے تھے کسی نے پوچھا کیوں روتے ہو۔ فرمایا بھوک لگی ہے۔ اس نے کہا کیا بچے ہو کہ بھوک سے روتے ہو۔ انہوں نے فرمایا کہ جب مولے کی یہی مرضی ہو کہ میں بھوک سے روؤں تو پھر استقلال کیوں اختیار کروں ؎

گر طمع خواہد زمن سلطان دیں
خاک بر فرق قناعت بعد ازیں
نالم از آن ناخوشش آیدش
از دو عالم نالہ و غم بایدش

بعض اہل لطائف کا قول ہے کہ حضرت ایوب علیہ السلام کو جب یہ معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی مرضی ہے کہ میں مرض کی شکایت کا اظہار کروں تب فرمایا رَبِّ اِنِّیْ مَسَّنِیَ الضُّرُّ الخ ورنہ یہ اظہار بے صبری کی وجہ سے نہ تھا اگر بے صبری ہوتی تو اللہ تعالےٰ ان کی یوں تعریف نہ فرماتے اِنَّا وَجَدْنٰہُ

وَمَا بِرًّا نِعْمَا الْعَبْدُ الخ ؎

در نیابد حال پختہ ہیچ خام | پس سخن کوتاہ باید والسلام

کاملین کا مقصود صرف حق تعالیٰ کی رضا ہوتی ہے کیفیات باطنیہ پر ان کی نظر نہیں ہوتی

غرض ان کاملین کی نظر خدا تعالےٰ کی رضا پر ہوتی ہے اپنا حظ ظاہری یا باطنی کچھ مقصود نہیں ہوتا جس میں خدا تعالےٰ راضی ہوں وہی کرنے لگتے ہیں ؎

گفت معشوقے بعاشق اے فتا | تو بغربت دیدۂ بس شہرہا
پس کدامی شہر ازاںہا خوشتر است | گفت آں شہرے کہ دروے دلبر است
ہر کجا یوسف رخے باشد چو ماہ | جنت است او گرچہ باشد قعر چاہ
با تو دوزخ جنت است اے جانفزا | بے تو جنت دوزخ است اے دلربا

عاشقوں کی کچھ اور ہی شان ہے۔

ذکر سے اصلی مقصود اور اس سے قصد دنیا کی مذمت خصوص تسخیر کا عدم جواز

حکایت: حضرت حافظ محمد ضامن شہید علیہ الرحمۃ کی حکایت

ہے فرمایا کرتے کہ ہم تو اس واسطے ذکر کرتے ہیں کہ خدا تعالیٰ فرماتے ہیں کہ فَاذْکُرُوْنِیْ اَذْکُرْکُمْ یعنی احوال و کیفیات باطنی پر نظر نہ بھی دیکھئے محققین کی تو یہاں تک نگاہ ہے کہ خدا کے نام اور احکام میں کیفیات باطنی تک کا قصد نہ کریں اور افسوس آج کل لوگوں کا یہ حال ہے کہ وظائف تحصیل دنیا کے لئے پڑھتے ہیں کوئی دستِ غیب تلاش کرتا پھرتا ہے حالانکہ اس میں جواز تک بھی نہیں کیونکہ اس کے ذریعہ سے جو کچھ ملتا ہے۔ وہ حرام ہے کیونکہ جن مسخر ہو جاتے ہیں اور وہ لوگوں کا مال چرا چرا کر عامل کو دیتے ہیں۔ یا اگر اپنا ہائیں تب بھی مجبور ہو کر لاتے ہیں۔ ایسا ہی تسخیر قلوب کا حال ہے کیونکہ اس کے ذریعہ سے جو مال دیا جاتا ہے وہ طیب خاطر سے نہیں دیا جاتا مغلوب الرائے و مضطر ہو کر دیتا ہے۔

عملیات کی خرابیاں

اور اگر کسی عمل میں جواز بھی ہو تب بھی ایسے اغراض کے لئے اللہ تعالیٰ کے نام کی بے قدری کرنا اور بھی بے ادبی ہے اور احادیث میں سورہ واقعہ کا پڑھنا وغیرہ آیا ہے وہ دنیا کو معین دین بنانے کی غرض سے ہے جو کہ دین ہی ہے۔ کاش یہ لوگ بجائے ان اعمال کے دُعا کیا کرتے اگر مقصود حاصل ہو جاتا تو

بھی مطلب کا مطلب اور ثواب کا ثواب اور اگر نہ ہوتا تو بھی دُعا کا ثواب کہیں گیا ہی نہ تھا۔ مذکورہ بالا خرابیوں کے علاوہ عمل میں ایک اور بھی خرابی ہے کہ دُعا سے تو پیدا ہوتی ہے۔ عاجزی اور فروتنی اور عمل سے پیدا ہوتا ہے دعوئے عامل جانتا ہے کہ بس ہم نے یہ کردیا اور وہ کردیا۔

حکایت: مولانا فضل الرحمٰن صاحب گنج مرادآبادی علیہ الرحمۃ کا توگ ذکر کرتے ہیں کہ فرماتے تھے اگر صاحب نسبت عمل کرے تو نسبت سلب ہوجاتی ہے اس کی یہی وجہ ہے کہ عامل کو خدا پر توکل نہیں رہتا اور عجب پیدا ہوجاتا ہے اور یہ منافی ہے نسبت مع اللہ کے۔

امورِ اختیاریہ میں بھی دُعا کی ضرورت ہے اور اسباب کے موثر ہونے کی حقیقت اور حضرت ابراہیم علیہ السلام پر آگ کے سرد ہو جانے کے قصہ سے رفع تعجّب

دعا صرف امورِ غیر اختیار کے ساتھ خاص نہیں جیسا عام خیال ہے کہ جو امر اپنے اختیار سے خارج ہوتا ہے وہاں مجبور ہو کر دُعا کرتے ہیں ورنہ تدبیر پر اعتماد ہوتا ہے بلکہ امورِ اختیاریہ میں بھی دُعا کی

سخت ضرورت ہے اور ہر چند کہ ان کا وجود اور ترتب بظاہر تدبیر اور اسباب پر مبنی ہے لیکن اگر غور کر کے دیکھا جائے خود ان اسباب کا جمع ہو جانا واقع میں غیر اختیاری ہے اور اس کا بجز دعا اور کوئی علاج نہیں۔ مثلاً کھیتی کرنے میں ہل چلانا بیج بونا وغیرہ تو اختیاری ہے مگر کھیتی اُگنے کے واسطے جن شرائط اور اسباب کی ضرورت ہے وہ اختیار سے باہر ہیں مثلاً یہ کہ پالا نہ پڑے یا اور کوئی ایسی آفت نہ پڑے جو کھیتی کو اُگنے نہ دے۔ اس لئے اللہ جل جلالہٗ فرماتے ہیں کہ اَفَرَءَيْتُمْ مَّا تَحْرُثُوْنَ ءَاَنْتُمْ تَزْرَعُوْنَهٗٓ اَمْ نَحْنُ الزّٰرِعُوْنَ الخ۔ پھر ان سب کو احتیاج ہے تعلق مشیت خداوندی کی اور صاف ظاہر ہے کہ وہ عباد کے اختیار میں نہیں۔ پس ثابت ہو گیا کہ امور اختیاریہ میں بھی تدابیر اور کسب کے ساتھ دعا کی ضرورت ہے۔ خصوصاً جبکہ اس پر نظر کی جائے کہ ہم جن اسباب کو اسباب سمجھے ہوئے ہیں وہ بھی درحقیقت برائے نام ہی اسباب ہیں ورنہ اصل میں ان میں بھی وصف سببیہ یعنی تاثیر محل کلام میں ہے۔ بلکہ احتمال ہے کہ عادت اللہ اس طرح جاری ہو کہ ان کے تلبس و اقتران کے بعد حق تعالیٰ اس اثر کو ابتداءً پیدا فرما دیتے ہوں اور جب چاہیں اثر مرتب نہ فرمائیں جیسا کہ ابراہیم علیہ السلام کے واقعے میں اثر کو پیدا نہ فرمایا تو جو شخص اس راز کو سمجھ گیا وہ کبھی حضرت ابراہیم علیہ السلام پر آگ کے سرد ہونے میں تعجب نہیں کرے گا کیونکہ اگر تعجب ہے تو

تاثیر کے منسوب ہونے میں ہے اور اثر پیدا نہ ہونا چنداں عجب نہیں۔ بالجملہ ان اسباب کے تاثیر کی ایسی مثال معلوم ہوتی ہے کہ جیسے سُرخ جھنڈی دکھانے سے ریل رُک جاتی ہے۔ اب کوئی نادان یہ سمجھے کہ سُرخ جھنڈی میں کوئی تاثیر ہے جس سے ریل رُک جاتی ہے تو یہ اس کی نادانی ہوگی۔ سُرخ جھنڈی سے تو کیا رُکتی وہ تو کسی چلانے والے کے روکنے سے رکی ہے۔ سُرخ جھنڈی صرف اصطلاحی علامت قرار دی گئی ہے یہی مثال ہے اسباب اور ترتیب اثر کی۔ اصل کام تو اللہ تعالےٰ کے اختیار میں ہے۔ یہ اسباب و علامات محض عباد کی تسلّی و دیگر حکمتوں کے لئے مقرر فرما دئیے ہیں ؎

ایں سببہا در نظرہا پردہ ہاست ۔۔۔ در حقیقت فاعل ہر شے خدا است

کب فلک کو یہ سلیقہ ہے ستمگاری میں
کوئی معشوق ہے اس پردہ زنگاری میں

عارفین اس بات کو سمجھے اور حقیقت حال معلوم کر کے یوں گویا ہوئے ؎

عشق من پیدا و معشوقم نہاں ۔۔۔ یار بیروں فتنہ او در جہاں
کہاں میں اور کہاں یہ نکہت گل ۔۔۔ نسیم صبح تیری مہربانی

کار زلف تست مشک افشانی اما عاشقاں
مصلحت را تہمتے بر آہوئے چیں بستہ اند

آب خاک و باد و آتش بندہ اند ۔۔۔ بامن و تو مردہ باحق زندہ اند

مثنوی میں اس یہودی بادشاہ کی حکایت ہے جو مسلمانوں کو بتوں کے سجدے پر مجبور کر کے آگ میں ڈلواتا تھا۔ یہاں تک کہ اخیر میں یہ قصہ ہؤا کہ وہ آگ میں نہیں جلتے تھے۔ اس پر اس یہودی بادشاہ نے آگ سے مجنونانہ غصہ میں یہ خطاب کیا کہ تجھے کیا ہو گیا تو نہیں جلاتی تو آگ نہیں رہی آگ نے باذن خالقہا جواب دیا ؎

گفت آتش من ہمانم آتشم اندر آتا تو بہ بینی تابشم

پھر اس گستاخی کا یہ انجام ہؤا ؎

بانگ آمد کار تو ایں جا رسید پائے دار اے سگ کہ قہر ما رسید

دیکھئے وہی آگ تھی، ایک کو جلایا ایک کو نہ جلایا۔ اس سے یہ بات بہت وضاحت سے ثابت ہو گئی کہ اسباب بھی باختیار حق ہیں۔ جب یہ ہے تو اسباب کے اعتماد پر خالق سے قطع نظر و استغنا کرنا بڑی غلطی ہے۔ غرض امور اختیاریہ ہوں یا غیر اختیاریہ سب میں دعا کی حاجت ثابت ہوئی۔

امور اختیاریہ میں دعا کے ساتھ تدبیر بھی کرنی چاہئے اور مباشرت اسباب کا فائدہ

البتہ امور اختیاریہ میں اس بات کا خیال رکھنا ضروری ہے کہ تدبیر بھی کی جائے اور دعا بھی یہ نہ ہو کہ بلا تدبیر صرف دعا

پر اکتفا کیا جائے مثلاً کوئی شخص اولاد کی تمنا رکھتا ہے تو اسے چاہیئے کہ اول نکاح کرے اور پھر دعا کرے اور بے نکاح کے اگر یونہی چاہے کہ اولاد ہو جائے تو یہ اسکی نادانی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اسباب پیدا کئے ہیں اور ان میں حکمتیں اور مصلحتیں رکھی ہیں مطلق اسباب کا اس طور پر معطل چھوڑنا افراط و غلو ہے اور ایک گونہ تعطیل ہے حکم الہیہ کی جو کہ سوئے ادب اور خلاف عبدیت ہے اور مباشرت اسباب میں اظہار عبدیت افتقار الی اللہ بھی ہے جو کہ اعظم مقاصد سے ہے۔ اس لئے ایسے امور میں مباشرت اسباب اور دعا دونوں کا ہونا ضروری ہے اور اس میں اعتدال اور تعدیل ہے۔

دعا کے قبول ہونے پر بھروسہ اور یقین ہو تو بشرط عدم عارض خاص ضرور اثر ہوتا ہے گو اسباب ناتمام ہی ہوں

بعض دفعہ اللہ تعالے جل شانہ اپنی رحمت و عنایت سے نیک بندوں کی عاجزی اور دعا وزاری پر نظر فرما کر محض اپنی قدرت سے تھوڑے سے ناتمام اسباب سے یا بلا اسباب بھی

اثر مرتب فرما دیتے ہیں۔ چنانچہ حدیث شریف میں یہ قصہ موجود ہے کہ ایک نیک بی بی نے تنور میں سوختہ جھونک کر اللہ تعالے سے دعا کی اَللّٰھُمَّ ارْزُقْنَا۔ تھوڑی دیر کے بعد کیا دیکھا کہ تنور روٹیوں سے پُر ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان لوگوں میں قوت یقینیہ زیادہ تھی۔ پورا یقین اسکی رزاقی پر تھا۔ چنانچہ اس کا ظہور بلا اسباب ہوا اور یہ حضرات تو اللہ تعالے کے برگزیدہ تھے۔ ابلیس کے یقین اور توقع اجابت دعا کی کیفیت دیکھئے کہ عین غضب اور قہاری کے موقع پر بھی اس کو پورا بھروسہ تھا کہ غضب الٰہی اجابت دعا کے لئے مانع نہیں اِنَّ رَحْمَتِیْ سَبَقَتْ غَضَبِیْ۔ حالانکہ یہ سوال ایسا بعید ہے کہ خود انبیاء علیہم السلام کے لئے بھی خلود اور دوام نہیں عنایت کیا گیا۔ مَا جَعَلْنَا لِبَشَرٍ مِّنْ قَبْلِكَ الْخُلْدَ مگر شیطان نے رحمت کی وسعت کے بھروسہ پر اس کی دعا کر دی اور حکم بھی ہو گیا فَاِنَّکَ مِنَ الْمُنْظَرِیْنَ اِلٰی یَوْمِ الْوَقْتِ الْمَعْلُوْمِ۔ دعا کے قبول ہونے پر بھروسہ اور یقین ہو تو ضرور اثر ہوتا ہے اور یقین ایسی چیز ہے کہ اس سے بڑے بڑے آثار پیدا ہوتے ہیں۔

حکایت: چنانچہ حضرت علاء بن الحضرمی حضرت صدیق اکبر کی خلافت میں جب غزوہ مرتدین کے لئے بحرین پر گئے اور راستہ میں دریا پڑا تو ساتھیوں نے اس وجہ سے کہ کشتی تیار نہ تھی۔ ٹھہرنے کو کہا فرمانے لگے خلیفہ کا حکم ہے جلدی پہنچنے کا اس لئے

میں ٹھہر نہیں سکتا اور یہ کہہ کر دعا کی کہ اے اللہ جس طرح تو نے اپنے نبی موسےٰ علیہ السلام کی برکت سے بنی اسرائیل کو دریا سے پار کیا اسی طرح آج ہم کو ہمارے نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی برکت سے پار اتار دے اور دعا کر کے گھوڑا دریا میں ڈال دیا۔ دریا پایاب ہو گیا اور سارا لشکر پار ہو گیا۔ اور مشہور حکایت ہے کہ ایک مولوی صاحب بسم اللہ کے فضائل میں وعظ فرما رہے تھے۔ کہ بسم اللہ پڑھ کر جو کام کریں وہ پورا ہو جاتا ہے۔ ایک جاہل گنوار نے سُنا اور کہا یہ ترکیب تو اچھی ہاتھ آئی۔ ہر روز کشتی کے پیسے دینے پڑتے ہیں بس بسم اللہ پڑھ کر دریا سے پار اُتر جایا کریں گے۔ چنانچہ مدتوں وہ اسی طرح سے آتا جاتا رہا۔ اتفاقاً ایک روز مولوی صاحب کی دعوت کی اور گھر لے جانے کے واسطے ان کو ساتھ لیا۔ راستے میں وہی دریا آ ملا۔ مولوی صاحب کشتی کے انتظار میں رُکے اس نے کہا مولوی صاحب آئیے کھڑے کیوں رہ گئے مولوی صاحب بولے کہ کیسے آؤں اس نے کہا کہ بسم اللہ پڑھ کر آجائیے۔ میں تو ہمیشہ بسم اللہ ہی پڑھ کر اتر جاتا ہوں مولوی صاحب کی تو ہمت نہ ہوئی مگر اس نے ان کا ہاتھ پکڑ کر اپنے ساتھ ان کو بھی پار اتار دیا یہ قوت یقینیہ ہی تھی جس کی وجہ سے اللہ تعالےٰ نے اس کو آسان کر دیا۔ اسی وجہ سے بعض بزرگ تعویذ دیتے وقت کہہ دیتے ہیں کہ اس کو

کھولنا مت ورنہ اثر نہیں ہوگا۔ وجہ اسکی یہی ہے کہ کھولنے سے دیکھنے والا وہی معمولی کلمات سمجھ کر ضعیف الیقین ہوجاتا ہے اور اثر نہیں ہوتا۔ ان مثالوں سے ظاہر ہوگیا کہ تھوڑے بہت اسباب جمع کرکے اگر اللہ تعالٰے کے بھروسہ دعا کی جائے۔ تو اللہ تعالے اس تھوڑے حیلہ میں یقین کی برکت سے سب کچھ دے دیتا ہے۔ اور یہی معنے معلوم ہوتے ہیں وَاَجۡمِلُوۡا فِی الطَّلَبِ وَتَوَکَّلُوۡا عَلَیۡہِ کے کہ تدبیر اور مباشرت اسباب میں اختصار ہو۔ اَجۡمِلُوۡا اس کی طرف اشارہ ہے اور نظر تقدیر پر ہو وَتَوَکَّلُوۡا عَلَیۡہِ میں اس کی طرف اشارہ ہے۔

روزی کا مدار محض تدبیر پر نہیں ہے اور اس کا ایک نہایت بدیہی ثبوت

اور در حقیقت اگر روزی صرف سعی و تدبیر پر ہی موقوف ہوتی تو اکثر آدمی حکمت و تدبیر سے غنا حاصل کرسکتے تھے۔ مگر غنا اور تمول دیکھا جاتا ہے کہ حکمت اور تدبیر اور سعی پر موقوف نہیں بلکہ بکثرت دیکھا گیا ہے کہ ایک معمولی آدمی جو دو آنے تین آنے کی مختصر مزدوری کیا کرتا تھا۔ چند سال میں وہ لکھ پتی ہوگیا اگر غنا تدبیر اور سعی سے بلا تقدیر حاصل ہوسکتا ہے تو ہم

ایک دوسرا آدمی منتخب کرتے ہیں جو وقت اور ہمت رائے و تدبیر میں اس سے زیادہ اور مدت بھی اس کے لئے دونی تجویز کرتے ہیں اور اس پہلے کو دو آنہ روزانہ ملتے تھے ہم اس کے چار آنہ یومیہ دیتے ہیں اور اس پہلے شخص کا تمام کارنامہ اس کو دئے دیتے ہیں پھر ہم دیکھیں گے کہ اس پہلے کے برابر یا اس کے قریب مضاعف مدت میں کما سکتا ہے۔ ہرگز نہیں ترقی کے اسباب اور تدابیر بہت قومیں جانتی ہیں مگر ترقی وہی قومیں کرتی ہیں کہ جن کی تدبیر اور سعی کے ساتھ تقدیر بھی مساعدت کرتی ہے ورنہ ان سے دگنی محنت کرتے ہیں اور افلاس نہیں جاتا۔

اسباب کے بھروسے دعا سے بےفکر نہ ہو جائے اور نہ توکل کر کے اسباب کو بالکل چھوڑ دے

اصل یہ ہے کہ نہ تو نرے اسباب پر مدار ہے بلکہ تقدیر اور مشیت کی موافقت شرط ہے اور نہ یہ کہ کارخانہ اسباب بالکل معطل ہے کہ اس کو چھوڑ کر صرف دعاء سے ہی کام لیا جائے افراط اور تفریط دونوں کو چھوڑیں اس طرح سے کہ اسباب کو بھی اختیار کریں کیونکہ اس میں بھی اظہار ہے عبدیت اور افتقار الی اللہ کا اور اسباب کے بھروسہ دعا سے بھی غفلت نہ کی جائے۔ ہم میں

بعضے جو متوکل ہوئے تو اس میں بھی غلو کرنے لگے ہیں۔ ہماری بھی وہی مثال ہے ؎

اگر غفلت سے باز آیا جفا کی تلافی کی بھی ظالم نے تو کیا کی

اس غلو کی بدولت بعض اوقات توکل نام ہوتا ہے واقع میں تعطل و کم ہمتی کا ؎

چو باز باش کہ صیدے کنی و لقمہ دہی
طفیل خوارہ مشو چوں کلاغ بے پر و بال

توکل کے شرائط و آداب

البتہ اگر اسباب معیشت میں اشتغال مضر اس کے دین کو یا مانع خدمت دین کو ہو اور یہ شخص اس کا اہل ہے اور توکل کی ہمت بھی ہے تو توکل بہتر ہے مثلاً اس کے متعلق تعلیم و تربیت دینی ہو تو اس کو توکل و دینی خدمت سے بہتر کوئی کام نہیں البتہ یہ ضروری بات ہے کہ توکل صرف اللہ پر ہو۔ لوگوں کی ہدایا و تحف کے طرف نفس کا اشراف نہ ہو حدیث میں مِنْ غَیْرِ اِشْرَافِ نَفْسٍ کی قید آئی ہے ورنہ وہ توکل علی اللہ نہیں۔ غرض لوگوں کے اموال کی تاک میں نہ بیٹھا رہے۔ اس مقام پر ایک نکتہ سننے کے قابل ہے وہ یہ کہ بعض اوقات اہل کشف کو کشف سے آمد معلوم ہو کر مال کی طرف اشراف نفس پیدا ہو جاتا ہے یا بعض

اوقات اموال مشتبہ کی حقیقت ظاہر ہو کر مال حلال ملنا مشکل ہو جاتا ہے سو کشف نہ ہونا بھی اللہ تعالیٰ کا بڑا احسان ہے کہ عمل بالسنۃ میں مخل نہیں ہوتا۔

حکایت: اشراف کے متعلق بلگرام کے ایک بزرگ عالم کا قصہ یاد آیا کہ ان کے خاص شاگرد یا مرید ان کے پاس آئے شیخ کے اضمحلال اور ناتوانی کو دیکھ کر انہوں نے جانچ لیا کہ آج فاقہ ہے اس لئے وہ اُٹھے اور کچھ کھانا لے کر حاضر ہوئے اور پیش کیا۔ شیخ نے فرمایا کہ گو یہ پہنچا ہے حاجت کے وقت لیکن مجھ کو اس کے قبول کرنے میں ایک عذر ہے اس واسطے کہ جس وقت تم میرے پاس سے اُٹھ گئے تھے۔ اس وقت میرے دل میں خیال آیا تھا کہ کھانا لائیں گے کیونکہ میرے دل کا تعلق اور اشراف نفس اس کے ساتھ ہو گیا اور ایسی حالت میں ہدیہ لینا خلاف سنت ہے اس لئے اس کے لینے سے معذور ہوں ماشاء اللہ مرید یا شاگرد تھے سمجھدار کہ ذرا اصرار نہیں کیا۔ جیسا کہ بعض کم فہم لوگوں کی عادت ہے کہ بزرگوں سے جھک جھک کیا کرتے ہیں حالانکہ نہایت سوء ادب ہے بلکہ فوراً کھانا لے کر اُٹھ گئے اور آدھے رستے سے پھر لوٹ آئے اور وہی کھانا پھر پیش کیا اور عرض کیا کہ حضرت لیجئے اب تو میرے واپس چلے جانے سے اشراف نہیں رہا ہوگا۔ اب قبول فرما لیجئے۔ شیخ نے قبول فرما لیا اور ان کی اس نکتہ رسی اور

ذہانت پر آفرین فرمائی۔ آپ نے سُنا بزرگانِ دین نے اشراف سے کس قدر تحرز کیا ہے۔ غرض توکل کے آداب میں سے یہ بھی ہے کہ اشراف نہ ہو اور بدون اس کے اگر توکل ہو تو محمود ہے اور جو توکل کے شرائط نہ ہوں تو تدبیر مسنون ہے بالجملہ افراط و تفریط دونوں سے برکنار رہے اور اعتدال اختیار کرے ؎

گر توکل مے کنی در کار کن | کسب کن پس تکیہ بر جبار کن
گفت پیغمبر بآواز بلند | بر توکل زانوے اشتر بہ بند

اسباب کا اختیار کرنا توکل فرض کے خلاف نہیں اور اسباب اور توکل کے اجتماع کی توضیح ایک مثال سے

اور جان لینا چاہیئے کہ تدبیر و اسباب کا اختیار کرنا بھی توکل فرض کے خلاف نہیں ہے اس کی بعینہٖ مثال توکیل کیسی سمجھ لینا چاہیئے مثلاً جب کوئی شخص کسی مقدمہ میں وکیل مقرر کرتا ہے تو کیا وکیل مقرر کرنے کے بعد یہ شخص نکما خالی بیٹھ جاتا ہے ہرگز نہیں بلکہ جتنی کوشش اس سے ہو سکتی ہے۔ خود بھی کرتا ہے اور اس کو خلاف توکیل نہیں سمجھتا بلکہ یہ سمجھتا ہے کہ وکیل کے

کرنے کا جو کام ہے وہ کرے گا جو مجھ سے کچھ ہو سکتا ہے۔ مجھ کو کرنا چاہیئے اسی طرح تدبیر کرنا اعتدال کے ساتھ توکل کے خلاف نہیں۔

توکل کے ساتھ ایک درجہ میں اسباب کی رعایت بھی ضروری ہے اور بعض ایسے امور پر تنبیہ جن سے دوسروں کو ایذا ہوتی ہے اور لوگ ان سے بے پروائی کرتے ہیں

بلکہ تدبیر ایسی چیز ہے کہ جو امور محض غیر اختیاری ہیں جن میں تدبیر کو اصلاً دخل نہیں محض دُعاء ہی پر ان کا مدار ہے سنن میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان میں بھی دعاء کے ساتھ کچھ صورت تدبیر اختیار کی جاتی ہے۔ چنانچہ ایک قصہ حدیث سے بیان کیا جاتا ہے جس سے معلوم ہو جائے گا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کس طرح توکل اور دُعاء کو جمع فرمایا اور اس حدیث کے ضمن میں اور بھی فوائد ہیں۔ ایک صحابی جن کا نام مقداد ہے جو کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مکان پر مسافرانہ مقیم تھے اور ان

کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بکریاں تبلادی تھیں کہ ان کا دُودھ نکال کر کچھ خود اور رفقا پی لیا کرو اور کچھ ہمارے لئے رکھ دیا کرو۔ اور ان کا اسی طرح معمول تھا۔ وہ فرماتے ہیں کہ ایک روز حضور کو آنے میں دیر ہوئی تو میں سمجھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی کہیں دعوت ہوگئی ہوگی یہ خیال کرکے آپ کا حصّہ بھی پی گیا مگر اتفاق سے جب پی چکا اُس وقت خیال آیا کہ شاید آپ نے کچھ نہ کھایا ہو اور بے چینی کا یہ حال ہوا کہ کروٹیں بدلتا ہوں اور نیند نہیں آتی اس کشمکش و پیچ میں تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے اور آپ کی عادت شریفہ آنے کے وقت یہ تھی کہ جب تشریف لاتے اور دیکھتے کہ گھر والے لیٹے ہیں تو بہت آہستہ سے سلام کرتے اس طرح سے کہ اگر حاضرین جاگتے ہوں تو سن لیتے اور اگر سوتے ہوتے تو آنکھ نہ کھلتی۔ اس طرح نسائی میں حضرت عائشہ صدیقہؓ سے آپ کا شب برات میں بقیع میں جانے کے لئے آہستہ اُٹھنا اور آہستہ سے کواڑ کھولنا سب کام آہستہ سے کرنا تاکہ سونے والے کو تکلیف نہ ہو آیا ہے سو اسی طرح سلام بھی آہستہ سے فرماتے کہ اگر کوئی جاگتا ہو تو سُن لے اور سوتا ہو تو اس کی نیند میں خلل نہ آئے۔ اس موقع پر یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ بعض لوگ دوسرے آدمیوں کی تکلیف کا اصلاً خیال نہیں کرتے سوتے آدمیوں میں اُٹھ کر

سب کام بے تکلف زور زور سے کرتے ہیں اور اس سے دوسروں کو ایذا ہوتی ہے۔ اسی طرح یہ امر بھی موجب ایذا ہے کہ مشغول کار آدمی کو اپنی طرف متوجہ کرنا چاہتے ہیں جس سے اس کے ضروری کام میں حرج بھی ہوتا ہے اور پریشانی بھی۔

آجکل محض لفظ پرستی رہ گئی ہے آداب اخلاق کی حقیقت سے اہل علم بھی بے خبر ہیں

حضرات ہماری سبھی حالتیں بگڑ رہی ہیں، ہر چیز میں افراط و تفریط ہو رہی ہے اور عوام کی کیا شکایت کریں۔ انصاف یہ ہے کہ آداب کو بعض اہل علم تک نہیں جانتے۔ محض لفظ پرستی رہ گئی ہے ؎

مولوی گشتی و آگاہ نیستی ‏ ‏ ‏ ‏ خود کجا و از کجا و کیستی

اس لفظ پرستی پر ایک مثال یاد آئی ایک شخص کا انتقال ہوا موت کے قریب بیٹے کو نصیحت کی کہ جو کوئی میری تعزیت کو آئے اس کو اونچی جگہ بٹھانا اور نرم اور شیریں باتیں کرنا اور بھاری کپڑے پہن کر اس سے ملنا اور قیمتی کھانا کھلانا۔ اب صاحبزادے کی سنئے کہ ایک صاحب اُن کے والد کے دوست تعزیت کو آئے آپ نے فوراً نوکروں کو حکم دیا کہ ان کو مچان پر بٹھا دو وہ آئے اور مجرموں

کی طرح سے ان کو زبردستی پکڑ کر مچان پر بٹھا دیا۔ اب وہ پوچھتے ہیں کہ یہ کیا معاملہ ہے نوکر کہتے ہیں کہ آقا کا یہی حکم ہے۔ اب آقا صاحب تشریف لائے تو اس انداز سے کہ جاجم دری قالین میں لپٹے ہوئے ایک عجب مقبول کسی شکل بنے ہوئے ہیں۔ آخر مہمان نے کچھ تعزیت میں کہا تو جواب میں فرماتے ہیں گڑ۔ انہوں نے کچھ اور کہا تو جواب ملتا ہے روئی۔ مہمان بیچارہ دنگ ہے۔ غرض کھانے کا وقت آیا۔ گوشت گلا نہ تھا۔ مہمان نے کہیں اس کا شکوہ کیا تو آپ تیز ہو کر کہتے ہیں۔ واہ صاحب میں نے آپ کے لئے پچاس روپے کا کتا کاٹ ڈالا اور آپ کو پسند نہیں آیا۔ اب مہمان اور بھی پریشان ہے۔ آخر تحقیق کیا تو انہوں نے بیان کیا کہ ابا جان نے وصیت کی تھی کہ میرے انتقال کے بعد اگر کوئی شخص تعزیت کے واسطے تمہارے پاس آئے تو اس کو اونچی جگہ بٹھانا۔ اس واسطے میں نے مچان پر بٹھایا کہ سب سے اونچی جگہ یہی تھی اور یہ کہا تھا کہ بھاری کپڑے پہن کر اس سے ملنا تو اس دری قالین سے بھاری کوئی کپڑا نہ تھا۔ تیسرے یہ کہا تھا کہ نرم اور میٹھی باتیں کرنا تو گڑ اور روئی سے زیادہ نرم اور میٹھی چیز مجھ کو نہ معلوم ہوئی اور وصیت کی تھی کہ قیمتی کھانا کھلانا تو اس کتے سے زیادہ کوئی جانور قیمتی ہمارے گھر نہ تھا۔ مہمان لعنت بھیجکر وہاں سے رخصت ہوا۔ بس یہی حالت ہماری ہے کہ الفاظ یاد کر لیئے ہیں اور حقیقت

آداب و اخلاق اعمال کی نہیں سمجھے۔ چنانچہ ہم نے اخلاق نام صرف چاپلوسی اور خوشامد اور میٹھی باتیں کرنے کا رکھ لیا ہے سو حقیقت میں اخلاق کو نفاق سے بدل دیا ہے اخلاق کی حقیقت یہ ہے کہ ہم سے کسی کو کسی قسم کی ایذا ظاہری و باطنی حضور یا غیبت میں نہ پہنچے۔ ہم نے یہ سمجھا کہ اخلاق ظاہرداری کا نام ہے گو اس سے ایذا ہی پہنچے۔ اس کی کچھ پرواہ نہیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ شفقت اور رعایت کہ سلام بھی کرتے ہیں تو اس طرح سے کہ کوئی بے چین نہ ہو۔

رجوع بجانب مسرحی (توکل کے ساتھ ایک درجہ میں اسباب کی بھی رعایت ضروری ہے)

غرض آنحضرت عشا کے بعد تشریف لائے اور حسب معمول سلام کر کے برتنوں کی طرف چلے اور وہ صحابی جو دودھ پی کر لیٹ گئے تھے یہ سب دیکھ رہے ہیں آپ کو اس میں دودھ نہ ملا چونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس وقت بھوک لگی ہوئی تھی اور طعام کی حاجت تھی آپ نے حسب معمول کچھ نفلیں پڑھیں اور یوں دعا فرمائی اَللّٰھُمَّ اَطْعِمْ مَنْ اَطْعَمَنِیْ دیکھئے یہ امر قابل غور ہے کہ اس دعاء میں آپ نے توکل کے ساتھ اسباب کی

کس لطیف طور پر رعایت فرمائی کہ یہ ظاہر کر دیا کہ کھانا اکثر اس طرح ملتا ہے کہ کوئی شخص ظاہر میں لے آئے ورنہ یہ بھی تو دعا فرما سکتے تھے کہ اے اللہ آسمان سے مائدہ یا رزق بھیج مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے توکل اور تدبیر کو کس لطیف طریق پر جمع فرمایا۔ جیسا مذکور ہوا۔ تتمہ قصہ کا یہ ہے کہ اس دعا کے سننے کے بعد وہ صحابی اُٹھے چونکہ ان کو یقین تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا قبول ہوئی ہوگی اس لئے گو بکریوں کا دودھ دوہ چکے تھے مگر پھر برتن لے کر بیٹھ گئے اللہ تعالیٰ کی قدرت سے بکریوں نے اس قدر دودھ دیا کہ برتن بھر گیا۔ اس برتن کو لے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہوئے۔ غرض اس قصہ کے بیان سے یہ تھی کہ دیکھنا چاہیئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا و توکل کے ساتھ اسباب کی رعایت کس طور پر فرمائی۔ پس معلوم ہوا کہ نہ دعاء کے بھروسے اسباب کو چھوڑ دے اور نہ اسباب میں ایسا انہماک ہو کر مسبب الاسباب پر نظر نہ رہے اعتدال اصل طریقۂ نبویہ ہے اور یہ بدون تحصیل تبحر و علوم دین کے حاصل ہونا مشکل ہے کوئی آسان کام نہیں جو ہر ایک دعوے کرنے لگے ؎

بر کفے جام شریعت در کفے سندان عشق
ہر ہوسناکے نداند جام و سندان باختن

آنحضرت کے افعال سے تو یہاں تک اس اعتدال کا پتہ چلتا ہے کہ معجزات میں بھی جو کہ بالکل بطور خرق عادت ظہور میں آتے ہیں ان میں بھی تدبیر اور اسباب کی ضرورت کو ملحوظ رکھا گیا ہے چنانچہ حضرت جابرؓ کی دعوت کا قصہ جو جنگ احزاب میں خندق کھودنے کے وقت ظہور میں آیا اس کا شاہد ہے۔ آنحضرت نے ان کو فرمایا تھا کہ ہانڈی چولھے سے مت اُتارنا پھر اس میں آکر آب دہن ملا دیا اور وہ چند آدمی کی خوراک لشکر کے لشکر کو کافی ہو گئی۔ اس طرح حدیث میں اور بھی معجزات کے قصے ہیں کہ جن سے معلوم ہوتا ہے کہ معجزہ خرق عادت میں تھوڑی سی رعایت اسباب کی کی گئی۔ مثلاً چولھے پر ہانڈی اور توے کا رکھا رہنا اور ڈھک دینا وغیرہ کی صورت اسباب کو حجاب بنایا گیا۔ ورنہ ایسے بھی کھانا بڑھ سکتا تھا۔

اسباب کے اندر منہمک ہونا سبب ہے ترک دعا کا

یہ آداب ہیں توکل اور تدبیر کے سید المرسلین سے ان کو سیکھنا چاہیئے ان سے نا فل رہنا بعض اوقات سبب ہو جاتا ہے۔ انہماک فی الاسباب کا جو ایک سبب ہے ترک دعا

کا جس کا حاصل ہے اسباب میں انہماک اور مسبب الاسباب پر نظر نہ رکھنا اور عقیدت کی کمزوری۔

یہ خیال کہ ہم دعا کے قابل نہیں ہم کیا دعا کریں درحقیقت شیطانی وسوسہ ہے اور بعض احوال باطنہ کا ایک دوسرے کے ساتھ مشتبہ ہونا اور ہماری عبادت کی حقیقت

اب ایک دوسرا سبب دعا نہ کرنے کا سنئے وہ یہ کہ عقیدہ تو دعا کا ہے مگر یہ خیال ہو جاتا ہے کہ ہم دعاء کے قابل نہیں ہم کیا دعا کریں اور درحقیقت یہ بھی شیطان کا ایک وسوسہ ہے جو ان لوگوں کے دلوں میں تواضع کے رنگ میں ڈالا گیا ہے۔

درحقیقت بعض احوال باطنہ کچھ اس قسم کے ظاہراً مشتبہ معلوم ہوا کرتے ہیں کہ ان کو بھلا یا برا قرار دینے میں بڑی فہم و دقت نظر آ گاہی شرع شریف کی سخت ضرورت پڑتی ہے چنانچہ آیت "مرج البحرین یلتقیان بینهما برزخ لا یبغیان" میں اہل لطائف اس طرف بھی اشارہ فرماتے ہیں چنانچہ

اس انتظام پر دو امر میں التباس ہو جاتا ہے۔ ایک تو تواضع اور حیا اس کی حقیقت یہ ہے کہ گناہ کرتے ہوئے بھی اس کا خیال رہے اپنی عبدیت اور خدائے تعالےٰ سے شرم کرنا ملحوظ رہے ورنہ اگر صرف دعا کے وقت تو تواضع کے خیال سے دعا نہ کی جائے اور گناہ کرتے وقت بیباک اور نڈر ہو جائیں تو یہ درحقیقت تواضع نہیں ہے بلکہ کم ہمتی اور سستی ہے۔ شیطان نے برکات دعا سے محروم کرنے کے واسطے ایک حیلہ سکھا دیا ہے لہذا اس کا وسوسہ بھی دل میں نہ لانا چاہیئے اور دعا بڑے اہتمام سے کرنی چاہیئے کہ وہ خالی نہیں جاتی اور کچھ نہ ہو یہ کیا کم ہے کہ آخرت کے لیئے اس کا اجر جمع رہے گا اور اہل حال کے جو اقوال ہیں مثلاً ؎

ہم حب مناجات الحبیب بادجہہ
ولکن لسان المذنبین کلیل

سو وہ غلبہ حال کے ہیں جس میں وہ معذور ہیں مگر قابل تقلید نہیں۔ الحاصل حیا و تواضع میں رضائے خداوندی پیش نظر ہوتی ہے اور یہ نہ ہو تو کم ہمتی ہے۔ ان باتوں میں فرق کرنے کے واسطے بڑی ضرورت ہے علم شریعت کی۔ اسی طرح اگر کوئی شخص لَا صَلٰوۃَ اِلَّا بِحُضُوْرِ الْقَلْبِ میں بھی یہی حیلہ جو دعا میں کیا ہے نکالے تو اس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ نماز

چھوڑ بیٹھے گا ہمنڈا ایسے وساوس ناقابل اعتبار ہیں جو کچھ جیسا کچھ ہو سکے کرنا چاہئے۔ بھلا بُرا جو کچھ بھی ہو خدا کے دروازے پر آنا چاہئے ؎

باز آ باز آ ہر آنچہ ہستی باز آ
گر کافر و گبر و بت پرستی باز آ
ایں درگہ ما درگہ نومیدی نیست
صد بار اگر توبہ شکستی باز آ

ایسا شخص ایک غلطی تو یہ کرتا ہے کہ کم ہمتی سے عبادت اور طاعت اور دعاء کی طرف نہیں آتا اور دوسری غلطی یہ کرتا ہے کہ اپنی نسبت گمان کرتا ہے کہ میں کسی وقت پاک صاف ہو کر حق عبادت ادا کر سکتا ہوں اور ایسے وقت عبادت کروں گا اور جو عبادت کر رہا ہے گویا بزبان حال اس کا حق ادا کرنے کا مدعی ہے اور یہ بھاری غلطی ہے کہ انسان کبھی پورا پاک نہیں ہو سکتا اور اللہ تعالےٰ کی درگاہ کے قابل بننا اور اس کا حق عبادت ادا کرنا کیا اس سے ممکن ہے ع وجودک ذنب لا یقاس بہ ذنب۔ مولانا رومی فرماتے ہیں ؎

خود ثنا گفتن ز من ترک ثنا ست
کایں دلیل ہستی و ہستی خطا ست

سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں لا احصی ثناء علیک انت کما اثنیت علی نفسک مرزا مظہر جانِ جاناں علیہ الرحمۃ اس معنے میں کہ ہم آپ کی ثنا نہیں کر سکے فرماتے ہیں ؎

خدا در انتظار حمد ما نیست
محمد چشم بر راہ ثنا نیست
خدا مدح آفرین مصطفےٰ بس
محمد حامد حمد خدا بس
مناجاتے اگر خواہی بیاں کرد
بہ بیتے ہم قناعت میتواں کرد
محمد از تو می خواہم خدا را
الٰہی از تو حب مصطفےٰ را

اسی پاک سمجھنے کے بارے میں خدا تعالےٰ فرماتے ہیں لا تزکوا انفسکم الخ ہم اور ہماری عبادت تو ایسی ہے کہ یہی غنیمت ہے کہ اس پر مواخذہ نہ ہو کیونکہ ہماری ثنا ایسی ہے جیسا مولٰنا فرماتے ہیں ؎

شاہ را گوید کسے جولاہ نیست
این نہ مدح است او مگر آگاہ نیست

ما بری از پاک و ناپاکی ہمہ ۔۔۔ وز گرانجانی و چالاکی ہمہ

من نگردم پاک از تسبیح شاں
پاک ہم ایشاں شوند در فشاں

یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں اِنِّیْ لَاَسْتَغْفِرُ اللّٰہَ فِیْ کُلِّ یَوْمٍ سَبْعِیْنَ مَرَّۃً. حالانکہ عصمت انبیا ایک مسلم مسئلہ ہے۔ پھر یہ استغفار گویا اپنی حالت عبادت کو کمال خداوندی کے مقابلہ میں ناتمام دیکھ کر ہوتا تھا۔ یعنی اپنی عبادت و حمد و ثنا کو غیر قابل قرب خداوندی سمجھ کر استغفار کر رہے ہیں۔ یہ حالت ہے اکابر مقبولین کی کہ بایں ہمہ علو مرتبہ بمقابلہ کمال حقوق خداوندی اپنے آپ کو محض ہیچ سمجھ رہے ہیں اور یہ نہیں کہ وہ واقع میں کمال و وصال سے خالی ہیں بلکہ ؎

دل آرام در بر دل آرام جو
لب از تشنگی خشک بر طرف جو

نگویم کہ برآب قادر نیند
کہ بر ساحل نیل مستسقی اند

داماں نگہ تنگ گل حسن تو بسیار
گلچیں بہار تو ز داماں گلہ دارد

جب خواص کی یہ کیفیت ہے تو ہم عوام کس شمار میں ہیں۔ ہم پہ یہ ان کی عنایت ہے۔ کہ باوجود بداعمالی خراب حالی جاننے کے پھر ہم کو اپنی طاعت و حمد و ثنا دعاء و التجا کی رخصت دیتے ہیں اور حکم دیتے ہیں کہ کرو اگر وہ باوجود

علم کے ہم سے کھوٹے مال اور ناقص عبادت کو قبول کرتے ہیں تو پھر بندہ کو کسی قسم کا عذر پیش کرنا گو وہ عذر ناقابلیت ہی کا ہو کس درجہ حماقت ہے ۔

چوں طمع خواہد زمن سلطان دیں
خاک بر فرق قناعت بعد ازیں
ایں قبول ذکر تو از رحمت است
چوں نماز مستحاضہ رخصت است

یہ دوسرا سبب تھا دعا کے نہ کرنے کا یعنی اپنے آپ کو دعاء کے قابل نہ سمجھنا جس کی اصلاح پوری طور سے کر دی گئی ۔

اس خیال کی تردید کہ دعا قبول تو ہوتی ہی نہیں پھر دعا کیا کریں

اب تیسرا سبب بیان کیا جاتا ہے وہ یہ کہ بعضے یہ سمجھ کر دعا نہیں کرتے کہ قبول تو ہوتی ہی نہیں پھر دعاء سے کیا فائدہ ۔ سو خود یہی سمجھنا غلط ہے کہ خداوند تعالی دعا قبول نہیں کرتے ، واقع میں موانع قبول دعاء خود اپنی ذات میں ہوتے ہیں مثلاً دل سے خشوع و خضوع کے

ساتھ جو روح ہے دعا کی دعا نہ کرنا محض زبان سے کہہ دینا حدیث میں ہے اِنَّ اللہَ لَا یَسْتَجِیْبُ الدُّعَاءَ مِنْ قَلْبٍ لَاہٍ سو یہ قصور اپنا ہے ورنہ وہ ذات تو سب پر مہربان اور اس کا فیض سب پر محیط ہے اپنے میں قابلیت نہ ہو تو اس کا کیا علاج ہے

اُس کے الطاف تو ہیں عام شہیدی سب پر
تجھ سے کیا ضد تھی اگر تو کسی قابل ہوتا

ہم لوگوں کی تو یہ حالت ہے ہے

توبہ برلب سبحہ برکف دل پراز ذوق گناہ
معصیت را خندہ مے آید بر استغفار ما

اور مثلاً گناہ کی بات کی دعا کرنا حدیث شریف میں آیا ہے کہ اللہ تعالےٰ قبول کرتا ہے جب تک گناہ اور قطعیۂ رحم کی دعا نہ ہو سو بعض دفعہ اکثر دعائیں گناہ کی ہوتی ہے اب ان کا قبول نہ کرنا ہی خدا تعالےٰ کی رحمت ہے مثلاً موروثی زمین کے جھگڑے میں مالکانہ قبضہ کی دعاء خود گناہ ہے۔ ایسے ہی بعض لوگ بزرگوں سے دُعا کراتے ہیں کہ ہمارا لڑکا فلاں امتحان میں پاس ہو جائے اس کو ڈپٹی کلکٹری تحصیلداری مل جائے سو یہ دعا ہی سرے سے ناجائز ہے کیونکہ حکومت کی اکثر ملازمتیں خلاف شرع ہیں۔

مشائخ کے اپنے بعض متعلقین کی ناجائز ملازمتیں نہ چھڑانے کی وجہ

اور یہ شبہ نہ کیا جائے کہ بزرگوں کے متعلقین بعض ڈپٹی کلکٹری تحصیلداری وغیرہ حکومت کے عہدوں پر ہوتے ہیں سو اگر یہ نوکری ناجائز ہے تو وہ بزرگ ان کو کیوں نہیں روکتے۔ جواب اس شبہ کا یہ ہے کہ ہیں تو یہ نوکریاں ناجائز مگر جو لوگ اس میں مبتلا ہیں اور ان کے روزگار کی صورت بجز اس کے اور کچھ ہے نہیں اگر ان کو اس سے علیحدہ کر دیا جائے گا اور وہ نوکری چھوڑ دیں گے تو بوجہ عدم سبیل معاش وہ اس سے زیادہ کسی گناہ میں مبتلا ہوں گے سو درحقیقت ان کو اجازت نہیں دی جاتی بلکہ اور بہت سے بڑے بڑے گناہوں سے بچا کر ایک چھوٹے گناہ پر رکھا جاتا ہے۔

مشائخ اور علماء کو چاہئے کہ ناجائز مقدمات اور امور ممنوعہ کے واسطے دعا کرنے میں احتیاط کریں

اور ایسی دعاء میں خود مشائخ اور علماء کو احتیاط کرنی چاہئے کہ ایسے ناجائز مقدمات اور امور ممنوعہ کے واسطے دعاء نہ کیا کریں کیونکہ گناہ ہوگا اور صاحب حاجت تو صاحب الغرض مجنوں ہوتا ہے اس پر اعتبار اور بھروسہ نہیں چاہئے۔ اور اگر ایسا ہی کسی کی دل شکنی وغیرہ کا خیال ہو تو یوں دعا کریں کہ یا الٰہی جس کا حق ہو اس کو دلوائیے۔ باقی ایسی ناجائز دعاء نہ اپنے لئے کرے نہ غیر کے لئے ناجائز امور کی دعاء یا دعا کا غافل دل سے کرنا منجملہ ان موانع کے ہے۔ جن کی وجہ سے دعا قبول نہیں ہوتی۔

بعض مرتبہ حق تعالیٰ بندہ کی آرزو اس لئے پوری نہیں کرتے کہ وہ اس کے لئے بہتر نہیں ہوتی اور

اس پر ایک حکایت

اور اگر موانع بھی مرتفع ہو جائیں تو بعض دفعہ اس وجہ سے قبول نہیں ہوتی کہ در حقیقت وہ دعاء اس کے لئے بہتر نہیں ہوتی اور خلاف حکمت ہوتی ہے۔ اس لئے تو حمار قبول نہیں فرماتے اس کی ایسی ہی مثال فرض کیجئے۔ جیسے بچہ انگارے کو اچھا سمجھ کر منہ میں ڈالنے لگے۔ تو شفیق ماں باپ اس کو منع کرتے اور اس کے ہاتھ سے چھین لیتے ہیں ؎

آنکس کہ تو نگرت نمے گرداند آں مصلحت تو از تو بہتر داند

حکایت: چنانچہ حکایت ہے کہ کسی نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے یہ دعا کرائی تھی کہ کل کی بات معلوم ہو جایا کرے۔ موسیٰ علیہ السلام نے اس کو نصیحت کی کہ اس کو جانے دے۔ اس نے نصیحت نہ مانی اور اصرار کیا انہوں نے دعا کر دی اور وہ قبول ہو گئی۔ اس کو معلوم ہوا کہ کل کو میرا گھوڑا

مرجائے گا۔ اس نے فوراً بازار میں جا کر بیچ ڈالا اور خوش ہؤا۔ پھر معلوم ہؤا کہ کل کو میں مرجاؤں گا۔ بہت پریشان ہؤا اور موسے علیہ السلام سے جا کر عرض کیا کہ کیا کروں۔ وحی آئی کہ اس سے کہہ دو کہ تجھ کو اس کشف راز سے منع کیا گیا تھا تو نے نہ مانا۔ آخر تو نے دیکھا کہ اصل یہ ہے کہ تیرے گھر پر ایک بلا آنے والی ہے۔ ہم نے چاہا جانور پر پڑ جائے تو نے اس کو جدا کر دیا۔ ہم نے چاہا کہ غلام پر پڑ جائے۔ تو نے اس کو بھی جدا کر دیا۔ اب تو ہی رہ گیا۔ اگر تجھ کو پہلے سے آیندہ کی خبر نہ ہوا کرتی تو گھوڑا اور غلام کیوں بیچا جاتا اور تو معرض ہلاکت میں کیوں پڑتا۔ اس سے معلوم ہؤا کہ اپنی بعض مصلحت انسان نہیں سمجھتا۔ تو اس معلوم ہونے پر اس کو بہت پریشانی اٹھانی پڑی تھی۔

ذاکرین کو چاہیئے کہ اپنی خواہش سے کسی حالت کی تمنا و طلب نہ کریں بلکہ جو حالت غیر اختیاری اللہ تعالیٰ وارد فرمائیں اسی کو بہتر جانیں

یہاں سے ذاکرین شاغلین کے واسطے یہی نصیحت نکلتی ہے

کہ جو حالت غیر اختیاری اللہ تعالےٰ وارد فرمائیں اسی کو اپنے لئے بہتر جانیں اور اپنی خواہش سے کسی پسندیدہ حالت کی تمنا نہ کریں ؎

بدرد و صاف ترا حکم نیست دم درکش
کہ ہرچہ ساقی ما ریخت عین الطاف است

مجاہدے سے کسی خاص حالت کا قصد ٹھیک نہیں ؎

تو بندگی چو گدایاں بشرط مزد مکن
کہ خواجہ خود روش بندہ پروری داند

ہر حالت جو اس کی طرف سے آئے وہی مناسب ہے۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ذوق و شوق و انبساط باعث عجب ہو جاتا ہے تو مربی حقیقی اس کا علاج اس طرح فرماتے ہیں کہ حزن و ملال اور انقباض کو اس پر مسلط کر دیتے ہیں۔ جس سے تواضع و انکسار پیدا ہوتا ہے۔ الغرض اپنے لئے کوئی فکر اپنی خواہش دل پسند پر نہ کرنا چاہیئے ؎

فکر خود و رائے خود در عالم رندی نیست
کفر است دریں مذہب خود بینی و خود رائی

بعض لوگ ذکر و شغل کرتے ہیں اور کسی خاص حالت اور ثمرہ کے حاصل نہ ہونے پر جس کو غلط فہمی سے انہوں نے مقصود سمجھ رکھا ہے غمگین ہوتے ہیں اور کہتے ہیں کچھ

حاصل نہیں ہوا۔ یہ لوگ بڑی غلطی کرتے ہیں۔ اصل مقصود رضائے حق ہے۔ جس کا طریق ذکر و طاعت ہے۔ جس کو یہ حاصل ہے سب کچھ حاصل ہے تو ان کو خدا کا شکر کرنا چاہیئے۔ کہ ان کو ذکر اور طاعت کی توفیق تو دی ہے۔ ع

بارے یاد دے اگر ایں ہم نبو دے

حقیقت میں یہ طلب اور درد و غم بھی نعمت عظمیٰ ہے جس کا شکر کرنا چاہیئے ؎

گفت آں اللہ تو لبیک ماست
دیں نیاز و سوز و دردت پیک ماست

حضرت حاجی امداد اللہ رحمۃ اللہ علیہ کا ایک عجیب ارشاد

حکایت: اگر حضرت حاجی صاحب قدس سرہ سے کوئی خادم اس امر کی شکایت کرتا تو فرماتے کہ خدا کا شکر کرو کہ اس نے اپنا نام لینے کی توفیق تو دی ہے۔ اور اس موقعہ پہ اکثر یہ شعر فرمایا کرتے ؎

یابم اورا یا نیابم جستجوئے میکنم
حاصل آید یا نیاید آرزوئے میکنم

اور فرمایا کرتے کہ جس طاعت کے بعد پھر اس طاعت کی توفیق ہو یہ طاعت سابقہ کے قبول کی علامت ہے تو قبول کتنی بڑی نعمت ہے۔

عشاق کی نظر کسی قسم کے قبول پر نہیں ہوتی

غرض قبول اسی میں منحصر نہیں کہ اس کی خواہش کے موافق ہو اور عشاق کی نظر تو کسی قسم کے قبول پر ہی نہیں ہوتی ان کی حالت تو یہ ہے ؎

از دعا نبود مراد عاشقاں

جز سخن گفتن بآں شیریں زباں

عاشقان خدا کو عشق میں مجنوں سے تو کم نہ ہونا چاہئے۔ کیا اس کے نام کی مشق کچھ کم دولت ہے جو اور چیزوں کی تمنا کی جاتی ہے۔

؎

دید مجنوں را یکے صحرا نورد

در بیاباں غمش بنشستہ فرد

ریگ کاغذ بود انگشتاں قلم

می نمودے بہر کس نامہ رقم

گفت اے مجنون شیدا چیست ایں
مے نویسی نامہ بہر کیست ایں
گفت مشق نام لیلےٰ می کنم
خاطر خود را تسلی می دہم

کبھی قبولیت دعا کی اس طرح ہوتی ہے کہ اس کا اجر آخرت کے لئے ذخیرہ کیا جاتا ہے

اور علاوہ اس کے کہ وہ دعا ان کی مصلحت کے مناسب نہ ہو کبھی یہ بھی ہوتا ہے اس کا اجر آخرت کے لئے ذخیرہ کیا جاتا ہے۔ سو تعجب ہے کہ مومن ذخیرۂ آخرت پر قناعت نہ کرے متاع دنیا کے حاصل نہ ہونے پر افسوس کرے۔ مومن کامل تو نعمت اخرویہ کے روبرو دنیوی سلطنت تک کو گرد سمجھتے ہیں۔

حکایت: ایک دفعہ سلطان سنجر شاہ ملک نیمروز نے حضرت پیران پیر شیخ عبد القادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں عریضہ لکھا کہ اگر آپ قبول فرمائیں تو میں ملک نیمروز آپ کو ہدیہ کرتا ہوں۔ اس کے جواب میں

حضرت نے یہ دو شعر تحریر فرمائے ؎

چوں چتر سنجری رخ نجتم سیاہ باد
در دل اگر بود ہوس ملک سنجرم
زانگہ کہ یافتم خبر از ملک نیم شب
من ملک نیمروز بیک جو نمی خرم

دعاء رضاء بالقضا کے خلاف نہیں

بعض لوگوں کو شاید یہ شبہ ہو کہ دعاء رضاء بالقضا کے خلاف ہے۔ سو اس کا جواب یہ ہے کہ دعاء اور رضاء دونوں جمع ہو سکتے ہیں اس طور پر کہ عین دعاء کے وقت یہ قصد ہے کہ اگر دعاء کے موافق ہو گیا تو یہی قضا ہے اس پر راضی ہوں گے اور اگر اس کے خلاف ہوا تو وہی قضا ہے اس پر راضی ہوں گے اور چونکہ دعاء بھی مامور بہ ہے اس لئے وہ بھی داخل قضا ہے۔

مغلوب الحال خود معذور ہوتا ہے لیکن دوسرے کو اس کی تقلید جائز نہیں اور حضرت شاہ فخر دہلوی کی حکایت کی ایک عجیب توجیہ

اور اکثر بزرگوں سے غلبۂ حال میں اس قسم کی باتیں ہوا کرتی ہیں کہ جن کی نہ تقلید درست ہے نہ ان کی باتوں سے استدلال کیا جا سکتا ہے اور نہ ان پر انکار درست ہے وہ معذور ہیں۔

حکایت - چنانچہ شاہ فخر دہلویؒ ایک روز جمعہ کی نماز پڑھکر مسجد سے باہر نکلتے تھے کہ سیڑھیوں پر ایک بڑھیا نے شربت کا پیالہ پیش کیا اور کہا بیٹا اس کو پی لو شاہ صاحب روزے سے تھے۔ روزے کا کچھ خیال نہ کیا اور شربت پی لیا۔ لوگوں نے اس پر اعتراض کیا۔ فرمایا کہ روزے کی تلافی قضا سے ہو سکتی ہے مگر دل شکنی کی تلافی نہیں ہو سکتی اس واسطے میں نے پی لیا۔ ہمارے حاجی صاحب علیہ الرحمۃ نے اس قصہ کے متعلق فرمایا کہ شاہ صاحب پر اس وقت غلبۂ حال میں قلب کی فضیلت منکشف اور روزے کی فضیلت مستور تھی اس واسطے ایسا کیا اگر کوئی صاحب تمکین اور اپنی حالت پر غالب ہوتا تو وہ یوں کرتا کہ نرمی سے اس کا جواب دیکر اس کو بھی راضی رکھتا اور روزہ

بھی نہ توڑتا مغلوب الحال کی تقلید کسی دوسرے کو جائز نہیں اس کے واسطے خود شریعت کے صاف اور کھلے ہوئے احکام موجود ہیں جن میں کوئی کھٹکا نہیں۔ فی طلعة الشمس مایغنیک عن زحل

طریق سلوک عوام اور خواص دونوں کے لئے ہے اور اس کا بیان کہ مسلمان دنیادار نہیں ہوتا

یہ بتلا دینا بھی ضروری ہے کہ عوام یہ نہ سمجھیں کہ طریق سلوک خواص کے لئے ہے۔ ہم دنیاداروں کے لئے نہیں سو بات یہ ہے کہ سرے سے یہ تقسیم ہی صحیح نہیں کہ دنیاداروں کے لئے اور احکام اور دینداروں کے لئے اور احکام کیونکہ مسلمان ہونے کی حیثیت سے سب برابر ہیں اور احکام شرعی سب کے ساتھ یکساں متعلق ہیں۔ بلکہ حقیقت میں مسلمان دنیادار ہوتا ہی نہیں کیونکہ دنیاداری حقیقت میں یہ ہے کہ حرام و حلال میں کچھ امتیاز نہ رہے جس طرح سے بنے مال حاصل کرنے کو مقصود سمجھے۔ اگر کہیں دونوں غرضیں دین و دنیا کی جمع ہو جائیں تو دنیوی غرض کو مقدم رکھا جائے اور یہ خیال کیا جائے کہ دین سے ہم کو کوئی غرض نہیں کیونکہ شریعت کے احکام اس قدر دشوار ہیں کہ اگر ہم ان پر عمل کریں تو دنیا کی زندگی مشکل ہے سو ظاہر ہے کہ اسلام کے ساتھ ان خیالات کی گنجائش

کہاں ہے کیونکہ اس سے تو باری تعالیٰ کی تکذیب کی نوبت پہنچتی ہے، یُرِیْدُ اللّٰہُ بِکُمُ الْیُسْرَ وَلَا یُرِیْدُ بِکُمُ الْعُسْرَ وَلَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَہَا۔

شریعت کے اندر تنگی ہونے کا شبہ اور اس کا جواب

اور اگر یہ عذر کیا جائے کہ ہم تکذیب نہیں کرتے، مگر جب واقعات ہی روزمرہ اس امر کی شہادت دے رہے ہیں، کہ احکام شرعیہ پر چلنا بہت مشکل ہے تو ہمارا کیا قصور ہے اس اشتباہ کا جواب یہ ہے کہ ایک مشقت تو ہوتی ہے ذات حکم میں مثلاً وہ حکم فی حد ذاتہ سخت اور دشوار ہو یہ اصرار و اغلال کہلاتے ہیں۔ امم سابقہ میں بعضے ایسے احکام تھے مگر اس امت میں اس قسم کے احکام نہیں رکھے گئے اور ایک مشقت یہ ہے کہ در اصل ذات حکم میں تو کوئی دشواری نہیں مگر ہم نے اپنے اغراض فاسدہ کی وجہ سے خود اپنی حالت ایسی بگاڑ لی اور قوم نے متفق ہو کر شریعت کے خلاف عادتیں اختیار کر لیں کہ وہ رسم عام ہو گئی اور ظاہر ہے کہ جب اس رسم عام کیخلاف کوئی حکم شرعی پر چلنا چاہیگا تو ضرور اسکو اس آسان اور بے ضرر حکم میں دشواری پیدا ہو گی اسکی مثال ایسی ہے کہ جیسے کوئی طبیب کسی مریض کو دو پیسے کا نسخہ لکھدے مگر مریض چونکہ ایسے گاؤں میں رہتا ہے کہ جہاں کے لوگوں کی نادانی کی وجہ سے یا اس وجہ سے کہ وہ لوگ، اس قسم کی ضروری اور مفید

چیزوں کی رغبت نہیں رکھتے۔ وہ چیزیں وہاں نہیں آتیں اور نہیں
مل سکتیں۔ اس دو پیسے کے نسخہ کو وہاں نہیں پی سکتا۔ اب فی نفسہ
نسخہ گراں نہیں کمیاب نہیں مگر اس گاؤں والوں نے خود اپنا
دستور بگاڑ رکھا ہے۔ اس واسطے وہاں نہیں مل سکتا۔ اس
صورت میں ہر عاقل یہی کہے گا کہ علاج بالکل آسان ہے مگر یہ
قصور اس جگہ کے رہنے والوں کا ہے کہ ایسی معمولی چیزیں بھی
نہیں مل سکتیں۔ ایسا ہی ہمارا حال ہے کہ مجموعۂ قوم نے مل کر ایسی
حالت بگاڑ دی ہے کہ اب احکام شرعیہ کے بجالانے میں دشواری
پیدا ہو گئی ہے مثلاً بہانہ کیا جاتا ہے کہ تنخواہ کم ہے بھلا اگر رشوت
نہ لیں تو کام کیسے چلے اگر اپنے اخراجات اندازہ سے رکھے
جائیں تو تنخواہ کیوں نہ کفالت کرے یا مثلاً عام طور پر بیع آم کی
بیع پھل آنے سے پہلے کی جاتی ہے۔ اور اگر ایک بچنا چاہے تو
ضرور کسی قدر دقت پیش آتی ہے لیکن اگر سب اتفاق کر لیں
کہ اس طرح سے کوئی خرید و فروخت نہ کرے تو دیکھیں پھر کیا
دشواری پیش آتی ہے دشواری حقیقی تو وہ ہے کہ اگر سب
مل کر بھی اس کو دور کرنا چاہیں جب بھی وہ دور نہ ہو سکے اور جو
سب مل کر اس مذموم رسم اور طریق کو چھوڑنا چاہیں اور وہ چھوٹ
جائے تو یہ دشوار نہیں آسان ہے یہ عارضی دشواری تو صرف
اپنا طرز معاشرت بگاڑ دینے اور طریق عمل کو خراب کر دینے

سے پیدا ہوگئی ہے۔ سو یہ تنگی خود اپنے اوپر تنگی ڈال لینے سے ہوئی تعجب ہے کہ خود اپنی تنگی کو نہ دیکھیں، شریعت پر تنگی کا الزام دیں۔ جیسا کہ اس شیر نے جس کا قصہ مثنوی میں ہے خرگوش کے بہکانے سے اپنا عکس دیکھا اور اس کو دوسرا شیر سمجھ کر اس پر حملہ کرنے کو کوئیں میں کود پڑا۔ دراصل وہ خود اپنے اوپر حملہ کر رہا تھا۔ ایسے ہی ہم اپنے عیب کو آئینہ شریعت میں دیکھ رہے ہیں اور ناسمجھی سے اس کو شریعت کی تنگی بتا رہے ہیں۔ سو یہ درحقیقت شریعت پر حملہ نہ ہوا بلکہ خود اپنی ذات پر حملہ کر رہے ہیں ؎

حملہ بر خود می کنی اے سادہ مرد۔ ہمچو آں شیرے کہ بر خود حملہ کرد

ہماری تنگی کا یہی قصہ ہے۔

رشوت لینے کا عذر اور اس کا جواب

بعض لوگ عذر کرتے ہیں کہ ہم ناجائز معاملات رشوت ستانی وغیرہ ضرورت کی وجہ سے کرتے ہیں۔ مگر حقیقت میں وہ لوگ جس کو ضرورت کہتے ہیں وہ ضرورت ہی نہیں بلکہ محض حظوظ نفسانیہ ہیں جن کا نام ضرورت رکھ دیا ہے مثلاً کسی کی نوکری کے پیسے میں اتنی گنجائش ہے کہ معمولی درمیانی قیمت کے کپڑے پہن سکتا ہے مگر بیش قیمت زرق برق کپڑے بنانے

کی گنجائش نہیں اس صورت میں عقلمند آدمی کبھی بھی ایسے گراں قدر کپڑوں کی ضرورت تسلیم نہیں کر سکتا۔ کہ جس ضرورت کے واسطے رشوت وغیرہ لینا پڑے۔ اور اگر اس پر بھی کچھ تنگی ہو تو آخر صبر کی تعلیم اسی حالت کے لئے ہے اور جو مرتبہ صبر سے گذر جائے تو ایسے لوگوں کی امداد کے واسطے شریعت نے خاص قواعد مقرر کئے ہیں۔ اُن سے منتفع ہونا چاہیئے۔

ایک مثنوی کے شعر" اہل دنیا کافران مطلق اند الخ" کا حل

غرض مسلمان کو مسلمان ہونے کی حیثیت سے کسی حالت میں بھی دنیا کو دین پر ترجیح دینا جائز نہیں پس اس اعتبار سے مسلمان دنیا دار ہو ہی نہیں سکتا۔ صرف کفار ہی اہل دنیا ہیں جو دین کے مقابلہ میں دنیا کو ترجیح دیتے ہیں۔ اور اس شعر کا مطلب اس تقریر پر بالکل صاف ہو گیا ہے

اہل دنیا کافران مطلق اند　　روز و شب در بق بق و در بق بق اند

یعنی پہلے مصرعہ میں مبتدا موخر اور خبر مقدم ہے یعنی جو شخص کافران مطلق ہیں صرف وہی اہل دنیا ہیں۔ باقی مسلمان کی تو شان ہی اور ہے۔ اَللّٰہُ وَلِیُّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اس میں عام مومنین کے لئے درجہ ولایت کا ثابت کیا گیا ہے۔ گو وہ ولایت عامہ ہی ہو کیونکہ خاصہ میں اتنا اور زیادہ ہے اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَکَانُوْا یَتَّقُوْنَ۔

عود بجانب سرخی (طریق سلوک عوام اور خواص دونوں کے لئے ہے) الخ

اور اگر دنیا داری کے معنی عام لئے جائیں کہ طَلَبُ المَالِ وَلَوْ عَلٰی وَجْہِ الْحَلَالِ تو یہ منافی دین کے نہیں تاکہ ایسا شخص مخاطب احکام دینیہ کا نہ ہو کیونکہ خود حضرات انبیاء علیہم السّلام سے کاروبار دنیوی اکل و شرب و نکاح و صنعت وغیرہ سبھی کچھ ثابت ہے۔ غرض دنیوی کاروبار دین کے منافی نہیں بشرطیکہ وہ شریعت کے دائرے میں ہوں۔

اہل اللہ کبھی اپنے نفس کی بھی قدر کرنے لگتے ہیں اور اس کا راز

راز اس میں یہ ہے کہ کوئی چیز حتیٰ کہ اپنا نفس بھی ہمارا ملک حقیقی نہیں کہ جس طرح چاہیں اس میں تصرف کریں بلکہ یہ سب سرکاری چیز اسی ہیں۔ سرکاری حد سے زیادہ اس سے کام لینا یا سرکاری اصول کے خلاف اس کی بے قدری کرنا جائز نہیں۔ اہل اللہ اسی بنا پر کبھی اپنے نفس کی بھی قدر کرنے لگتے

ہیں اور عام لوگ کچھ اور سمجھ جاتے ہیں ؎

در نیابد حال پختہ ہیچ خام　　پس سخن کوتاہ باید والسّلام

سو وہ حضرات اس حیثیت سے اپنے نفس کی قدر کرتے ہیں کہ وہ اس نفس کو سرکاری چیز سمجھتے ہیں۔ اور اسی طرح ہاتھ پاؤں دماغ یہ سب سرکاری مشینیں ہیں جن کو ہمارے سپرد کیا گیا ہے اگر ہم اپنی بے اعتدالی سے ان کو بگاڑیں گے تو خود مورد عتاب مستوجب عذاب بنیں گے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کا صاف ارشاد ہے کہ اِنَّ لِنَفْسِکَ عَلَیْکَ حَقًّا وَ اِنَّ لِزَوْجِکَ عَلَیْکَ حَقًّا وَ اِنَّ لِعَیْنِکَ عَلَیْکَ حَقًّا اگر اپنے دل و دماغ آنکھ کی حفاظت اور خدمت اس نیت سے کریں گے کہ یہ ہمارے مولا کی سپرد کی ہوئی چیزیں ہیں ان کی عزّت اور حرمت خدمت و حفاظت ہم پر بوجہ عبد و خادم ہونے کے ضروری ہے تو اس میں بھی ثواب ملے گا۔ یہی معنی ہیں اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّیَّاتِ کے اور اس مرتبہ میں کہ ان اعضاء کو محبوب سے تعلق ہے کسی نے کہا ہے ؎

نازم بچشم خود کہ جمال تو دیدہ است　　افتم بپائے خود کہ بکویت رسیدہ است
ہر دم ہزار بوسہ زنم دست خویش را　　کو دامنت گرفتہ بسویم کشیدہ است

اور بعض کے کلام سے جو ان اشیاء کا اپنی طرف منسوب ہوتا اور اس نسبت کے درجہ میں ایسے اقوال صادر ہونا معلوم ہوتا ہے جیسے کہا گیا ہے ؎

بحمداللہ ہر شکم آید ز دو چشم روشن خود   کہ نظر دریغ باشد بچنیں لطیف روئے
تو یہ غلبہ ہے حال کا ورنہ اہل مقام کی تحقیق وہی ہے۔

جس چیز کو محبوب کے ساتھ تعلق ہوتا ہے وہ بھی محبوب ہو جاتی ہے مع ایک مثال کے

حکایت۔ حضرت جنید بغدادیؒ سے کسی نے کہا کہ جب آپ کو دولتِ وصول ہو چکی ہے۔ تو اب کیوں تسبیح رکھتے ہیں آپ نے کیا لطیف جواب دیا کہ میاں جس کی بدولت ہم کو یہ دولت ملی کیا اب اس رفیق کو چھوڑ دیں ہرگز نہیں۔ حدیث شریف میں آیا ہے کہ جو شخص اللہ کے رستہ میں جہاد کے لئے گھوڑا پالتا ہے اس گھوڑے کا بول و براز بھی ضائع نہیں جاتا بلکہ میزان اعمال میں اس کے اندازہ کے موافق اعمال رکھے جاویں گے اور ان پر ثواب ملے گا۔ یہ سب برکت نسبت الی اللہ کی ہے اور ایسی خسیس اشیاء کے حسنات میں شمار ہونے کی ایسی مثال ہے جیسے کوئی شخص مصری خریدے تو جو تنکا مصری میں ہوگا وہ بھی مصری کے بھاؤ ملے گا۔

دعاء کے اول و آخر درود شریف پڑھنے کا راز

اور دعاء کے اول و آخر درود شریف پڑھنے کی بھی یہی حکمت

ہے کہ درود شریف کو تو بہرحال اللہ تعالیٰ ضرور ہی قبول کریں گے۔
اور یہ ان کے کرم سے بعید ہے کہ اوّل و آخر کو تو قبول کر لیں اور
بیچ والی لپٹی ہوئی چیز کو ردّ کر دیں۔ اور درود شریف ضرور قبول
ہوتا ہے کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلّم اللہ تعالیٰ کے خاص و مقبول
و محبوب ہیں آپ پر بے کسی کی درخواست کے بھی رحمت فرماتے
ہیں۔ سو جب کسی نے آپ پر رحمت کرنے کی درخواست کی تو یہ گویا
اس شخص کی خیر خواہی ظاہر ہوئی جس سے یہ بھی مقبول ہو گیا۔ اور
اس کی ایسی مثال ہے کہ جیسے کوئی شخص ہر عید پر اپنے لڑکے کو کچھ
انعام دیا کرتا ہے تو وہ دے ہی گا۔ اگر کسی شخص نے اس کو انعام
دینے کی نسبت کچھ بھی دیا تو وہ شخص اس کہنے کی وجہ سے اس کہنے
والے پر بھی مہربان ہو جائیگا۔ اور یہ سمجھے گا کہ اس کو ہمارے لڑکے
سے محبت ہے۔ اس لئے درود شریف ضرور قبول ہوتا ہے اور
طفیل میں یہ شخص بھی جب درود شریف قبول ہو گا تو دعا جو اس
کے ساتھ ہے وہ بھی ضرور قبول ہو گی۔ ایسی ہی مثال ہے جیسے کھانڈ
کے چنے کے اندر چنا ہوتا ہے اور اوپر کھانڈ لپٹی ہوئی ہوتی ہے۔
اس مٹھائی کے سبب وہ چنے بھی مٹھائی کے حساب میں بکتے ہیں۔
کیونکہ ان پر کھانڈ لپٹی ہوئی ہے۔ اس واسطے وہ اسی کے حکم میں
ہو گئی۔ اسی طرح وہ دعا بھی گویا درود شریف کے حکم میں ہو گئی یا
جیسے چنے مٹھائی کے ساتھ جاتے ہیں اور پھر ان کو کوئی واپس نہیں کرتا

نماز کے لئے جماعت کے مشروع ہونے کا راز اور اس کے متعلق ایک شبہ اور اس کا جواب

اور یہی راز و حکمت ہے نماز میں جماعت کی کیونکہ ع

بداں را بہ نیکاں بہ بخشد کریم

جماعت میں نیک بھی ہوتے ہیں ان کی نماز غالباً قبول ہوگی۔ اور بروں کی نماز بھی چونکہ نیکوں کے ساتھ ہے اس واسطے وہ بھی قبول ہو جاوے گی۔ اس کی ایک فقہی نظیر ہے وہ یہ کہ اگر متعدد اشیاء ایک سودے سے خریدی جائیں تو یا سب واپس کی جاتی ہیں یا سب رکھی جاتی ہیں۔ اور جو ہر ایک کا الگ الگ سودا ہوتا ہے تو معیب کو واپس کر سکتے ہیں۔ پس اللہ تعالیٰ بھی بندوں سے یہی معاملہ کرتے ہیں۔ اس لئے جماعت مشروع فرمائی گئی۔ کیونکہ یہ تو مستبعد ہے کہ سب کی نمازیں واپس فرمائیں۔ تو سب ہی کو قبول فرمالیں گے۔ البتہ اس میں ایک شبہ یہ رہ گیا کہ جماعت تو صرف فرضوں کے ساتھ مخصوص ہے وہ تو اس جماعت کے ذریعہ سے قبول ہوگئی مگر سنت باقی رہ گئی۔ اس کا جواب یہ ہے کہ تابع ہمیشہ اپنے متبوع کے حکم میں ہوا کرتا ہے سنتیں تابع ہیں فرضوں کی وہ بھی فرضوں کے ساتھ قبول ہو جائیں گی۔ جیسے کوئی شخص گائے بھینس خریدے تو اس کے

رسّہ وغیرہ بھی گو وہ کیسے ہی بوسیدہ ہوں لے لیتا ہے۔ غرض انضمام واقتران کے یہ فوائد ہیں۔

رجوع بجانب سرخی (جس چیز کو محبوب کے ساتھ تعلق ہوتا ہے وہ بھی محبوب ہو جاتی ہے الخ)

اسی طرح اگر کوئی شخص اعمال دنیویہ میں بھی نیت خیر رکھے گا تو اس کو ضرور ثواب ملے گا۔

حکایت - ایک بزرگ کی حکایت ہے کہ کسی اپنے مرید کے گھر گئے وہاں ان کے گھر روشندان دیکھا۔ پوچھا یہ کیوں رکھا ہے اس نے جواب دیا۔ روشنی کے واسطے انہوں نے فرمایا کہ روشنی تو بدوں نیت روشنی بھی آتی اگر اسکے رکھنے میں یہ نیت کر لیتا کہ اس میں سے اذان کی آواز آیا کریگی۔ تو تجھے اس کا ثواب بھی ملتا رہتا۔ اور روشنی تو خود آ ہی جاتی مطلب یہ ہے کہ نیت صالحہ رکھنے سے سب اعمال دنیوی بھی قابل ثواب بن جاتے ہیں۔

رجوع بجانب (طریق سلوک عوام اور خواص دونوں کے لئے ہے اور اس کا بیان کہ مسلمان دنیا دار نہیں ہو سکتا)

پس ایسی دنیا منافی دین نہیں پس ایسا دنیا دار بھی دیندار ہی ہے

اور پہلے معنی کر دنیا دار کوئی مسلمان نہیں تو سب مسلمان دیندار ہی ہوئے اور دو قسمیں بن کر کوئی فرق نہیں ہوا یہ دیندار و دنیادار کا فرق بوجہ جہل بالاحکام کے ہم نے تراش لیا ہے اور جب فرق نہ ہوا تو کیا وجہ ہے کہ دستور العمل الگ الگ رکھا جائے یہ بات جدا رہی کہ حالت عذر و ضرورت میں کسی کے لئے کچھ تخفیف کر دی جائے سو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ دستور العمل ہر ایک کے واسطے الگ الگ تجویز کیا جائے دستور العمل تو ایک ہی رہیگا۔ مواقع ضرورت اس سے مستثنےٰ سمجھے جائیں گے۔

یَا اَیُّهَا الْمُزَّمِّلُ کی تفسیر اور اس کا بیان کہ کامل باوجود کمال کے لوازم بشریت سے نہیں نکلتا اور اس کا راز

حق تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں یَا اَیُّهَا الْمُزَّمِّلُ قُمِ الَّيْلَ اِلَّا قَلِيْلاً نِّصْفَهٗ اَوِ انْقُصْ مِنْهُ قَلِيْلاً اَوْ زِدْ عَلَيْهِ الآیۃ مزمل کے معنی ہیں چادر اوڑھنے والا چونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کفار کی تکذیب سے بہت تکلیف ہوئی تھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تو چاہتے تھے کہ یہ کمبخت ایمان لے آئیں تاکہ نار جہنم سے چھوٹ جائیں اور وہ لوگ ایمان تو کیا لاتے الٹی تکذیب پر کمر باندھ رکھی تھی اور آیات الٰہی سے تمسخر اور مقابلہ کیا کرتے تھے اس وجہ سے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم

بوجہ شدت غم و رنج و حزن و ملال کے چادر اوڑھ کر بیٹھ گئے تھے اس لئے خاص اس حالت کے اعتبار سے یَا اَیُّهَا الْمُزَّمِّلُ ندا و خطاب ہیں فرمایا گیا تاکہ آنحضرت کو ایک گونہ تسلی ہو اس کی مثال ایسی ہے کہ جیسے کوئی شخص ہجوم اعداء اور ان کے طعن و تشنیع سے پریشان ہو رہا ہو اس وقت اس کا محبوب خاص ایسی حالت کے عنوان سے اس کو پکارے جس کے ساتھ اس کا تلبس ہے تو دیکھئے اس شخص کو کتنی تسلی ہو گی اور اس لفظ کی لذت اس کو کتنی معلوم ہو گی جس کی ایک وجہ یہ خیال بھی ہوتا ہے کہ محبوب کو میرے حال پر نظر ہے ایسا ہی یہاں بھی یَا اَیُّهَا الْمُزَّمِّلُ کے عنوان سے جو کہ مناسب وقت کے ہے ندا کر کے آنحضرت کو تسکین دی گئی ہے اور بعد اس کے بعض اعمال کا حکم دیا جاتا ہے اور ان بعض عارضی احوال پر صبر کرنے کا ارشاد فرماتے ہیں چنانچہ ایک دوسرے مقام پر بھی اسی طرح ارشاد فرمایا ہے کہ فَاصْبِرْ عَلٰی مَا یَقُوْلُوْنَ وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ اس کی ایسی مثال ہے کہ جیسے اوپر کی مثال میں اس شخص کا محبوب اس کو یہ کہے کہ میاں تم ہم سے باتیں کرو ہم کو دیکھو دشمنوں کو بکنے دو جو بکتے ہیں آؤ تم ہم سے باتیں کرو یہ کام کرو وہ کام کرو اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تو ایسا تسلیہ بذریعۂ وحی کے ہوا مگر امت میں اہل اللہ کو اس قسم کے خطابات وغیرہ بذریعہ الہام اور واردات کے ہوتے ہیں اور اس مقام پر لفظ مزمل کی تفسیر سے ایک مسئلہ نکلتا ہے وہ یہ کہ سابقًا

معلوم ہو چکا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چادر اوڑھنے کی وجہ شدت ملال و حزن تھی اس سے ثابت ہوا کہ کامل باوجود کمال کے لوازم بشریت سے نہیں نکلتا جیسا یہاں پر بوجہ تکذیب مخالفین کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مغموم ہونا معلوم ہوتا ہے۔ ہاں اتنا فرق ہے کہ ہم لوگوں کا غم ایسے مواقع پر بوجہ تنگ دلی و ضعف تحمل کے ہوتا ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا غم بوجہ غایت شفقت اور رحم کے تھا۔ آپ اس پر مغموم تھے کہ اگر یہ لوگ ایمان نہ لائیں گے تو جہنم میں جائیں گے۔ اس وجہ سے ان پر رحم آتا تھا اور غم پیدا ہوتا تھا چنانچہ ارشاد ہے لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ الخ ۔

کار پاکاں را قیاس از خود مگیر — گرچہ ماند در نوشتن شیر و شیر

مگر یہ تو ثابت ہوا کہ کامل باوجود کمال عرفان کے لوازم طبعی سے نہیں نکلتا اور یہی ہونا بھی چاہیئے کیونکہ اگر کسی کو اذیت و مصیبت میں تکلیف جو لازم طبعی ہے محسوس نہ ہو تو صبر کیسے متحقق ہوگا۔ کیونکہ صبر تو نام ہے ناگوار چیز پر ضبط نفس کرنے کا اور جب کسی کو کوئی چیز ناگوار ہی نہ معلوم ہو تو ضبط کیا کرے گا۔

غلبۂ حال کا کمال نہ ہونا اور ایک مغلوب الحال کی حکایت اور اس کا ناقص ہونا مع دلیل اور مثال

البتہ غلبۂ حال میں محسوس نہ ہونا اور بات ہے لیکن غلبۂ حال

خود کوئی کمال کی چیز نہیں - ایک بزرگ کی حکایت ہے کہ بیٹے کے مرنے کی خبر سُنی تو قہقہہ لگا کر ہنسے اور ادھر آنحضرت کا اپنے بیٹے ابراہیم پر آنسو بہانا ثابت ہے اور یہ فرمانا کہ اِنَّا بِفِرَاقِكَ يَا اِبْرَاهِيْمُ لَمَحْزُوْنُوْنَ اب اگر کسی ظاہر بیں شخص کے سامنے یہ دونوں قصے بیان کر دیئے جائیں اور یہ نہ ظاہر کیا جائے کہ یہ قصہ کس کا ہے اور وہ کس کا تو ظاہر بات ہے کہ یہ شخص پہلے بزرگ کو جنہوں نے قہقہہ لگایا - زیادہ باکمال سمجھے گا - حالانکہ یہ مسئلہ مسلم و بدیہی ہے کہ ولی کسی حال میں نبی سے نہیں بڑھ سکتا - اور یہ بھی مسلم ہے کہ اولیاء کے کمالات انبیاء کے کمالات سے مستفاد ہیں سو در اصل ان دونوں قصوں کی حقیقت یہ ہے کہ اس ولی کی نظر صرف حقوق حق پر تھی حقوق عباد و اولاد کی اہمیت اس کے قلب سے مستور تھی اس واسطے حقوق عباد کا اثر ظاہر نہیں ہوا - جو ترحم کی وجہ سے غم پیدا ہوتا - اور آنحضرت کی نظر دونوں حقوق پر تھی حقوق حق پر بھی اور حقوق عباد پر بھی اللہ تعالیٰ کے حقوق کی رعایت سے تو صبر کیا اور جزع فزع نہیں کیا اور حقوق عباد یعنی ترحم علے الاولاد کی وجہ سے آنسو جاری ہوئے سخت دلی نہیں کی اِنَّمَا يَرْحَمُ اللّٰهُ مِنْ عِبَادِهِ الرُّحَمَاءَ اس کی ایک مثال ہے مثلاً آئینہ کے دیکھنے والے تین قسم کے ہوتے ہیں ایک تو وہ جو ضرورت سے خریداری وغیرہ کی صرف آئینہ کو دیکھتے ہیں اس کی موٹائی چوڑائی شفافیت پر ان کی نظر ہوتی ہے یہ مثال ہے ..

محجوبین غافلین اہل صورت کی اور ایک وہ کہ صرف اس چیز کو دیکھتے ہیں جو کہ آئینہ میں منعکس ہوتی ہے اور آئینہ کو نہیں دیکھتے یہ مثال ہے غیر کاملین مغلوب الحالی لوگوں کی یہ غلبۂ حال سے مظہر کو نہیں دیکھتے صرف ظاہر کو دیکھتے ہیں اور ایک وہ جو آئینہ اور صورت منعکسہ دونوں کو دیکھتے ہیں اور دونوں کے حقوق کی رعایت کرتے ہیں اس کو جمع الجمع کہتے ہیں۔ یہ شان ہے انبیاء علیہم السلام اور عارفین کاملین کی کہ حقوق حق کی رعایت کے ساتھ حقوق عباد کی رعایت بھی ان کے نصب العین رہتی ہے یہ لوگ جامع ہیں ؎

بر کفے جام شریعت بر کفے سندان عشق ہر ہوسناکے نداند جام و سنداں باختن

ایسی باریکیوں کے سمجھنے کے واسطے بڑے فہم کی ضرورت ہے ورنہ ظاہر میں تو ناگوار نہ گذرنا زیادہ کمال معلوم ہوتا ہے بہ نسبت ناگوار گذرنے کے۔

بعض حالات کمال سمجھے جاتے ہیں حالانکہ ان میں نقصان پوشیدہ ہوتا ہے۔

اسی طرح دوسری کیفیات وجدانیہ کے تفاضل میں اسی قسم کی غلطی واقع ہوتی ہے کہ بعض باتیں کمال سمجھی جاتی ہیں حالانکہ ان میں کوئی نقص خفی ہوتا ہے جیسے مبالغہ فی التواضع مقتضی ہو

جاتا ہے ناشکری کی طرف کیونکہ اس میں ابہام ہو جاتا ہے انکار نعمت کا - ایسا ہی بعض آدمی کہہ دیتے ہیں کہ ہم نے ذکر و شغل کیا مگر کچھ نہیں ہوا اور سمجھتے ہیں کہ یہ کہنا انکسار ہے حالانکہ علاوہ ناشکری نعمت ذکر کے اس میں ایک نقصان یہ بھی ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے اپنے ذکر و شغل کو اس قابل سمجھا کہ اس کو قبول کیا جاوے اور اس کے صلہ میں ان کو بڑا رتبہ دیا جاوے اور یہ کبر ہے -

ذاکر کو ثمرات کا طالب نہ ہونا چاہیئے

یہ نفس کے بڑے بڑے مکر ہیں ان لوگوں کو یہ خبر نہیں کہ ذکر خود ایک مستقل نعمت ہے -

حکایت - ہمارے حضرت حاجی صاحبؒ سے اگر کوئی خادم اس قسم کی شکایت کرتا تو آپ فرماتے کہ خود ذکر کی توفیق ہونا کیا تھوڑی نعمت ہے، جو دوسرے ثمرات کی تمنا کرتے ہو اور اور اکثر ایسے موقع پر یہ شعر پڑھا کرتے تھے ؎

یابم اورا یا نیابم جستجوئے مے کنم ۔ حاصل آید یا نیاید آرزوئے مے کنم

ع- بلا بودے اگر ایں ہم نہ بودے الخ کسی خادم نے حضرت سے بیان کیا تھا کہ میں نے ابسکے چلّہ کھینچا اور روزانہ سوا لاکھ اسم ذات پڑھا مگر کچھ فائدہ نہ ہوا شاید حضرت مجھ سے ناراض ہیں کہ ثمرہ نہیں ملا -

فرمایا کہ اگر ہیں ناراض ہوتا تو تمہیں سوا لاکھ پڑھنے کی توفیق ہی کہاں ہوتی۔ اور ثمرات کے طالب ایک اور بہت بڑی غلطی میں ہیں کیونکہ وہ سمجھ بیٹھے ہیں کہ یہ ثمرات اصل مقصود ہیں۔ اور اعمال مقصود بالعرض اور یہ سخت غلطی ہے۔ اعمال خود مقصود بالذات ہیں اور اصل ثمرہ ان کا حصول رضا، دخول جنت، دیدار خداوندی ہے۔ افسوس کہ طالب ثمرات عشق میں مجنون سے بھی کم ہیں وہ تو لیلےٰ کے نام کی مشق کو بڑا مقصود سمجھ رہا ہے اور یہ لوگ دوسری چیزوں کی تلاش میں ہیں۔ کیا مولیٰ کا عشق لیلیٰ کے عشق سے بھی کم ہے ؎

دید مجنوں را یکے صحرا نورد | دربیابان غمش بنشستہ فرد
ریگ کاغذ بود انگشتاں قلم | مے نمودے بہر کس نامہ رقم
گفت اے مجنون شیدا چیست ایں | می نویسی نامہ بہر کیست ایں
گفت مشق نام لیلےٰ مے کنم | خاطر خود را تسلی میدہم
ہمینم لب کہ دانند ماہ روئم | کہ من نیز از خریداران اویم

کبھی ثمرات کا قصد مت کرو۔ یہ تو ایک قسم کی مزدوری ہوئی جو کہ عشق و محبت کے سراسر خلاف ہے ؎

تو بندگی چو گدایاں بشرط مزد مکن | کہ خواجہ خود روش بندہ پروری داند

حکایت ۔ ایک عارف کو غیب سے آواز آئی کہ تمہاری عبادت قبول نہیں ہوئی انھوں نے اس پر بھی عبادت کو نہ چھوڑا۔ بلکہ

بدستور اسی طور پر پھر بھی عبادت کرتے رہے کسی نے اُن سے کہا کہ جب تمہاری عبادت قبول نہیں ہوتی تو پھر اس کے کرنے کی کیا ضرورت ہے انھوں نے کیا اچھا جواب دیا کہ بھائی اگر کوئی اور دروازہ ہوتا تو اس کو چھوڑ کر اس طرف چلے جاتے جب دوسرا دروازہ ہی نہیں پھر اور کہاں جائیں اور کیا چارہ کریں ؎

توانی ازاں دل بپرداختن　　که دانی که بے او تواں ساختن

پس معاً غیب سے آواز آئی کہ جب ہمارے سوا تمہارا اور کوئی نہیں تو خیر جیسی کچھ ہے وہی قبول ہے ؎

قبول است گرچہ ہنر نیستت　　که جز ما پناہے دگر نیستت

عبادت میں تو بجز رضائے خدا کے اور ثمرات کا طلب کرنا بھی اخلاص کے بالکل خلاف ہے۔ وَمَآ أُمِرُوٓا۟ إِلَّا لِيَعْبُدُوا۟ ٱللَّهَ مُخْلِصِينَ لَهُ ٱلدِّينَ ؎

از خدا غیر خدا را خواستن　　ظن افزونیست کلی کاستن

بارد و صاف ترا حکم نیست دم درکش　　که آنچہ ساقی ما ریخت عین الطاف است

میلان طبیعت کا معاصی کیطرف کمال کے منافی نہیں بشرطیکہ اُس کے مقتضیٰ پر عمل نہ ہو اور کاملین و غیر کاملین کا فرق

اور اوپر جو بیان ہوا ہے کہ کامل لوازم بشریہ سے نہیں نکلتا اس سے ایک بات یہ بھی ثابت ہوئی کہ طبیعت کا میلان انسانی خواہشوں

کی طرف یہ ایک امر طبعی ہے، سو طبیعت کا میلان اگر کسی معصیت کی طرف ہو یہ منافی کمال نہیں۔ بعض لوگ یہ غلطی کرتے ہیں کہ میلان کو بھی مقبولیت و تقویٰ کے خلاف سمجھتے ہیں اور پھر جی ہی جی میں کڑھتے ہیں اور قلب کی ساری توجہ اسی فکر و غم میں مصروف کر دیتے ہیں مثلاً پہلے کبھی کسی کے ساتھ تعشق تھا پھر اللہ تعالیٰ نے توفیق توبہ کی عطا فرمائی اور وہ تعلق نہ رہا۔ اب اگر حصول کمال کے بعد کبھی طبیعت کی رغبت اس طرف معلوم ہونے لگے تو پریشان ہوتے ہیں اور خیال کرتے ہیں کہ میلان بھی تقویٰ کے خلاف ہے خوب سمجھ لینا چاہیئے کہ خود معصیت تو خلاف تقویٰ ہے میلان معصیت اس کے خلاف نہیں۔ میلان معصیت بعض اوقات بعد کمال کے بھی زائل نہیں ہوتا۔ اس کے زوال کی فکر فضول ہے۔ ہاں البتہ کاملین اور دوسرے میں یہ فرق ہے کہ کاملین کا میلان غیر ثابت اور مغلوب ہوتا ہے۔ تھوڑے سے تذکرے سے زائل ہو جاتا ہے۔ جناب باری ارشاد فرماتے ہیں اِذَا مَسَّهُمْ طٰٓئِفٌ مِّنَ الشَّيْطٰنِ تَذَكَّرُوْا فَاِذَا هُمْ مُّبْصِرُوْنَ اور اس سے پہلے وَاِمَّا يَنْزَغَنَّكَ مِنَ الشَّيْطٰنِ نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ اور متوسطین اہل سلوک کا میلان ذرا شدید ہوتا ہے، دل کو بہت تنگی پیش آتی ہے اور مجاہدہ سے مغلوب ہوتا ہے اور محجوبین کا میلان ان پر غالب ہو جاتا ہے۔ اور حقیقت میں اگر میلان نہ رہے تو معاصی سے بچنا کوئی کمال ہی نہیں۔ اور میلان

ہیں مجاہدہ کرنا پڑتا ہے اور مجاہدہ سے ترقی ہوتی ہے یہی وجہ ہے کہ ملائکہ کو ان مدارج میں ترقی نہیں ہے۔ کیونکہ ان میں مجاہدہ متصور نہیں اور بشر میں مجاہدہ بوجہ میلان اور رغبت معاصی کے متصور ہے اس لئے ان کے مدارج میں سبیل لاتقف عند حد ترقی ہوتی رہتی ہے۔

معاصی کی طرف میلان کے منافی کمال نہ ہونے اور قرب عہد نبوّت کی برکت پر حکایت

حکایت ۔ حکیم ترمذی ایک بزرگ گزرے ہیں۔ جوانی میں ان پر ایک عورت عاشق ہو گئی تھی۔ اور ہر وقت ان کی تلاش اور جستجو میں رہتی آخر کار ایک دن موقع پر ایک باغ میں ان کو دیکھا اور وہ باغ چاروں طرف سے چاردیواری کی وجہ سے بند تھا وہاں پہنچکر اس نے اپنے مطلب کی درخواست کی یہ گھبرائے اور گناہ سے بچنے کی غرض سے بھاگ کر دیوار سے کود پڑے۔ اس قصّے کے بعد ایک روز بڑھاپے کے زمانہ میں وسوسے کے طور پر خیال آیا کہ اگر میں اس عورت کی دلشکنی نہ کرتا اور اس کا مطلب پورا کر دیتا اور پیچھے توبہ کر لیتا تو یہ گناہ بھی معاف ہو جاتا۔ اور اس کی دلشکنی بھی نہ ہوتی اس وسوسہ کا آنا تھا کہ بہت پریشان ہوئے اور روئے ؎

بر دل سالک ہزاراں غم بود ۔۔۔ گر ز باغ دل خلالے کم شود

اور اس پر قلق ہوا کہ جوانی میں تو میں اس گناہ سے اس کوشش سے بچا اور آج بڑھاپے میں یہ حال ہے۔ اور یہ سمجھے کہ جو کچھ میں نے اعمال اشغال کئے ہیں وہ سب غارت اور اکارت گئے اس پر حکیم موصوف نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھا کہ فرماتے ہیں کہ اے حکیم کیوں غم کرتے ہو تمہارا درجہ وہی ہے اور جو کچھ تم نے کیا وہ ضائع نہیں ہوا اور اس وسوسہ کی یہ وجہ تھی کہ یہ زمانہ وسوسہ کا میرے زمانہ سے دور ہو گیا تھا۔ اور اس گناہ سے بچنے کی یہ وجہ ہے کہ وہ زمانہ میرے زمانہ سے بہت قریب تھا۔ اور قرب عہد نبوی میں برکت ہے۔

حکایت - ایک بزرگ اسی وجہ سے باسی روٹی کو پسند فرمایا کرتے تھے کہ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ سے قریب ہے اور تازی میں کسی قدر بعد آگیا ہے سبحان اللہ جب قرب عہد نبوت میں یہ برکت ہے تو ارشادات نبوت پر عمل کرنے میں کیسی برکت ہوگی۔

حکایت - ایک مولوی صاحب کہ طبیب بھی تھے مجھ سے اپنا قصہ بیان فرماتے تھے کہ میں بیمار ہوا بخار تھا۔ ہر چند علاج کیا مگر کچھ فائدہ نہ ہوا آخر کار میں نے اس حدیث کے مطابق جس میں بخار کا علاج غسل سے آیا ہے نہر میں غسل کیا۔ ان کا بیان ہے کہ اس کے بعد مجھے اور بیماریاں تو ہوئیں مگر بخار کبھی نہیں ہوا۔ ہر چند کہ بعض شراح اس علاج غسل کو غیر مادی بخار کے ساتھ مخصوص فرماتے ہیں۔ مگر اہل عقیدت کے لئے سب اقسام کو عام ہے۔ علاوہ ازیں یہ مسئلہ طبیہ ہے کہ دوا معین ہے فاعل نہیں سو اہل عقیدت کی طبیعت

ہیں اس عمل سے قوت ہوگی اور وہ اپنی قوت سے فعل کریگی۔ حکیم ترمذی کے اس قصہ سے معلوم ہو گیا ہوگا کہ باوجود میلان کے کہ ان کو میلان معصیت کا ہوا۔ ان کے کمال کی تصدیق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے رویائے صادقہ میں فرمائی۔

بعض طالبین کا یہ کوشش کرنا کہ ہم میں بُرے کام کی رغبت ہی پیدا نہ ہو بالکل غلط ہے اور اس کا علاج

اور اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ بعض لوگ جو شیوخ سے یہ درخواست کرتے ہیں کہ کوئی ایسی چیز بتا دیجئے کہ کبھی ہم میں بُرے کام کی رغبت ہی نہ پیدا ہو یہ بالکل غلطی ہے اور منشا اس کا ناواقفی ہے انسان جب تک زندہ ہے لوازم بشریہ سے چھوٹ نہیں سکتا کبھی نہ کبھی کچھ نہ کچھ وسوسہ یا خیال آہی جاتا ہے چنانچہ حدیث شریف میں آیا ہے کہ اگر کسی عورت کے دیکھنے وغیرہ سے اس کی طرف میلان یا وسوسہ معلوم ہو تو اپنے گھر میں بیوی سے رفع حاجت کرے اِنَّ الَّذِیْ مَعَھَا مِثْلُ الَّذِیْ مَعَھَا اس علاج سے وہ طبیعت کا میلان دور ہو جائیگا۔ اطباء نے بھی تعشق کا علاج تزوج لکھا ہے۔ اگر خاص معشوقہ سے ہو تو بہت ہی بہتر ہے ورنہ غیر جگہ بھی نکاح کرنے سے دوسرے کے تعشق میں کمی آجاتی ہے۔

باقی تھوڑا بہت میلان تو تمام عمر رہتا ہے۔ اگر اس کے مقتضی پر عمل نہ ہو تو اس کی فکر نہ کرنا چاہیئے۔ کیونکہ اس کی طرف توجہ کرنے سے اور اس فکر میں پڑنے سے وہ اور بڑھے گا اور تنگی پیش آویگی۔ اور سالک اس جھگڑے میں پھنس کر مطالعہ محبوب سے غافل ہو جاوے گا۔

اور انسان صرف مطالعہ محبوب ہی کے لئے پیدا ہوا ہے اس کو دوسری جانب اتنی توجہ ہی نہ کرنی چاہیئے۔ اگر ان باتوں کی طرف طبیعت کو نہ لگایا جائیگا یہ آپ سے آپ دور ہو جاوے گی۔ بالخصوص وسوسہ کا تو علاج یہی ہے۔ کہ اس کی طرف خیال ہی نہ کرے اور اپنی توجہ ذکر کی طرف رکھے۔ اس سے وہ وسوسہ خود بخود جاتا رہتا ہے اور یہ بھی سمجھ لینا چاہیئے کہ وسوسہ کا آنا کوئی نقصان کی بات نہیں ہے۔

اس کی وجہ سے جو تنگی پیدا ہوتی ہے وہ موجب تصفیہ قلب ہو جاتی ہے اور اس کے دور کرنے میں جو مجاہدہ ہوتا ہے اس سے رفع درجات ہوتا ہے اور وہ جو بیان کیا گیا کہ ایسی چھوٹی چھوٹی باتوں کیا اپنے اوپر بدگمانی نہ کرے اور ان باتوں کی طرف زیادہ التفات نہ کرے۔ اور زیادہ موشگافی اور باریک بینی سے کرید کرید کر عیوب کو نہ دیکھے یہ خواص اہل طریق کے واسطے ہے کیونکہ وہ اس طرف لگ کر مطالعۂ محبوب سے غافل ہو جائیں گے۔ باقی عوام کو بیفکر ہونا نہ چاہیئے کیونکہ اگر وہ اپنے عیوب کی نگہداشت اس مستعدی سے نہ کریں گے تو اور بڑے بڑے گناہوں میں گرفتار ہو جائیں گے۔

دستور العمل برائے سالک متضمن باصلاح اغلاط کہ سالک را اکثر ابتلا بدان واقع میشود و تفسیر بعض آیات سورۂ مزمل

ارشاد ہوتا ہے یٰۤاَیُّهَا الْمُزَّمِّلُ قُمِ الَّیْلَ اِلَّا قَلِیْلًا الآیہ

ہرچند کہ یہ خطاب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ہے مگر حکم اس کا امّت کو بھی شامل ہے۔ اب ندائے یٰۤاَیُّهَا الْمُزَّمِّلُ کے بعد احکام کا بیان شروع ہوتا ہے۔ حاصل احکام کا یہ ہے کہ تعلق دو طرح کے ہیں۔ ایک خالق کے ساتھ دوسرا مخلوق کے ساتھ۔ مخلوق کے ساتھ جو تعلق ہے وہ دو قسم کا ہے۔ موافق کے ساتھ اور مخالف کے ساتھ ان ہی تعلقات کے متعلق اعمال و آداب میں سے چند امر بیان ہوتے ہیں اوّل تعلق خالق کے ساتھ ہے اس کے متعلق ارشاد ہوتا ہے۔ قُمِ الَّیْلَ اِلَّا قَلِیْلًا اس میں ایک تو قیام و طاعت کا ادب تعلیم کیا ہے اور اس کے ساتھ اقتصاد (میانہ روی) کا ارشاد فرمایا ہے۔ ادب یہ کہ قیام لیل کے لئے وہ وقت مقرر فرمایا گیا جو کہ نہ بھوک کی تکلیف کا وقت ہے اور نہ معدہ کی پُری کا وقت ہے۔ کہ طبیعت میں گرانی اور بوجھ ہو اور قیام میں کدورت ہو بلکہ ایسا وقت دونوں تکلیفوں سے خالی ہے اور طبیعت میں نشاط اور سرور ہوتا ہے اور اس میں تشبّہ بالملائکہ بھی ہوتا ہے کیونکہ ان کی بھی شان

ہے کہ نہ بھوک لگے نہ کھانے سے گرانبار ہوں اور نیز رات کے وقت یکسوئی بھی ہوتی ہے اور اقتصاد یہ کہ ساری رات کے قیام کا حکم نہیں دیا کیونکہ اس میں سخت تعب تھا۔ بلکہ کچھ حصّہ سونے کے لئے بھی رکھا گیا۔ اور چونکہ ہر وقت اور ہر حالت اور ہر شخص کے لئے ایک مقدار معین نہیں ہو سکتی۔ اس لئے و تخییر یہ سے نصف اور ثلث اور دو ثلث میں جو مفہوم ہے اَوِ انْقُصْ مِنْهُ قَلِيلًا اَوْ زِدْ عَلَيْهِ کا جیسا دوسرے رکوع سے معلوم ہوتا ہے اختیار دیکر مخاطب کی رائے پر چھوڑا گیا۔ کہ اگر زیادہ قیام نہ ہو سکے تو تھوڑا ہی سہی حدیث میں ہے۔ وَ تَسِیْحُوْ مِنَ الدُّلْجَۃِ اس اقتصاد میں ایک یہ بھی حکمت اور مصلحت ہے کہ توسط میں دوام ہو سکتا ہے اور افراط میں دوام نہیں ہو سکتا۔ اور پہلے یہ قیام لیل کہ مراد تہجد ہے فرض تھا۔ بعد اس کے فرضیت منسوخ ہو کر مسنونیت باقی رہ گئی اور اقرب الی الدلیل تہجد کا سنت موکدہ ہونا ہے تہجد سے محروم رہنے والوں کو اکثر غلطیاں ہو رہی ہیں۔ بعض لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ تہجد صرف اخیر ہی شب میں ہوتا ہے اور اس وقت اٹھنا دشوار ہے اس لئے انھوں نے چھوڑ رکھا ہے یاد رکھو کہ اگر اخیر شب میں نہ اٹھ سکے تو اول شب میں بھی وتر سے پہلے تہجد پڑھنا جائز ہے بعضے یہ سمجھے ہوئے ہیں کہ تہجد کے بعد سونا نہ چاہیئے۔ اور سونے سے تہجد جاتا رہتا ہے یہ لوگ اس لئے نہیں اٹھتے یہ بھی غلطی ہے۔ تہجد کے بعد سونا بھی جائز

بعد اول رات میں ہرگز دیر نہیں بعد

سورۃ ...

ہے غرض اہل سلوک کے لئے یہ عمل تہجد کا بھی ضروری ہے اور اگر کبھی قضا ہو جائے تو زیادہ غم میں نہ پڑے۔ تہجد کی قضا دن میں کر لے اس آیت سے یہی مراد ہے۔ وَهُوَ الَّذِي جَعَلَ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ خِلْفَةً لِّمَنْ أَرَادَ أَن يَذَّكَّرَ لیکن بعض لوگوں کا اگر تہجد قضا ہو جائے تو حد سے زیادہ پریشان ہوتے ہیں اور کراہتے ہیں۔ اور افسوس کرتے ہیں کہ ہمارا تہجد کبھی قضا نہ ہوا تھا۔ یہ کیا ہو گیا۔ یاد رکھو اتنی پریشانی کا انجام بعض اوقات یہ ہوتا ہے کہ بجائے مطالعہ محبوب کے اپنے مطالعہ میں مشغول ہو جاتے ہیں۔ حالانکہ اس غم میں لگ کر اصل ذکر سے جو کہ مقصود ہے رہ جاتے ہیں اور انسان مطالعہ محبوب کے لئے پیدا ہوا ہے اس کو غیر میں مشغول نہ ہونا چاہیئے

ع ماضی و مستقبلت پردہ خدا است

غرض نفس کو پریشانی میں زیادہ نہ مبتلا کیا جاوے اور تجربہ ہے کہ بعض اوقات آسانی رکھنے سے نفس خوشی سے کام دیتا ہے اور تنگی اور بوجھ ڈالنے سے پہلا کام بھی چھوٹ جاتا ہے۔ اس لئے بہت تنگی نہ کرو کہ مزدور خوشدل کند کار بیش۔ بعض محققین کا قول ہے کہ ذاکر شاغل کو مرغن کھانا کھانا چاہیئے۔ ورنہ ضعف ہو جائیگا۔ اور کسی وقت بیکار ہو جائیگا۔ خوب کھاؤ پیو اور اس سے کام لو البتہ یہ یاد رہے کہ کھانے پینے میں ایسی زیادتی نہ ہو کہ کسل ہو جائے یا بیماری ہو جائے اور بیمار ہو کر اور خرابی میں پڑ جائے اسی لئے کُلُوا وَاشْرَبُوا کے

کے ساتھ وَلَا تُسْرِفُوا بھی فرمایا ہے۔

حکایت۔ حضرات اہل بیت میں سے کسی بزرگ کا قصہ ہے کہ ان سے کسی نصرانی حکیم نے پوچھا تھا کہ قرآن شریف کو کتاب جامع کہتے ہیں اس میں طب کہ ضروری چیز ہے نہیں ہے فرمایا اصل طب موجود ہے كُلُوا وَاشْرَبُوا وَلَا تُسْرِفُوا۔ وہ دنگ رہ گیا۔

حکایت۔ بطور جملہ معترضہ کے یاد آگیا کہ غالب جو کہ آزاد شاعر ہے اس نے اپنے مذاق پر یہ شعر کہا تھا ؎

ہم توبہ جب کریں گے شراب و کباب سے … قرآں میں جو آیا کُلُوا وَاشْرَبُوا نہ ہو

کسی نے اس کا خوب جواب دیا ؎

تسلیم قول آپ کا ہم جب کریں جناب … جب آگے وَاشْرَبُوا کے وَلَا تُسْرِفُوا نہ ہو

ایسا ہی روحانی تنگی قبض حسرت وغیرہ سے بھی پریشان نہ ہونا چاہیئے۔ کیونکہ اس میں بھی . . . . . . تزکیہ نفس ہوا کرتا ہے خاص کر وسوسہ کی طرف تو التفات بھی نہ کرنا چاہیئے۔ کیونکہ در پے ہوتے ہو اس میں اور بھی ترقی ہوتی ہے۔ محقق اس کی طرف التفات بھی نہیں کرتا اور وسوسہ کے پیچھے پڑنے میں اس کے سوا اور بھی بہت خرابیاں ہیں۔ اسی ایک وسوسہ سے اور شاخیں نکلنی شروع ہوتی ہیں۔ اور دل غم سو وہ الگ ہے اور غم کی وجہ سے اصل ذکر و شغل کا فوت ہونا یہ الگ ہے ایسا ہی استغفار اور توبہ کے وقت معاصی کے تذکرہ استحضار میں ایک قسم کا توسط ہونا چاہیئے۔ یہ ضروری نہیں کہ سب گناہوں

کی پوری فہرست پڑھنے بیٹھ جائے صرف اجمالی طور پر سب گناہوں سے توبہ کرے ہر گناہ کا نام ضروری نہیں۔ حدیث میں ہے رمااننت اعلم بہ اس سے بھی یہی بات نکلتی ہے۔ اس میں سب گناہ آگئے اگرچہ یاد نہ آئیں۔ کیونکہ اس سوچ میں وقت ضائع کرنا مطالعہ محبوب سے غافل ہونا ہے۔ البتہ جو خود یاد آجائے اس سے بالخصوص بھی توبہ کرلے۔

حکایت۔ ایک شخص کا ذکر ہے کہ رمی جمار کے وقت وہاں جو تنیاں مار رہا تھا اور ایک ایک گناہ گن گن کر شیطان کو گالیاں دیتا تھا۔ اور مارتا تھا۔ سو یہ لغو ہے ہر ایک گناہ کا نام لینا اور تلاش اور سوچ میں عمر عزیز کو جو دراصل مطالعہ محبوب کے لئے تھی اس سوچ بچار میں کھونا نہ چاہیئے۔

عمر عزیز قابل سوز و گداز نیست ایں رشتہ را بسوز کہ چندیں دراز نیست

اہل سلوک کو بالخصوص اس کا خیال بہت ضروری ہے کہ مطالعہ محبوب سے غفلت نہ ہو واقع میں عارف ہی کی نظر ان امور تک پہنچتی ہے۔

حکایت۔ حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے کسی خادم نے اس بات کا افسوس ظاہر کیا کہ اب کی بیماری کی وجہ سے مدت تک حرم میں حاضر ہونا نصیب نہ ہوا۔ آپ نے خواص سے فرمایا کہ اگر یہ شخص عارف ہوتا تو اس پر کبھی افسوس نہ کرتا۔ کیونکہ مقصود قرب حق ہے اور اس کے لئے جس طرح نماز حرم ایک طریق ہے اسی طرح

اس کے لئے مرض بھی ایک طریق ہے۔ تو بندہ کا کیا منصب ہے کہ اپنے لئے خود ایک طریق معین کرے یہ مربی کے اختیار میں ہے طبیب کی تجویز مرض یا کی تجویز سے ہزار درجہ زیادہ بہتر ہے ؎

بدرد و صاف ترا حکم نیست دم درکش کہ ہرچہ ساقیٔ ما ریخت عین الطاف است

یہ سب بیان تھا قیام لیل اور اس کے آداب کا اقتصاد کے ساتھ اب دوسرا معمول اہل سلوک کا مذکور ہوتا ہے وَرَتِّلِ الْقُرْآنَ تَرْتِيلًا ترتیل کے معنی ہیں تھام تھام کر پڑھنا۔

صحابہ کے زمانہ میں تلاوت اور تکثیر نوافل بھی حصول نسبت کے لئے کافی تھے بعد میں ذکر کے اندر قیود اور خاصہ تغیر زمانہ کی وجہ سے علاجاً ایجاد کی گئیں

صحابہ کے زمانہ میں ایک یہ بھی طریق حصول نسبت کا تھا کہ قرآن اور نماز پر مداومت اور محافظت کرتے تھے۔ چنانچہ حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب کا حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے خواب میں دریافت کرنا کہ آجکل کے صوفیہ کے طریقوں میں سے کونسا طریقہ آپ کے موافق ہے اس کے جواب میں حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا یہ ارشاد کہ ہمارے زمانے میں تقرب کا ذریعہ ذکر کے ساتھ قرآن اور نماز ہی تھا اور

اب صرف ذکر پر اکتفا کر لیا ہے مشہور ہے اور اس تغیر کی ایک وجہ ہے وہ یہ کہ صحابہؓ کے قلوب بہ برکت صحبت نبوی اس قابل تھے کہ ان کو اذکار و قیود کی جو بعد میں حادث ہوئیں ضرورت نہ تھی۔ ان کے قلوب میں صحبت نبوی کے فیض سے خلوص پیدا ہو چکا تھا وہ حضرات تلاوت قرآن اور کثرت نوافل سے بھی نسبت حاصل کر سکتے تھے ان کو اذکار کے قیود زائدہ کی حاجت نہ تھی۔ برخلاف بعد کے لوگوں کے کہ ان میں وہ خلوص بدون اہتمام کے پیدا نہیں ہو سکتا۔ اس لئے صوفیہ کرام نے کہ اپنے فن کے مجتہد گزرے ہیں اذکار و اشغال خاصہ اور ان کی قیود ایجاد کیں اس وجہ سے کہ تجربہ سے معلوم ہوا ہے کہ خلوت میں جب ایک ہی اسم کا بہ تکرار ورد کیا جاتا ہے اور اس کے ساتھ ضرب و جہر وغیرہ قیود مناسبہ کا بھی لحاظ کیا جاتا ہے تو اس کی تاثیر نفس و قلب میں اوقع و اثبت ہوتی ہے اور رقت و سوز پیدا ہو کر موجب محبت ہو جاتا ہے اور محبت سے عبادت میں اخلاص پیدا ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ عبادت خالص کا حکم فرماتے ہیں وَمَا اُمِرُوْا اِلَّا لِيَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ وَاُمِرْتُ اَنْ اَعْبُدَ الخ وغیرہ من الآیات۔ پس معلوم ہوا کہ حضرات صوفیہ نے یہ قیود ذکر کے بطور معالجہ تجویز فرمائے ہیں اور اصل مقصود وہی اخلاص ہے۔ پس اگر کسی شخص کو ان قیود سے مناسبت نہ ہو یا بغیر ان قیود کے کسی کو اذکار مسنونہ نوافل و تلاوت قرآن میں پورا اخلاص پیدا

ہو سکتا ہو تو صوفیہ کرام ایسے شخص کے لئے ان قیود کی ضرورت نہیں سمجھتے۔ پس اب معلوم ہو گیا کہ یہ تمام قیود اصلاح و تقویت کے واسطے علاجاً تجویز کئے گئے ہیں کوئی شرعی امر قربت مقصودہ نہیں سمجھا جاتا جو بدعت کہا جائے۔

رجوع بجانب شرح (دستور العمل برائے سالک الخ)

الحاصل یہ دوسرا دستور العمل تھا۔ اہل سلوک کے واسطے یعنی تلاوت قرآن اس کے بعد ارشاد فرماتے ہیں اِنَّا سَنُلْقِیْ عَلَیْکَ قَوْلًا ثَقِیْلًا۔ اس کو ماقبل سے اس طور پر ربط ہے کہ مراد قَوْلًا ثَقِیْلًا سے وحی ہے جو کہ ثقیل تھی۔ اور نماز اور تلاوت کلام مجید کی مزاولت سے قوت احتمال اثقال وحی کی پیدا ہو گی۔ اس لئے پہلے نماز اور تلاوت کا حکم فرمایا پھر اِنَّا سَنُلْقِیْ الخ میں وحی کا وعدہ کیا اب اس کی تحقیق کہ نزول وحی کے وقت ثقل معلوم ہونے کا کیا سبب تھا سو یہ امر عقول متوسطہ سے خارج ہے باقی روایات سے ثقل ہونا ثابت ہے چنانچہ نزول وحی کے وقت اونٹنی کا بیٹھ جانا اور ایک صحابی کا یہ قول کہ نزول وحی کے وقت (جبکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ران ان کی ران پر تھی) یہ معلوم ہوتا تھا کہ میری ران بیٹھی جاتی ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو سخت شدت سرمائیں بھی نزول وحی کے وقت پسینہ آجانا الخ

ثقل کے آثار روایات میں وارد ہیں۔ اور ان آیات میں کہ اَلَمۡ نَشۡرَحۡ لَکَ صَدۡرَکَ وَوَضَعۡنَا عَنۡکَ وِزۡرَکَ الَّذِیۡ اَنۡقَضَ ظَهۡرَکَ۔ یہ شرح صدر اور وضع وزر جو موجب نقض ظہر تھا میرے نزدیک اسی طرف اشارہ ہے اور آیت لَوۡ اَنۡزَلۡنَا هٰذَا الۡقُرۡاٰنَ عَلٰی جَبَلٍ۔ اس معنی میں بھی بہت ہی صاف ہے اور عبادت اور تلاوت اور فکر کی مزاولت اور کثرت سے قوت کا پیدا ہونا اور ثقل وحی کے احتمال کی طاقت پیدا ہو جانا اس طور پر ہے کہ چونکہ ذکر وغیرہ سے واردات اور فیوض غیبیہ عملی و علمی قلب پر فائض ہوتے ہیں ان کے ورود سے قلب میں بتدریج قوت پیدا ہوتی رہتی ہے جس کی وجہ سے شدت و ثقل کا مقابلہ اس کے لئے آسان ہو جاتا ہے چنانچہ اہل تلوین کا اضطراب اور اہل تمکین کا استقلال اسی وجہ سے ہے کہ پہلے قلب میں قوت تحمل کی نہ تھی پھر ذکر کی کثرت سے احتمال اثقال کی طاقت آگئی۔ اور اس شعر میں ان ہی واردات میں سے بعض کا ذکر ہے ؎

بینی اندر خود علوم انبیا　　بے کتاب و بے معید و اوستا

اور یہ حالات واردہ مختلف قسم کے ہوتے ہیں کبھی ذوق و شوق و سرور و انبساط ہوتا ہے کبھی حزن و انقباض ہوتا ہے۔ بسط کے الگ فائدے ہیں اور قبض کے علیحدہ مصالح اور سب محمود ہیں۔ کیونکہ قبض میں بھی تزکیہ نفس و اصلاح عجیب ہوتی ہے ؎

چونکہ قبض آمد تو در وے بسط بیں　　تازہ باش و چیں میفگن بر جبیں،
چونکہ قبض آید ترا اے راہرو،　　آں صلاح تست آئس دل مشو

آگے ارشاد ہوتا ہے کہ اِنَّ نَاشِئَةَ الَّیْلِ ھِیَ اَشَدُّ وَطْأً وَّ اَقْوَمُ قِیْلًا ط اس آیت میں یہ ارشاد ہے کہ رات کو اٹھنے کے وقت کیونکہ شور و شغب سے سکون ہوتا ہے اور اشغال معاش کا بھی وقت نہیں ہوتا۔ اس لئے قلب میں یکسوئی ہوتی ہے اور اس لئے اس وقت جو کچھ زبان سے پڑھا جاتا ہے دل کو اس سے بہت تاثیر ہوتی ہے اور جو کچھ کیا جاتا ہے اسکا اثر قوی ہوتا ہے تو گویا اس آیت میں اِنَّ نَاشِئَةَ الَّیْلِ الخ مضمون آیت ماقبل قُمِ الَّیْلَ وَرَتِّلِ الْقُرْاٰنَ الخ کی تعلیل ہے کہ اس وقت بوجہ ان اسباب کے حضور قلب زیادہ ہوتا ہے لہٰذا قیام لیل و ترتیل کا فائدہ اس وقت پورے طور سے حاصل ہوگا۔

حضور قلب کا نہایت آسان طریقہ

اور حضور قلب کے متعلق ایک طریقہ تجربہ سے معلوم ہوا ہے وہ یہ کہ مبتدی ہر ہر لفظ پر بتکلف مستقل ارادہ کرے اسی طرح الفاظ پر توجہ رہنے سے حضور قلب حاصل ہو جاتا ہے اور بعد چندے ملکہ ہو جاتا ہے زیادہ تکلف کی ضرورت نہیں ہوتی اور منتہی کو ملاحظہ ذات سے حضور میسر ہو سکتا ہے ابتداء میں یہ مشکل ہے کیونکہ مبتدی

کو غائب کا تصور رہتا نہیں اور منتہی ذات کا ملاحظہ رکھا سکتا ہے۔

(رجوع بجانب سرخی او ستو الحمل برائے سالک)

اس کے بعد فرماتے ہیں اِنَّ لَكَ فِی النَّهَارِ سَبْحًا طَوِیْلًا۔ پہلے بطور حکمت کے بیان ہوا ہے کہ تہجد اور قرآن مجید پڑھا جائے کیونکہ اس وقت اس کا اثر زیادہ ہوگا۔ اب اس کے علاوہ ایک اور وجہ بیان فرماتے ہیں کہ آپ کو دن میں اور کام بھی رہتے ہیں ان کی وجہ سے خاص قسم کی توجہ الی اللہ تام نہیں ہو سکتی۔ اس لئے یہ وقت شب کا کہ مصروفیت سے خالی ہے تجویز کیا گیا اور وہ کاروبار یہ ہیں مثلاً تبلیغ دین تربیت خلائق۔ حوائج ضروریہ لازمیہ لبشریت ہر چند کہ تبلیغ دین اور تربیت خلائق خود بھی دین ہے لیکن چونکہ ان میں ایک قسم کا تعلق مخلوق سے بھی ہوتا ہے۔ لہٰذا اس میں خاص قسم کی توجہ الی اللہ پورے طور پر نہیں ہو سکتی۔ جیسی خاص خلوت میں ہو سکتی ہے۔

خلق کیطرف مشغولی منافی کمال کے نہیں اور اس کا بیان کہ صاحب کمال کی بھی ہر وقت یکساں حالت نہیں رہتی اور اسکی حکمتیں

یہاں سے بھی اس اوپر والی بات کی تائید ہوتی ہے کہ انسان باوجود کمالی

کے بھی لوازم بشریہ سے بالکل چھوٹ نہیں سکتا۔ دیکھئے آیت صاف دلالت کر رہی ہے نہار کا سبح طویل یکسوئی سے ایک درجہ میں آپ کو بھی مانع ہو جاتا۔ اور چونکہ آپ کے تمام احوال کامل ہیں اس سے معلوم ہوا کہ خلق کی طرف مشغول ہونا منافی کمال نہیں۔ پس صاحب کمال پر بھی ہر وقت یکساں حالت نہیں رہتی۔

حکایت ۔ حضرت ابوبکر صدیق رض اور حضرت حنظلہ رض کا قصہ حدیث میں ہے کہ حضرت حنظلہ رض نے اپنے کو اس بناء پر منافق کہا کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے کچھ اور حالت ہوتی ہے اور پیچھے کچھ اور۔ اس پر حضرت صدیق اکبر نے فرمایا کہ یہ حالت تو ہماری بھی ہے آخر یہ قصہ حضور میں پہنچا اس پر آنحضرت نے فرمایا ولکن یَا حَنظَلَۃُ سَاعَۃً وَّ سَاعَۃً ۔ ایک گھڑی کیسی ایک گھڑی کیسی درحقیقت اگر ہر وقت وہی حالت تجلی کی رہے خود جسمانی ترکیب بھی ٹھیک نہ رہے اول تو تعطل ہو گا کیونکہ حالت علیہ میں انتظام تغذیہ وغیرہ کا ممکن نہیں پھر اس سے فنا کی نوبت آجائے گی۔ ولنعم ما قیل ؎

چو سلطان عزت علم برکشد   جہاں سر بجیب عدم درکشد

دوسری مصلحت یہ بھی ہے کہ ذوق و لذت جب ہی آتی ہے کہ اس حالت میں دوام نہ ہو ورنہ دوام سے غیر حادث ہو جائیگی

اور لذت جو بہ سبب حدوث کے معلوم ہوتی نہ رہیگی کہ کل جدید لذیذ۔ اس کے علاوہ ایک اور حکمت بھی ہے وہ یہ کہ غلبۂ استغراق میں قصد نہ رہیگا۔ اور بلا قصد کے اعمال کا اجر نہیں اور بلا اعمال قرب نہیں ملتا۔ اور اعمال ہی دنیا میں مقصود ہیں۔ دنیا میں انہیں اعمال کے واسطے بھیجا گیا ہے ورنہ دنیا میں آنے سے پہلے روح کو خود ایسی حالتیں حاصل تھیں۔ اور حضور دائم میسر تھا۔ مگر اعمال نہ تھے۔ ان کے واسطے دنیا میں بھیجا گیا لہٰذا اعمال اور ان کا اجر امر مہتم بالشان ٹھہرا۔ اس لئے محققین صوفیہ نے فرمایا ہے کہ استغراق میں ترقی نہیں ہوتی۔ ان سب باتوں سے معلوم ہو گیا کہ تجلی میں جیسی حکمتیں ہیں ویسی ہی استتار میں بھی ہیں۔

کامل کو بعد تکمیل بھی ذکر سے غفلت نہ چاہیئے

اور یہاں ایک فائدہ قابل غور معلوم ہوا وہ یہ ہے کہ باوجودیکہ تبلیغ دین و تعلیم احکام متعدی نفع ہے اور وہ نفع لازمی سے بڑھکر ہے اس لئے منتہی کو اس کا زیادہ اہتمام ہوتا ہے۔ مگر بایں ہمہ یہ ارشاد ہے کہ چونکہ آپ کو دن میں بہت کام رہتے ہیں رات کو تہجد اور قرآن پڑھا کیجئے۔ اور ایک دوسری جگہ فرماتے ہیں کہ فَاِذَا فَرَغْتَ فَانْصَبْ وَاِلٰی رَبِّکَ فَارْغَبْ اس سے یہ ثابت ہوا کہ کامل کو اپنے لئے بھی کچھ نہ کچھ ضرور کرنا چاہیئے

اور بعد تکمیل بھی ذکر سے غفلت نہ چاہیئے ۔ ورنہ خود اس کا وہ حال رہیگا نہ دوسروں کو اس سے کامل نفع پہنچے گا کیونکہ بدون خود کئے ہوئے تعلیم میں برکت نہیں ہوتی یہی معنی ہیں قول مشہور من لا ورد لہ لا وارد لہ کے البتہ یہ غلطی ہے کہ منتہی قطع تعلق کرکے دوام خلوت اختیار کرلے سے

طریقت بجز خدمت خلق نیست   بہ تسبیح و سجادہ و دلق نیست

سالک بلا اجازت شیخ خود اپنے کو قابلِ ارشاد نہ سمجھے اور نہ ذکر و شغل اس نیت سے کرے

لیکن خود اپنے کو قابل ارشاد نہ سمجھنے لگے ۔ البتہ جب شیخ اجازت دیدے تو امتثالاً اس کام کو بھی شروع کردے اور پہلے سے اس کی نیت کرنا سخت مضر ہے اور اس نیت کے ساتھ کامیابی مشکل ہے ۔ وجہ یہ کہ یہ نیت بڑا بننے کا شعبہ ہے ۔

رجوع بجانب سُرخی (خلق کی طرف مشغولی منافی کمال کے نہیں الخ)

اب کامل کی توجہ الی الخلق میں ایک شبہ رہا وہ یہ کہ اشتغال بالخلق

اس کو یاد حق سے مانع ہوگا۔ سو اس شبہ کی منتہی کامل کے حق میں گنجائش نہیں کیونکہ منتہی کی بہ سبب وسعت صدر کے یہ حالت ہوتی ہے کہ اس کو شغل خلق یاد حق سے مانع نہیں ہوتا۔ اور نیز خلق کے ساتھ اس کا مشغول ہونا بھی بامر حق ہوتا ہے اور اس کو مقصود اس سے امتثال امر اور رضائے حق جل وعلا ہی ہوتی ہے اور خلق کی طرف اس کی توجہ خدا ہی کے لئے ہوتی ہے اس لئے اس کو اشتغال بالخلق مانع عن الحق نہیں ہو سکتا بلکہ یہ اشتغال خود حقوق خالق سے ہے۔

تربیت اور ارشاد کے وقت بھی خدا تعالیٰ سے غفلت نہ ہونی چاہیئے

اور اس آیت میں سَبۡحًا طَوِيۡلًا بطور جملہ معترضہ کے مخلوق کے حق کی طرف اشارہ ہے اور مخلوق کا وہ حق یہ ہے کہ نصح عام تربیت ارشاد لیکن اس حق خلق میں حق خالق کو نہ بھولنا چاہیئے۔ چنانچہ یہاں بھی مخلوق کے حقوق کے بیان سے پہلے قُمِ الَّيۡلَ الخ میں حقوق اللہ بیان کئے گئے تھے۔ اور مخلوق کے حقوق کے بعد بھی وَاذۡكُرِ اسۡمَ رَبِّكَ فرمایا گیا ہے تو گویا یہ اشارہ ہے اس طرف کہ اس شغل میں ہمیں نہ بھول جانا اول آخر دونوں

جگہ یاد دلایا گیا ہے۔

مبتدی کو ذکر اور تلاوت کے وقت کیا تصوّر رکھنا چاہیئے

اور وَاذْکُرِ اسْمَ رَبِّکَ میں اکثر مفسّرین لفظ اسم کو زائد کہتے ہیں اور بعض زائد نہیں قرار دیتے اور اس اختلاف سے یہاں ایک عجیب مسئلہ مستفاد ہو گیا۔ اور اختلافِ امّتی رحمۃ کا ظہور ہو گیا۔ اور وہ مسئلہ یہ ہے کہ زیادت اسم کا قول تو موافق حالت منتہی کے ہے۔ اور عدم زیادت کا قول موافق حالت مبتدی کے ہے۔ کیونکہ مبتدی کو خود مسمّٰی اور مذکور کا تصوّر کم جمتا ہے اس کے لئے یہی کافی ہے کہ اسم ہی کا تصوّر ہو جائے۔ برخلاف منتہی کے اس کو ملاحظہ ذات بلا واسطہ سہل ہے۔ اور حدیث اَنْ تَعْبُدَ اللّٰہَ کَاَنَّکَ تَرَاہُ میں مشہور توجیہ پر منتہی کا طریق اور اس کی حالت کا بیان ہے اور عام لوگوں کے لئے حضور کا ایک سہل اور مفید طریق خدا کے فضل سے سمجھ میں آیا ہے وہ یہ کہ آدمی یہ خیال کرے کہ گویا اللہ تعالیٰ نے قرآن کی تلاوت فرمائش کی ہے۔ اور میں اس فرمائش پر اس کو سُنا رہا ہوں اس سے بہت آسانی سے حضور میسّر ہو جاتا ہے۔

رجوع بجانب سرخی (دستور العمل برائے سالک) الخ

اور غیر اللہ سے قطع تعلق کرنیکے معنی اور تبض کے فوائد

اس کے بعد ارشاد ہے وَتَبَتَّلْ اِلَیْہِ تَبْتِیْلًا۔ اس میں دو احتمال ہیں ایک یہ کہ تبتل کو صرف وَاذْکُرِ اسْمَ رَبِّکَ کے متعلق کیا جائے تو اس صورت میں تبتل سے اشارہ ہوگا۔ مراقبہ کی طرف یعنی ذکر کے ساتھ مراقبہ ہو اور ایک یہ کہ تبتل کو مستقل حکم کہا جائے۔ مطلب یہ ہوگا کہ علاوہ احکام مذکورہ کے یہ بھی حکم ہے کہ سب سے قطع تعلق کرو بایں معنی کہ سب کا تعلق اللہ تعالیٰ کے تعلق علمی اور حبی سے مغلوب ہو جائے اور اثر اس مغلوبیت کا تعارض مقاصد کے وقت معلوم ہوتا ہے مثلاً ایک وقت میں دو کام متضاد پیش آئے ایک کام تو اللہ تعالیٰ کے تعلق کا ہے اور دوسرا غیر اللہ کے تعلق کا اور دونوں کا جمع ہونا ممکن نہ ہو تو ایسے وقت پر اللہ کے کام کو اختیار کرنا اور خلاف مرضی حق کو چھوڑ دینا بس یہی معنی ہے قطع تعلق کے نہ یہ کہ کسی سے کوئی واسطہ ہی نہ رکھے ؎

تعلق حجاب ست و بے حاصلی ۔ چو پیوندہا بگسلی واصلی

البتہ اختلاط میں افراط کرنا مضر ہے اس کے آگے فرماتے ہیں کہ

رَبُّ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ فَاتَّخِذْهُ وَكِيْلًا
مطلب یہ کہ اللہ پر توکل کرو۔ اس سے معلوم ہوا کہ اہل سلوک کے لئے توکل کی بھی ضرورت ہے اور یہ ان کا معمول ہونا چاہیئے۔ نکتہ اس توکل کی تعلیم میں یہ ہے کہ اعمال مذکورہ بالا کے اختیار کرنے کے بعد حالت میں تغیر و تبدل قبض و بسط شروع ہوگا اس میں ضرورت توکل کی ہوگی۔ اس لئے فرماتے ہیں کہ آخر وہ مشرق و مغرب کا رب ہے۔ اس لئے اس رب نے جو حالت تم پر وارد کی ہے اس میں کوئی حکمت ضرور ہوگی۔ اور ثابت ہے کہ اکثر قبض میں تصفیہ و تزکیہ خوب ہوتا ہے اس لئے تم کو تنگ دل نہ ہونا چاہیئے اور خدا پر بھروسہ رکھنا چاہیئے اس میں کچھ مصلحت رکھی ہوگی اور مشرق و مغرب کا ذکر قبض و بسط کی حالت کے کس قدر مناسب ہے۔ مشرق تو حالت بسط کے مناسب ہے کہ اس میں ظہور ہوتا ہے واردات کا اور مغرب مناسب ہے حالت قبض کے پس مشرق و مغرب کا نمونہ باطن انسان میں بھی پایا گیا۔ ونعم ما قیل ؎

آسمانہاست در ولایت جاں، کار فرمائے آسمان جہاں
در رہ روح پست و بالا ہاست کوہ ہائے بلند و بالا ہاست

اور جس طرح مغرب میں آفتاب مستور ہوتا ہے معدوم نہیں ہوتا۔ اسی طرح قبض میں کیفیات سلب نہیں ہوتیں بلکہ مستور ہو جاتی ہیں اور پھر بسط میں گویا طلوع ہو جاتی ہیں۔ حاصل کل کا یہ ہوا

اہل سلوک کے لئے یہاں چند ضروری معمول بیان کئے گئے قیام لیل[1] یعنی تہجد تلاوت[2] قرآن۔ تبلیغ[3] دین۔ ذکر[4] و تبتل[5]۔ توکل[6] اور چونکہ تعلق خلق کی دو قسم ہیں ایک موافقین کے ساتھ اس کا بیان اشارۃً اِنَّ لَكَ فِي النَّهَارِ سَبْحًا طَوِيلًا میں ہوا ہے جس کا حاصل تبلیغ دین اور ارشاد و تربیت ہے۔ چونکہ موافقین سے تعلق محبت کا ہے اس کے حقوق بوجہ اس کے کہ وہ حالت طبعی ہے تقاضائے حب کی وجہ سے خود بخود ادا ہو جاتے ہیں۔ اس لئے اس میں زیادہ اہتمام کی ضرورت نہ ہوئی البتہ مخالف کے معاملہ میں ممکن تھا کہ کچھ افراط و تفریط ہو جاتی اس لئے اس کا بیان اہتمام سے فرماتے ہیں وَاصْبِرْ عَلَىٰ مَا يَقُولُونَ وَاهْجُرْهُمْ هَجْرًا جَمِيلًا ط مطلب یہ کہ مخالف کی ایذا پر صبر کیجئے اور ان سے علیحدہ رہیئے۔ اچھے طور پر کہیں ایسا نہ ہو کہ سختی سے ان کی آتش عناد اور بھڑک اٹھے اور زیادہ تکلیف پہنچائیں۔ ہجر جمیل سے مراد قطع تعلق ہے اس طرح پر کہ قلب میں تنگی نہ ہو پس جب صبر کی تعلیم دی گئی تو اس کی تسہیل کے لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ان سے اپنے انتقام لینے کی خبر سنا کر آپ کی تسلی بھی فرمائی جاتی ہے کہ وَذَرْنِي وَالْمُكَذِّبِينَ أُولِي النَّعْمَةِ وَمَهِّلْهُمْ قَلِيلًا۔ یعنی مخالفین کے معاملہ کو ہم پر چھوڑ دیجئے۔ ہم ان سے پورا بدلہ لے لیں گے۔ یہ خدا تعالیٰ کی عادت ہے کہ اہل حق کے مخالفین سے پورا

انتقام لیتے ہیں اس لئے بھی مناسب یہی ہے صبر اختیار کیا جائے۔ کیونکہ جب اپنے سے بالا دست بدلہ لینے والا موجود ہے۔ تو کیوں فکر کی جائے۔ خدا تعالیٰ کی اس سنت کے موافق مخالف کو آخرت اور دنیا دونوں میں رسوائی ہو جاتی ہے ؎

بس تجربہ کردیم دریں دیر مکافات
با دردکشاں ہر کہ درافتاد برافتاد

ہیچ قومے را خدا رسوا نہ کرد
تا دل صاحبدلے نامد بدرد

اہل تصوف کے لباس خاص اختیار کرنے کی وجہ

اور یٰاَیُّھَا الْمُزَّمِّلُ میں دو لطیفے بھی معلوم ہوئے ایک یہ کہ جس طرح آپ بوجہ غایت حزن والم اپنے اوپر چادر اوڑھے ہوئے تھے اسی طرح بعض اہل طریق کا معمول ہوتا ہے کہ چادر ایسے طور پر لپیٹ لیتے ہیں کہ نظر منتشر نہ ہو اور اس سے قلب منتشر نہ ہو اور جمعیت کے ساتھ ذکر میں لگا رہے سو سر الطیفہ یہ ہے کہ اَلْمُزَّمِّلُ کے معنی عرف عام میں کمبل اوڑھنا بھی ہے تو یٰاَیُّھَا الْمُزَّمِّلُ میں اشارہ ہوگا لقب یٰاَیُّھَا الصُّوْفِیُّ کی طرف کیونکہ لفظ صوفی میں گو اختلاف ہے مگر ظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ مراد موٹا کپڑا کمبل وغیرہ مراد لیا جائے پس صوفی اور مزمل متقارب المعنی ہوئے اور اہل تصوف نے یہ لباس اس لئے اختیار کیا تھا کہ جلدی پھٹے نہیں۔ جلدی میلا نہ ہو اور بار بار دھونا نہ پڑے۔ اور بعض اہل شفقت اس خاص

وجہ سے بھی یہ شعار رکھتے تھے کہ مستور ہونے کی حالت میں بعض لوگ ان کو ایذا پہنچا کر مبتلائے وبالی ہوجاتے تھے۔ اس لئے انھوں نے ایک علامت مقررہ کی جیسے آیت ذٰلِكَ اَدْنٰى اَنْ يُّعْرَفْنَ فَلَا يُؤْذَيْنَ اس کی نظیر ہے پس یہ حکمتیں تھیں اس لباس میں اور اب تو محض ریا وسمعہ کی غرض سے پہنتے ہیں جو بالکل اس شعر کا مصداق ہے ؎

نقد صوفی نہ ہمہ صافی بےغش باشد ۔ اے بسا خرقہ کہ مستوجب آتش باشد

اس لئے یہ اب قابل ترک ہوگیا ہے۔

معاصی خواہ کبائر ہوں یا صغائر سب ہی سے پرہیز کرنا چاہیئے کیونکہ اصل حقیقت کے اعتبار سے ہر گناہ کبیرہ ہی ہے مع دلیل اور مثال

ہر گناہ گو وہ صغیرہ ہو اپنی حقیقت کے اعتبار سے عظیم ہی ہے کیونکہ حقیقت گناہ کی نافرمانی ہے۔ اللہ تعالیٰ جل جلالہٗ کی اور ظاہر ہے کہ نافرمانی گو کسی قسم کی ہو نیادہ ہی بری ہے اور گناہوں کے درجات میں جو چھوٹائی بڑائی کا تفاوت ہے وہ ایک دوسرے کی نسبت سے ہے یعنی ایک بہت بڑا گناہ ہے۔ اور دوسرا اس سے

چھوٹا ورنہ اصل حقیقت کے اعتبار سے سب گناہ بڑے ہی ہیں۔
کسی کو ہلکا نہ سمجھنا چاہیئے اس چھوٹے بڑے ہونے کی ایسی مثال
ہے کہ جیسے آسمان دنیا عرش سے تو چھوٹا ہے مگر در حقیقت
کوئی چھوٹی چیز نہیں دوسری مثال ناپاکی اور پلیدی کی ہے کہ
پلیدی چاہے تھوڑی ہو یا بہت مگر حقیقت تو دونوں کی پلیدی
ہے۔ اور راز اس میں یہ ہے کہ جتنی کسی کی عظمت اور احسان ہوتا ہے
اتنی ہی اسکی نافرمانی کرنا بری بات ہے اور یہ ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کی عظمت اور احسان کے
برابر نہ کسی کی عظمت نہ کسی کا احسان تو اسکی نافرمانی سب سے زیادہ بری ہوگی پس وہ اپنی امر
حقیقت اور مقتضا کے اعتبار سے عظیم گناہ ہوگی اور اسکا مقتضا یہ تھا کہ گناہ کا ارتکاب
نہ کیا جاتا۔ مگر پھر جو اس پر جرأت کرتے ہو تو اس جرأت کے چند
اسباب ہیں۔ بعضے گناہ کو تو صغیرہ سمجھ کر ارتکاب کر لیا جاتا ہے۔
حالانکہ اسی راز کی وجہ سے فقہاء نے لکھا ہے کہ استخفاف گناہ
کفر ہے گو چھوٹا ہی ہو۔ گناہ کی مثال تو آگ کیسی ہے ایک چنگاری
بھی مکان جلانے کے لئے کافی ہے۔ اور بڑا انگارہ بھی پس صغیرہ
چنگاری ہے اور بڑا انگارہ۔ پس عمل کرنے کے لئے یہ پوچھنا کہ یہ
صغیرہ ہے یا کبیرہ شبہ میں ڈالنا ہے۔ کہ اگر کبیرہ ہوگا تو بچیں گے
اور اگر صغیرہ ہوا تو خیر ہم ایسے شخص سے اجازت لیتے ہیں کہ
لاؤ تمہارے چھپر میں چھوٹی سی چنگاری رکھ دیں اگر یہ ناگوار ہے
تو خدا تعالیٰ کی نافرمانی کیسے گوارا ہے۔ وہ چنگاری گو چھوٹی ہو مگر

پھیلتے پھیلتے انگارہ ہی ہو جائیگا۔ اسی طرح آدمی اول صغیرہ کرتا ہے اور وہ چھوٹتا نہیں۔ اس اصرار سے وہ صغیرہ کبیرہ ہو جاتا ہے۔ اور زیادہ مدت تک کرتے رہنے سے اس کو ہلکا ہی سمجھنے لگ جاتا ہے۔ اور وہ اس جہت سے کبیرہ ہو جاتا ہے۔

توبہ کے بھروسہ پر گناہ کرنا سخت غلطی ہے مع ایک مثال کے

بعضے توبہ کے بھروسہ گناہ کرتے ہیں اور یہ سخت غلطی ہے۔ کیونکہ گناہ کی جب عادت ہو جاتی ہے پھر توبہ بھی مشکل ہو جاتی ہے کیونکہ نئے گناہ سے جن کی ابھی لذت نہیں رچی توبہ کرنا آسان ہے اور عادت والے گناہ سے توبہ بہت مشکل ہے علاوہ اس کے جب چھوٹے گناہوں سے اجتناب نہیں کیا جاتا ہے۔ تو طبیعت بیباک ہو جاتی ہے اور دل کھل جاتا ہے۔ پھر رفتہ رفتہ کبیرہ بھی ہونے لگتے ہیں۔ جیسے صاف کپڑے کو بارش میں کیچڑ وغیرہ سے بچایا جاتا ہے اور جب بہت چھینٹیں پڑ جاتی ہیں تو پھر دامن کھلا چھوڑ دیا جاتا ہے اور وہ کپڑا بالکل خراب ہو جاتا ہے ایسا ہی گناہ کا معاملہ ہے کہ جس گناہ کی طبیعت عادی ہو جاتی ہے وہ پختہ ہو جاتا ہے اور چھوٹتا نہیں مثلاً زمینداروں کا شتکاروں

وغیرہ میں یہ گناہ بمنزلہ عادت ہو گئے۔ غضب۔ ظلم۔ بیع باطل۔ جیسے آم اور بیر کی بیع متعارف اور یتیموں اور نابالغوں کے مال میں تصرف دیکھ لیجئے یہ گناہ کس طرح سب بے کھٹکے کرتے ہیں۔ اور خیال میں بھی نہیں لاتے۔ البتہ شراب نہیں پئیں گے۔ تو یہ تفاوت اسی عادت ہو جانے سے ہے۔ کہ اصرار و استخفاف بلکہ استحسان کی نوبت آجاتی ہے۔ اس لئے توبہ مشکل ہو جاتی ہے اور اگر ہوتی بھی ہے تو زبانی جیسے کسی نے کہا ہے ؎

سبحہ در کف توبہ بر لب دل پر از ذوق گناہ
معصیت را خندہ می آید بر استغفار ما

چنانچہ ان امور متذکرہ بالا سے توبہ تو کیسی اور اُلٹے ان امور کے ترک کو خلاف ریاست اور ذلت سمجھتے ہیں۔ اور گناہ سے دل بُرا نہیں ہوتا۔ حالانکہ ایمان کی نشانی یہ ہے۔ اِذَا سَرَّتْكَ حَسَنَتُكَ وَسَاءَتْكَ سَيِّئَتُكَ۔ غرض توبہ ان وجوہ سے مشکل ہو جاتی ہے۔ اس سے معلوم ہؤا کہ توبہ کے بھروسے گناہ کرنا نہایت حماقت ہے مگر بعض نادان پھر بھی دھوکے میں ہیں اور توبہ کے توقع پر گناہوں پر دلیری کرتے ہیں۔ اس شخص کی ایسی مثال ہے کہ اس کے پاس مرہم ہو اور اس کے بھروسے وہ اپنی انگلیاں آگ میں جلا لیتا ہو۔ کیا یہ شخص پورا احمق نہیں ہوگا۔ کیا کسی عاقل نے کبھی ایسا کیا ہے۔ جب اس آگ پر دلیری نہیں کی جا سکتی۔ تو دوزخ کی

آگ تو اس آگ سے ستر حصہ زیادہ تیز ہے۔ بلکہ مرہم تو پھر بھی من کل الوجوہ اختیاری ہے اور توبہ گو بظاہر اختیاری ہے مگر مرہم کی طرح من کل الوجوہ اختیاری نہیں۔ کیونکہ توبہ کی حقیقت یہ ہے اَلتَّوبَۃُ نَدَمٌ جس کو یوں بھی تعبیر کیا ہے وَھُوَ تَحَرُّقُ الحَشَا عَلَی الخَطَاءِ وَتَاَلُّمُ القَلبِ عَلَی الاِثمِ۔ پس توبہ اس سوزش اور جلن کو کہتے ہیں۔ یہ معلوم ہے کہ تَاَلُّمُ مقولہ اِنفِعَال سے ہے اور وہ اختیار سے خارج ہے۔

توبہ کے متعلق ایک شبہ اور اس کا جواب

البتہ اس پر ایک طالب علمانہ شبہ ہوتا ہے کہ جب توبہ امر اختیاری نہیں اور حسب الارشاد لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفسًا اِلَّا وُسعَھَا کے غیر اختیاری کی تکلیف دی نہیں گئی تو پھر تُوبُوا کا امر کیوں کیا گیا اس شبہ کا جواب یہ ہے کہ اختیاری کی دو قسم ہیں ایک وہ جو خود اختیار میں ہو دوسرے وہ کہ اس کے اسباب اختیار میں ہوں سو توبہ بایں معنے اختیاری ہے کہ اس کے اسباب اختیاری ہیں یعنی اللہ تعالیٰ کی عظمت اور اس کے عذاب کا مراقبہ سو اس کے کرنے سے عادۃ اللہ یوں ہی جاری ہے کہ ندامت اور تالم قلب جو حقیقت میں توبہ ہے پیدا ہو جاتی ہے لہذا تُوبُوا کا حکم دیا گیا ہے۔ چنانچہ ایک جگہ

ارشاد فرماتے ہیں کہ وَالَّذِيْنَ اِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً اَوْ ظَلَمُوْا اَنْفُسَهُمْ ذَكَرُوا اللّٰهَ فَاسْتَغْفَرُوْا لِذُنُوْبِهِمْ۔

مطلب یہ کہ اگر ان سے گناہ ہو جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ کی عظمت اور اس کے عذاب کو یاد کرتے ہیں یہاں پر ذکروا اللہ میں مضاف محذوف ہے۔ یعنی ذکروا عذاب اللہ وعظمۃ اللہ اور واقعی اللہ تعالیٰ کی عظمت ایسی ہی چیز ہے کہ اسکے یاد رکھنے سے نافرمانی نہیں ہو سکتی اور وہ ہے بھی قابل یاد رکھنے کے پس اسکو دل سے بھلا کر اسکی نافرمانی پر کمر باندھ لینا بڑی بے باکی کی بات ہے۔

توبہ میں تاخیر نہ کرنا چاہیئے اور فرصت کو غنیمت سمجھنا چاہیئے اور اس کا بیان کہ جس کو صحت اور ضروری سامان خرچ حاصل ہے اس کو گویا دُنیا کی تمام نعمتیں حاصل ہو گئیں

بعضے منتظر رہتے ہیں کہ فلاں کام کرکے توبہ اور تدارک کر لیں گے حالانکہ ممکن ہے کہ اس کو موانع کے ہجوم سے اتنی مہلت ہی نہ ملے اس لئے اس وقت کے امکان اور فراغت کو غنیمت سمجھو اور جب یہ معلوم ہوا کہ خدا تعالیٰ کی عظمت اور اس کے

عذاب کا مراقبہ کرنے سے توبہ نصیب ہوتی ہے تو اب دوسری بات قابل غور ہے کہ اس مراقبہ کے لئے بھی فرصت اور فراغت کی ضرورت ہے بعض لوگ اس فراغت کی بھی قدر نہیں کرتے حالانکہ وہ بہت بڑی غنیمت چیز ہے حدیث شریف میں ہے اِغْتَنِمْ خَمْسًا قَبْلَ خَمْسٍ اور ان میں سے ایک یہ ہے فَرَاغَكَ قَبْلَ شُغْلِكَ مشغول آدمیوں کی حالت میں غور کرنے سے فراغ کی قدر معلوم ہوتی ہے وہ بیچارے ہر وقت بلا میں مبتلا ہیں ان کو کوئی وقت فرصت کا اور ایسے سوچ کا نہیں ملتا بس یہ حالت ہے کہ

ع چو میرد مبتلا میرد چو خیزد مبتلا خیزد

فراغ کی قدر کے بارے میں خوب کہا گیا ہے ؎

خوشا روزگارے کہ دارد کسی کہ بازار حرصش نباشد بسے

بقدر ضرورت لیسارے بود کند کارے ار مرد کارے بود

اور اسی حدیث شریف میں دوسری چیز ہے صِحَّتَكَ قَبْلَ سُقْمِكَ تیسری شَبَابَكَ قَبْلَ هَرَمِكَ نیز حدیث شریف میں ہے کہ مَنْ اَصْبَحَ اٰمِنًا فِیْ سِرْبِهٖ مُعَافًا فِیْ جَسَدِهٖ وَعِنْدَهٗ قُوْتُ یَوْمِهٖ فَكَاَنَّمَا حِیْزَتْ لَهُ الدُّنْیَا بِحَذَافِیْرِهَا - واقع میں یہی بات ہے کیونکہ اگر زیادہ بھی ہو تب بھی اس کے کام تو ہر روز ایک ہی روز کا قوت آئے گا پس اس میں بیر اور قلیل والا برابر ہوا ؎

گر بریزی بحر را در کوزۂ　　چند گنجد قسمت یک روزۂ
چوں ترا نانے وخرقلنے بود　　ہر بن موئے تو سلطانے بود

حکایت - چنانچہ اسی زمانہ کے ایک متمول کی حکایت ہے کہ وہ ایک روز اپنے خزانے کو دیکھنے گیا جو زیر زمین بڑے مکان میں تھا اور وہ مکان گاہ گاہ کھلتا تھا اتفاق سے اس کو وہاں دیر لگ گئی اور کسی کو خبر تھی نہیں - ملازموں نے دروازہ بند کر لیا اور وہ بہت بڑا مکان تھا اور دروازوں کا سلسلہ بڑی دور تک تھا اور یہ اتنی دور تھا کہ وہاں سے آواز باہر نہیں آسکتی تھی - الغرض وہ بھوی ہال جواہرات کے ڈھیروں میں بھوکا پیاسا مر گیا - اس وقت کوئی اس سے پوچھتا تو اس کے نزدیک ایک بسکٹ اور پانی کے گلاس کے سامنے سارا خزانہ ہیچ تھا - ایسی ہی حکایت ہے کہ کسی بھوکے کو ایک تھیلی ملی کھول کر دیکھا تو اشرفیاں ہیں - پھینک کر زمین پر ماری اور افسوس کیا اور کہا کہ اگر یہ گیہوں کے دانے ہوتے تو کچھ کام آتے الغرض فراغ اور صحت اور ضروری سامان خرچ یہ بہت غنیمت چیزیں ہیں یہ ہر وقت میسر نہیں آتیں اسلئے اس کو غنیمت سمجھے اس وقت کی فرصت کو ہاتھ سے نہ دے اور توبہ بہت جلدی کر لے -

خدا تعالیٰ کی رحمت اور مغفرت کے علم کا مقتضا یہ ہے کہ اس سے متاثر ہو کر زیادہ اطاعت کی جائے نہ یہ کہ اور گستاخی اور نافرمانی کی جائے

بعضے لوگ اللہ تعالیٰ کی رحمت اور مغفرت کے ناز پر توبہ نہیں کرتے رحالانکہ رحمت اور مغفرت کی چیزیں اس لئے دی گئی ہیں کہ تائب کو یاس نہ ہو جیسا کہا گیا ہے ؎

باز آ باز آ ہر آنچہ ہستی باز آ	گر کافر و گبر و بت پرستی باز آ
ایں درگہ ما درگہ نومیدی نیست	صد بار اگر توبہ شکستی باز آ

اور جرأت اور دلیری کے واسطے نہیں کہ اور دلیر ہو کر گناہ کرو بلکہ احسان اور رحمت خداوندی کی اطلاع کا مقتضا یہ تھا کہ متاثر ہو کر اور بھی طاعت اور فرمانبرداری کرتے نہ کہ اور جرأت اور گستاخی اور نافرمانی کی جائے چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ دنیا میں کوئی کسی کے ساتھ احسان کرتا ہے تو وہ اور زیادہ محبت و اطاعت کرتا ہے نہ کہ مخالفت و سرکشی۔

گناہ کے اندر کوئی لذت نہیں اور اسکی توضیح مثال سے

رہا یہ اشکال کہ واقعی اس کا مقتضیٰ تو یہی تھا مگر ایک دوسرا

مقتضیٰ کہ لذت ہے وہ غالب ہو گیا چنانچہ گناہ میں ظاہر ہے کہ کیا مزا اور لذت ہے اس کو چھوڑنا اس لئے مشکل ہے سو اگر ادراک صحیح ہے تو یہ اشکال بالکل ٹھیک نہیں کیونکہ گناہ میں جو لذت ہے اس کی مثال کھجلی جیسی ہے کہ خود اس میں کوئی لذت نہیں محض مرض کی وجہ سے لذت معلوم ہوتی ہے، پھر فوراً ہی سوزش پیدا ہوتی ہے، سو یہ دراصل مرض ہے جیسا سانپ کے کاٹے ہوئے کو کڑوا بھی میٹھا معلوم ہونے لگتا ہے سو کسی عاقل کو ایسی لذت علاج سے مانع نہیں ہوتی۔

حقیقی لذت طاعت کے اندر ہے دُنیا کے تنعّمات تو درحقیقت جان کیلئے عذاب ہیں

البتہ حقیقی لذت طاعت میں ہے چونکہ ان لوگوں نے ابھی اعمال آخرت اور پرہیز گاری اور طاعت کی لذت چکھی نہیں اس لئے گناہ اور نفسانی لذات ان کو مرغوب معلوم ہوتے ہیں آخرت اور پرہیز گاری کی لذت حضرت ابراہیم ادہم رحسے پوچھیئے کہ کس طرح اس کے پیچھے سلطنت کی لذت ترک کر دی۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز رح نے اس لذت کے پیچھے لباس شاہانہ ترک کر کے غریبانہ کپڑوں پر کفایت کی اور سیدنا شیخ عبدالقادر جیلانی رح کو

سلطان سنجر نے ملک نیمروز دینا چاہا اس کے جواب میں یہ شعر تحریر فرمائے ؎

چوں چتر سنجری رخ بختم سیاہ باد | در دل بود اگر ہوس ملک سنجرم
زانگہ کہ یافتم خبر از ملک نیم شب | من ملک نیمروز بیک جو نمی خورم

بفراغ دل زمانے نظرے بماہ روئے ؎ بہ از انکہ چتر شاہی ہمہ روز ہاؤ ہوئے

پس از سی سال ایں معنی محقق شد بخاقانی ؎ کہ یکدم با خدا بودن بہ از ملک سلیمانی

چونکہ یہ لذت و تنعمات درحقیقت جان کے لئے عذاب ہیں چنانچہ ارشاد فرماتے ہیں۔ وَلَا تُعْجِبْكَ اَمْوَالُهُمْ الخ

اول تو ان سب چیزوں کا مرضی کے موافق حاصل ہونا غیر اختیاری اور اگر حاصل بھی ہو گئیں تو ان سب میں مشغولی اور تعلق کی پریشانی اور بے آرامی یہ دوسرا عذاب۔ حقیقت میں آرام تو صرف اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق پیدا کرنے میں ہے اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ یہ کلفتیں تو گناہ انفسی ہیں اور بعض کلفتیں آفاقی بھی مرتب ہوتی ہیں چنانچہ ان نافرمانیوں کی بدولت طرح طرح کی بیماریاں طاعون وغیرہ وبائی امراض آپس کی نااتفاقیاں وغیرہ ظہور میں آتی ہیں۔

بیماری وغیرہ کے ظاہری اسباب گو کچھ امور طبعیہ بھی ہوں مگر اصلی اسباب نفس کے

گناہ ہیں اور اس کا بیان کہ جو خدا تعالےٰ کی اطاعت کرتا ہے اسکی سب اطاعت کرتے ہیں

اور ان بیماریوں کے ظاہری اسباب گو کچھ امور طبعیہ ہوں مگر ذنوب اُن کے اسباب حقیقیہ اور اصلیہ ہیں اور دونوں میں تعارض نہیں۔ کیونکہ ممکن ہے کہ سزا تو ہو گناہ کی وجہ سے مگر ظہور اس سزا کا اسباب طبعیہ کے ذریعہ سے ہوا ہو اور چونکہ لوگ ذنوب کو ان امراض کا سبب نہیں قرار دیتے اس لئے صرف طبی علاج پر اکتفا کرتے ہیں اور اصلی علاج کہ استغفار ہے وہ نہیں کرتے وہ بھی کرنا چاہیئے ؎

چند خوانی حکمت یونانیاں، حکمت ایمانیاں راہم بخواں
صحت ایں حس بجوئید از طبیب صحت آں حس بجوئید از حبیب
صحت ایں حس ز معموری تن صحت آں حس ز تخریب بدن

اور ذنوب سے مصائب کا آنا نصوص سے ثابت ہے مَآ اَصَابَکُمْ مِّنْ مُّصِیْبَۃٍ فَبِمَا کَسَبَتْ اَیْدِیْکُمْ۔

حکایت۔ ایک بزرگ گھوڑے پر سوار تھے وہ شوخی کرنے لگا۔ فرمانے لگے ہم سے آج کوئی گناہ ہو گیا ہے اس کی وجہ سے یہ ہماری نافرمانی کرتا ہے ؎

تو ہم گردن از حکم داور مپیچ ۔ کہ گردن نہ پیچد ز حکم تو ہیچ
ہر کہ ترسید از حق و تقوی گزید ۔ ترسد از وے جن و انس و ہر کہ دید

حکایت ۔ اس کے مناسب جناب پیر و مرشد حاجی صاحب علیہ الرحمۃ کی حکایت ہے کہ ایک دفعہ پیران کلیر سے واپس ہوتے ہوئے سہارنپور تشریف لائے لوگوں نے آپ کو ایک ایسے مکان میں اتروایا کہ وہاں ایک جن نے سخت آزار پہنچا رکھا تھا ۔ حتیٰ کہ وہ مکان بالکل معطل چھوڑ دیا گیا تھا ۔ جب حضرت رات کو اٹھے دیکھتے کیا ہیں کہ ایک آدمی آیا اور سلام کیا اور مصافحہ کر کے بیٹھ گیا ۔ حضرت نے تعجب سے پوچھا تم کون ہو ۔ کیونکہ مکان بند تھا اس نے عرض کیا میں ایک جن ہوں اور میری ہی وجہ سے یہ مکان خالی پڑا ہے ۔ حضرت حاجی صاحب نے فرمایا کہ تم کو خدا کا خوف نہیں کہ لوگوں کو تکلیف دیتے ہو ۔ اس نے عہد کیا کہ میں اب تکلیف نہ دوں گا ۔ اس کے بعد وہ جن اس مکان سے چلا گیا ۔ اور وہ مکان آباد ہو گیا تو یہ اثر جن پر حضرت کی طاعت ہی کا تھا ۔

حکایت ۔ ایک سیر کی روایت ہے کہ حضرت عمرو بن العاص نے جب مصر فتح کیا تو ایک بار دریائے نیل خشک ہو گیا ۔ لوگوں نے عرض کیا ۔ آپ نے فرمایا کہ کبھی پہلے بھی ایسا ہوا ہے اور لوگ ایسے وقت کیا کرتے ہیں ۔ عرض کیا کہ یہاں یہ رسم ہے کہ جب دریائے نیل خشک ہو جاتا ہے تو لوگ ایک کنواری لڑکی کو بناؤ سنگار

کر کے اس میں ڈال دیتے ہیں۔ دریائے نیل پھر جوش مار کر جاری ہو جاتا ہے۔ آپ نے فرمایا ایسا کبھی نہ ہوگا۔ اور یہ[۱]

سب حال حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خدمت میں لکھ بھیجا۔ حضرت نے ایک والا نامہ دریائے نیل کے نام لکھا جس کا حاصل یہ تھا کہ اے دریائے نیل اگر تو اپنی قدرت اور طاقت سے جوش پر آتا ہے تو ہم کو تیری ہرگز پروا نہیں ہے اور اگر خدا کی قدرت اور مشیت سے جوش پر آتا ہے تو میں خدا کے سچے نبیؐ کا خلیفہ ہوں اور تجھ کو حکم کرتا ہوں کہ خدا کے حکم سے جاری ہو جا۔ یہ والا نامہ دریائے نیل میں قاصد نے ڈال دیا۔ ہنوز دریا جوش پر رہتا ہے۔ اور برابر اس کے ذریعہ سے زراعت وغیرہ کی آبپاشی ہوتی ہے۔

---

[۱] یہاں تک یہ حکایت ہم کو الرفیق میں ناتمام ملی اس لئے باقی حکایت کو اپنی یاد سے پورا کر دیا۔ اگر کچھ کم بیشی ہو گئی ہو تو ناظرین اس کی کمی بیشی کو پورا کر لیں۔ ۱۲ جامع۔

الحمد للہ یہ کتاب تین جلدوں میں مکمل ہو گئی ہے۔ اسی قسم کے انتخابات کی دوسری کتاب انفاس عیسیٰ نام سے ہے جو حضرت مولانا محمد عیسیٰ صاحب رح خلیفہ حضرت مصنف رح نے جمع فرمائی تھی۔ ناشر

تفسیرِ معارف القرآن

یوں تو آجکل ہر شخص ہی مفسر قرآن، اہل قرآن، شیخ القرآن اور شیخ التفسیر ہونے کا دعوٰی کرتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس سراپا اعجاز کلام کی تفسیر جوئے شیر لانے سے کہیں مشکل ہے یہ خدمت اللہ تعالٰی اس کے سپرد فرماتے ہیں جو خود کو ان کے سپرد کر دیتا ہے منجملہ ان منتخب ہستیوں کے شیخ الحدیث والتفسیر حضرت مولانا محمد ادریس صاحب کاندھلوی مدظلہ العالی بھی ہیں اللہ تعالٰی نے جو فضل و کمال آپکو بخشا ہے۔ وہ "تعلیق الصبیح" اور "سیرت المصطفٰے" کا مطالعہ فرمانے والے حضرات بخوبی جانتے ہیں حضرت والا دامت برکاتہم مدظلہم کی یہ تفسیر سورۂ بقرہ تک چھپ گئی ہے۔ بیضاوی شریف اور جلالین شریف پڑھنے پڑھانے والے حضرات کیلئے خصوصًا اور مطالب قرآن کا مطالعہ فرمانے والے حضرات کیلئے عمومًا یہ نعمت غیر مترقبہ ہے جا۔ از جلد طلب فرمائیں۔ ہدیہ صرف بارہ روپے پچاس پیسے

کشکول مجذوب

حکیم الامت مجدد الملت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کو امت کی اصلاح کا جو طریق منجانب اللہ عطا کیا گیا تھا اس کو اہل علم بخوبی جانتے ہیں۔ الفضل ما شہدت بہ الاعداء وہی تعلیمات حضرت خواجہ عزیز الحسن صاحب مجذوب رحمۃ اللہ علیہ خلیفہ مجاز حضرت تھانوی رحمۃ اللہ کے مجموعۂ کلام منظوم میں بھری ہوئی ہیں۔ کیونکہ حضرت خواجہ صاحب پر حضرت کی تعلیمات کا رنگ چڑھ چکا تھا اس لئے گویا۔ زباں میری ہے بات انکی والا مضمون ہے یہ مجموعۂ کلام حال ہی میں ہندوستان میں طبع ہوا ہے۔ ہم نے کچھ نسخے منگائے ہیں۔ اہل ذوق حضرات اگر طلب فرمانا چاہیں تو در کار خیر حاجت ہیچ استخارہ نیست ——— کو یاد رکھیں۔

قیمت پانچ روپے -/5

——— ڈاک خرچ بذمہ خریدار

"شریعت اور طریقت"

اس کتاب کے جملہ مضامین حضرت مولانا محمد اشرف علی صاحب تھانوی قدس سرہٗ کے افادات کا انتخاب ہیں، اس میں شریعت، طریقت، حقیقت، معرفت، بیعت، اخلاق، مجاہدات، اذکار، اشغال، مراقبات، احوال، توجہات، تعلیمات، مسائل مع دلائل وحقائق، سالک کے لئے طریق عمل مندرج ہیں جو قرآن مجید، احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم اور دیگر تصانیف علماء محققین و اولیاء کرام کی روشنی میں مرتب کی گئی ہے اس کتاب کا ہر مسلمان کے پاس ہونا ضروری ہے۔

قیمت مجلد چھ روپے -/۶ علاوہ محصول ڈاک

حیات اشرف

حضرت حکیم الامتہ رحؒ کی سوانح عمری کا کوئی پہلو اس میں نہیں چھوڑا گیا جو لوگ دینی معلومات دیکھنے کا وقت نہیں نکال سکتے اس کتاب سے تھوڑے وقت میں سب معلومات ہو جاویں گی۔ ہر مسلمان کو اس کا پڑھنا نہایت ضروری ہے۔ قیمت مجلد تین روپے پچھتر پیسے ۷۵/۳، علاوہ ڈاک خرچہ،

ملنے کا پتہ:۔ کتب خانہ جمیلی - ۵ - گولڈنگ روڈ - لاہور